مخزن نمبر ۱

جسٹرڈ نمبر ایل ۹۳

اپریل ۱۹۱۲ء ربیع الثانی و جمادی الاول

جلد ۲۲ نمبر (۱)

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ

پشاور — کشمیر — لاہور — دہلی — آگرہ — لکھنؤ — الہ آباد — پٹنہ — کراچی — کلکتہ — رنگون — بمبئی — حیدرآباد — بنگلور — مدراس — سیلون

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ● ان شہروں میں اردو بولی جاتی ہے ○ ان میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام منیجر نول کشور پریس لاہور میں چھپا اور منشی فضل الٰہی پبلشر نے شائع کیا

[illegible] محصول - فی پرچہ سالانہ قیمت (ولایت کے لئے مع محصول ...)

مخزن

کتابوں کی رفاقت

کون نہیں جانتا کہ پڑھنے والوں کے لئے تنہائی میں کتاب سے بہتر مونس اور رفیق ممکن نہیں۔ اور رفیق بھی وہ جس کی رفاقت شائبۂ غرض سے بری ہے۔ کتاب وہ دوست ہے جسے جب جی چاہے بلالو اور جب اُکتا جاؤ تو کہدو کہ جائیے۔ نہ ناراض ہو نہ بُرا مانے۔ بلکہ چُپ چاپ پھر اپنے گوشۂ عافیت میں عزلت گزیں ہو جائے۔ دُنیا بھر کے داناؤں نے کتابوں کی رفاقت کی تعریف کی ہے۔ مغرب و مشرق کے علمائ بلا اختلاف کُتب بینی کے ثنا خواں اور اس کے فوائد کے معترف ہیں۔ بعض نامور انگریزی مصنفین کے خیالات کتابوں کے متعلق اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں۔ اور مختلف اہل علم اصحاب کا ایک ہی مضمون کی نسبت مختلف پیرایوں میں اظہار رائے کرنا ایسا دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اُن میں سے بعض کی رائیں بذریعہ ترجمہ ہدیۂ ناظرین کی جائیں۔ اِن اقوال کو مجھے تلاش سے جمع نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ مجھے یہ نازکخیالی کا گلدستہ بنا بنایا مل گیا ہے۔ البتہ جس گلچیں نے یہ گلدستہ تیار کیا ہے اس کی نظرِ انتخاب قابلِ داد ہے۔

میرا منشا اس ترجمہ سے نہ صرف ایک لطیف مجموعۂ خیالات پیش کرنا ہے۔ بلکہ زیادہ تر یہ کہ اسے دیکھکر کوئی متجسس صاحب نظر اُردو فارسی اساتذہ کے کلام نظم یا نثر سے کتابوں کے متعلق خیالات اور آرا جمع کر کے گلہائے مشرقی سے اس مغربی بوکے[1] کا جواب ہوے :-

ڈاکٹر ٹامس آرنلڈ۔ "جب کبھی کوئی تکلیف وہ خیال غالب ہو۔ اور تم اسے دور کرنا چاہو تو اپنی کتابوں کے پاس دوڑ کر جاؤ۔ وُہ فورًا تمہارے دل کو اپنی طرف مائل کر لینگی اور تکلیف دہ خیال کو دماغ سے باہر کر دینگی۔ اُن کی یہ عجیب صفت ہے کہ ہر وقت یکساں مہربانی سے تمہارے خیر مقدم کو حاضر ہیں"۔

بشپ ونگرویل۔ "کتابیں وُہ اُستاد ہیں جو ہمیں سکھاتی ہیں لیکن ڈنڈے کی مدد سے نہیں۔ نہ غصہ ہوتی ہیں نہ درشت الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ نہ ہم سے کپڑے مانگتی ہیں نہ روپیہ۔ سبق پڑھنا چاہو۔ تو کسی وقت انہیں سوئی ہوئی نہیں پاؤ گے۔ اگر اُن سے کوئی بات پوچھو تو بلا کم و کاست سب کچھ بتا دینگی۔ اگر اُن کی نسبت کوئی غلطی تم سے ہو جائے تو حرف شکوہ زبان پر نہیں لاتیں۔ اگر تم ناواقف یا بے خبر ہو تو تم پر ہنس نہیں سکتیں"۔

رچرڈ بکسٹر۔ "عمدہ لکچر یا وعظ سُننا مفید ہے۔ مگر کتابیں مفید تر ہیں۔ ہر جماعت کو بہترین واعظ میسر نہیں آسکتا۔ مگر بہترین

[1] بوکے۔ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی میں بھی مروج ہے۔ گلدستہ کو کہتے ہیں۔

واعظ کی تصنیف کردہ کتاب ہر فرد واحد تک پہنچ سکتی ہے
واعظوں کو ممکن ہے کہ چپ کرا دیا جاتے یا جلا وطن کر دیا
جائے۔ مگر کتابیں موجود رہ سکتی ہیں۔ کتابوں میں تو
ہم وہ انتخاب کر سکتے ہیں جو اس مضمون پر ہوں جو ہمیں
مرغوب ہے۔ لیکن وعظ سنتے وقت ہم مجبور ہیں کہ جو
کچھ واعظ کو پسند ہو وہ سنیں۔ کتابیں ہمارے پاس ہر
روز اور ہر گھڑی ہوتی ہیں۔ مگر خطیب کبھی کبھی اور صرف
اوقات معینہ پر۔ وعظ یا خطبہ کا مضمون اگر حافظہ سے
نکل گیا تو جاتا رہا۔ مگر کتاب ہم بار بار پڑھ سکتے ہیں۔
تاوقتیکہ خوب یاد نہ ہو جائے۔ اور اگر اس پر بھی بھول
جائیں تو جب جی چاہے یا جب فرصت ہو پھر تازہ کر سکتے
ہیں۔ غرض یہ ہے کہ اچھی کتابیں دنیا کے لئے ایک رحمت ہیں۔

لارڈ بیکنسفیلڈ۔ جو شخص گذشتہ زمانہ کی تاریخ سے بے خبر ہے۔ اور
موجودہ گذرتے ہوئے وقت کے حال کے سوا کچھ نہیں
جانتا۔ اور جو کل کی نسبت کچھ امیدیں نہیں رکھتا کیونکہ
اس نے کوئی ایسی چیز نہیں پڑھی جو اسے بتائے کہ
کل تک کئی تغیرات ہو سکتے ہیں۔ وہ شخص بمقابلہ ایک
دوسرے آدمی کے جس نے معمولی سے معمولی مختصر
تواریخ پڑھی ہے۔ یا کوئی عام فہم فلسفی رسالہ بھی دیکھا
ہے۔ نہایت قابل رحم ہے۔ وہ گویا مقابلتہً کسی دوسری
ہی قسم کا حیوان ہے۔ جو کسی اور سیارہ سے گر پڑا ہے۔

یا کسی اور ہی مقصد کے لئے بنا ہے اور کسی اور ہی نتیجے
کا اُمیدوار ہے۔ انسان کی تمدنی مساواتِ علم سے
پیدا ہوتی ہے۔ علم ہی وُہ شے ہے جو سب کو۔ خواہ
وُہ کیسے ہی مختلف ہوں۔ اُن کی سیاسی حیثیت
عطا کرتا ہے۔ اُنہیں وُہ جذبات دیتا ہے جو مشترک
ہوں۔ اور اُن احساسات سے محفوظ کرتا ہے۔ جو
سب مہذب انسانوں کا شعار ہیں۔ علم ایک جادو کا
زینہ ہے جس کا ذکر انجیل میں بزرگِ قوم کے خواب میں آتا ہے
زمین پر اُس زینے کے پاؤں ہیں اور اس کا سرا آسمان تک
پہنچا ہے۔ وُہ بڑے مصنّف جو قرنہائے دراز سے علم و
حکمت کی زنجیر سنبھالے ہوئے ہیں۔ فرشتے ہیں جو اُس
مقدس زینے پر چڑھتے اُترتے رہتے ہیں۔ اور انسان
اور عالم بالا کے درمیان واسطہ قائم کئے ہوئے ہیں"

جان برائٹ ۔ کتابوں کا شوق کیا ہے ؟ گویا سارے زمانوں کے بڑے
سے بڑے اور بھلے سے بھلے آدمیوں سے تقریب
ملاقات ہے۔ یہ سچ ہے۔ کہ کتابیں خاموش ہیں۔
لیکن اگرچہ اُن میں گویائی نہیں۔ پھر بھی جب کبھی میں
کسی کتب خانہ میں داخل ہوتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں
کہ یہ کتابیں نہیں۔ جو الماریوں پر دھری ہیں۔ بلکہ
وُہ بزرگانِ دہر ہیں جو مر کر بھی زندہ موجود ہیں۔ اور
مَیں خوب جانتا ہوں کہ اگر مَیں اُن سے کوئی سوال

پوچھوں گا تو نہایت دیانت سے اور نہایت مکمل صورت سے مجھے جواب باصواب دینگی اور یہ قوت اُن بزرگوں نے اِن میں ودلیعت کی ہے جو یہ کتابیں ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ کیا ہم میں کوئی اشخاص ایسے بھی ہیں جنھیں کتب خانوں میں جاکر یہ احساس بالکل نہیں ہوا؟ کتب خانوں کی دیواروں کے ساتھ یہ بڑی بڑی الماریاں۔ یہ ہزاروں جلدیں دیکھو اور ایک لمحہ بھر کے لئے غور کرو کہ اِن کے لکھنے والے کون تھے۔ کس نے انہیں جمع کیا۔ کس کے واسطے جمع کی گئی ہیں۔ کتنی حکمت اِن میں بھری ہوئی ہے۔ آیندہ نسلوں اور زمانوں کو یہ کیا بتا رہی ہیں۔ اِن خیالات کے ہجوم سے ممکن نہیں کہ طبیعت متاثر نہ ہو اور ایک سکون اور اطمینانِ قلب کو حاصل نہ ہو کہ خوش نصیبی سے ایسے کمروں میں کچھ وقت صرف کرنے کا موقعہ ہمیں ملا۔ کتب خانے تو ایک طرف۔ گھروں میں بھی ان سے بہتر زینت نہیں۔ خواہ آپ کا مکان بیش بہا تصاویر سے آراستہ اور قیمتی جواہرات سے پیراستہ ہو۔ اور اُس میں طرح طرح کی زینت کے سامان ہوں۔ تاہم میری رائے میں تو کتابوں سے سجا ہوا کمرہ قابلِ ترجیح ہے۔ مجھے ایک کمرہ دیدو جس میں کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہو تو مجھے اور آرائشوں کی ہرگز پروا نہیں۔ کتابوں کو دیکھکر افسوس ہوتا ہے تو فقط اس بات کا کہ کتابیں بیشمار ہیں اور عمر کافی نہیں۔ دسترخوان پرُلطف چنا ہوا ہو اور ہماری اشتہا اس سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ دباقی آیندہ

مَن لّم یشکرُ النّاسَ لَم یشکرُ اللہ

جو شخص انسان کی شکر گذاری نہ کریگا۔ خدا کی بھی شکر گذاری نہیں کرے گا

سلطنت انگریزی کی زبان انگریزی ہے اُردو فارسی سے اُس کو چنداں تعلق نہیں ہے اور مَیں انگریزی مطلق نہیں جانتا۔ ہاں پچاس برس سے اُردو و فارسی کے لٹریچر سے البتہ مجھ کو سروکار ہے۔ مَیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آیا فی الحقیقت یہ زبانیں (جو حق جاننے کا ہے) میں اُس حد تک جانتا بھی ہوں یا محض میرے نفس کا دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اگر یُوں خیال کیا جائے کہ میرا خاندان پُرانا اور مجھ کو سابق مسلمان فرمانروایانِ بنگالہ و بہار سے نسبت قریب ہے تو یہ بھی چنداں قابلِ التفات نہیں ہے۔ آج ہندوستان میں بڑے بڑے عالی خاندان موجود ہیں۔ جن کے سامنے میری کوئی ہستی نہیں ہے۔ یہ محض فیاضانہ و شاہانہ عطا ہے کہ بلا کسی استحقاق کے جناب مستطاب حضور عالی وایسرائے بہادر نے میری ذاتی پنشن مقرر کر دی۔ جناب عالی لفٹننٹ گورنر بہادر بنگال نے جو ہمدردی کی رپورٹ میری نسبت لکھی۔ مَیں اُس پر فخر و مباہات کرتا ہوں اگر بعض مفتخر زمانہ کا مبارک قدم درمیان میں نہ ہوتا (جن کو میری حالت پر مِن اوّلہ اِلیٰ آخرہٖ اتنی واقفیت اور میرے ساتھ اتنی ہمدردی ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی) تو گورنمنٹ عالیہ کو جس کی کروڑ در کروڑ رعایا ہے۔ میرے حالات پر کیونکر اطلاع ہوتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس شاہی مرحمت پر جس قدر مَیں مباہات کروں قلیل ہے اور مؤیدِ اعظم سے لیکر حضور وایسرائے بہادر کا جہاں تک شکریہ ادا کروں کم ہے۔ مَیں اپنے شہر اور اضلاع بلکہ اکثر دُور دُور تک کے سر برآوردہ عالی خیال

مسلمان اور ہندو بھائیوں کا بیحد شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے اس خبر کو سنتے ہی بڑی مسرت کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکبادیں دیں۔ اور کمیٹیاں کر کے گورنمنٹ عالیہ کے مراحم کا شکریہ ادا کیا اور گورنمنٹ کو شکر گذاری کے تار بھیجے۔ میں اس روز سعید کو بھولا نہیں ہوں جس روز میرے شہر کے مغتنم و یادگار اسلاف رئیس جناب رائے بہادر رائے رادھا کرشن صاحب کے باغ میں پارٹی تھی اور ایک جم غفیر ہندو مسلمانوں کا جمع تھا اور ایک ایک شخص تہ دل سے مجھ کو مبارکباد دیکر اظہار قدرشناسی و اظہار شکریہ سرکار کرتا تھا۔ پڑھے لکھے ہندو مسلمانوں پر تو چنداں مجھ کو تعجب نہیں ہے کیونکہ وہ بہر طور ایسے عالی عطیہ کی عظمت و وقعت کو جانتے ہیں۔ تعجب تو مجھکو اپنے شہر کی عام خلقت پر ہے کہ وہ بھی حد سے زیادہ جوش میں آکر دل سے مسرور اور نہایت خوش نظر آتی تھی اور گورنمنٹ کو دعا دیتی تھی۔

اُن کا یہ کہنا کہ میرے سے شخص کے لئے پنشن کی یہ مقدار کافی نہیں ہے مگر جیسا کہ مجھ کو بھروسا دلوایا گیا ہے۔ مجھ کو یقین واثق ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو گورنمنٹ عالیہ عنقریب میری عزت و آرام کے مطابق پنشن میں اضافہ فرما کر میری اور آپ کی تمنا پوری کر دیگی اور یہ ڈھیر تصنیفوں کا جس کو آپ افسوس کے ساتھ میرے گردوپیش دیکھ رہے ہیں (اور جس کی مختصر حالت میں اسی شکریہ کے ضمن میں خاص و عام کی آگاہی کے لئے بیان کرونگا) انشاءاللہ ضائع نہ جائیگا۔

بایں ہمہ اسی کم مقدار پنشن کو جب میرا کارندہ بنک آف بنگال سے برآمد کر کے میرے سامنے رکھ دیتا ہے۔ تو میرے دل کو جو مسرت اور خوشی ہوتی ہے ویسی خوشی ہزاروں روپے کی آمدنی سے نہیں ہوتی۔ میں اپنے اُن چند

دوستوں کا شکر گزار ہوں - جنہوں نے (خدا جانے کیوں) اس علانیہ سے چڑکر مجھ غریب کی توہین کی - مگر الحمدللہ کہ ایسے بزرگواروں کی تعداد سارے شہر میں (جہاں ڈیڑھ لاکھ ہندو مسلمان آباد ہیں) صرف گنی ہوئی تین یا چار سے زیادہ نہیں ہے - بحمد اللہ مجھ کو اُن سے کچھ بھی شکایت نہیں ہے - دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُنکے اس قومی گناہ کو بخشدے اور چشم حق بین و نگاہ قدرشناس عطا کرے کہ انسان کے لئے اس سے زیادہ کوئی عمدہ نعمت نہیں ہے - میرے اکثر قدردان احباب دُور و نزدیک سے پُوچھا کرتے ہیں کہ تمہاری تصانیف کیوں چھپتی نہیں ہیں اور تمہاری تصانیف کی مقدار وتعداد کیا ہے؟ جو احباب میری تصنیفوں اور میری جانکاہیوں و پچاس برس کی محنتوں سے آگاہ ہیں وُہ اکثر کہ اُٹھتے ہیں کہ اگر تم اپنے سامنے اپنی تصنیفیں نہ چھپواؤ گے تو پچاس برس کی محنت بالکل ضائع جائے گی - پٹنہ کی حالت تو معلوم ہے کہ یہاں والے ایسے اپنے ہم وطن باکمال کے قدردان ہیں اور بالفرض ہوں بھی تو اس سرے سے اُس سرے تک ایک کا بھی یہ ماسکہ نہیں ہے کہ بے ترتیب مسودوں کو ترتیب دے - کتابت کی فروگذاشت کا تدارک کر سکے - نقل کرنے کی جان فرسا محنت گوارا کرے - شاگردوں میں بعض ایسے بھی فضل حق سارے ہیں جو ذی علم اور صاحب جوہر اور قدرشناس اور خوشحال ہیں مگر صورت حال کو دیکھکر اس کا یقین ہے کہ ادھر تم اس دُنیا سے رخصت ہوئے - چندروز تو ضرور اُن کو تمہارے مرنے کا افسوس ہوگا اور جب جب تمہارا ذکر آئے گا اُن کو قلق ہوگا - یہ بھی کبھی کبھی ولولہ ہوگا کہ اگر اور اور تصنیفیں نہ چھپیں تو نہ سہی مگر غزلیں اور مرثیے تو ضرور چھپ جائیں - اس کے لئے مشورے ہی مشورے ہونگے شاید غزلوں کا صرف

قومی نظمیں شادی و دیگر تقریبات کے فرمائشی رُقعے واقعات و حوادثات کے قطعاتِ تاریخ اور اور متفرق طرح کی نظمیں ہیں۔ چھ ہزار شعروں کا یہ مجموعہ ہے اس مجلد کے ۲۵ جزو ہیں۔

مثنویات

اِن مثنویات کے مجموعہ میں جو مثنویاں وہ بھی داخل ہیں جو چالیس برس اُدھر میں نے نظم کی تھیں اور بعض اُن میں کی مثلاً نالۂ شاد فغانِ شاد زمزمۂ شاد یا چشمۂ کوثر یا مثلاً نوید ہند یا فارسی کی مثنوی فغانِ دلکش چھپ بھی چکی ہیں۔ سب دس مثنویاں چھوٹی بڑی داخل ہیں۔ جن میں تخمیناً دس ہزار شعر سے زیادہ ہیں اور ۳۵ جزو ہیں۔ متفرق سوشیل مضامین ان میں ہیں صرف پانچ جزو کی ایک مثنوی "نادر ہند" نام میں پالٹکس ہے۔

مرثیے

۴۰ مرثیے اور تین مولود ہیں۔ کوئی مسدس دو سو بندوں سے کم نہیں میری کوشش تھی کہ موجودہ طرز میں مناسب تبدیلی ضرور ہونی چاہئے۔ مگر میر انیس مغفور نے جو احاطہ کھینچا ہے اور فی الواقع باعتبار تشبیہ تمثیل و نظیر ہے اُس سے اتنا تجاوز نہ ہو کہ کانوں کو بھیانک سنائی دے۔ میں نہیں جانتا کہ کہاں تک اس میں مجھ کو کامیابی ہوتی ہے مگر بظاہر عام و خاص سب پسند کرتے ہیں۔ اِن مسدسوں میں تیس ہزار شعر سے زیادہ ہیں در آمد و سطروں میں بھی چھاپے جائیں تو بھی ۲۵ جزو ہونگے یہ ہے کائنات میری نظم کی کہ دس بارہ ہزار شعروں کے ضائع کر دینے کے بعد مرتب و

غیر مرتب ۵۷ ہزار شعر ایک سو ۲۵ جزوں کے اندر ہیں۔
(نثر کی تصنیفات جو تیس برس قبل لکھی گئیں اور بعض اُن میں سے چھپ چکی ہیں)

تاریخ صُوبہ بہار

یہ کتاب پندرہ جزوں میں پہلے چھپی تھی مجھ کو اعتراف ہے کہ مزید تحقیقات و ضروری واقعات کی اس میں فروگذاشت ہے۔ مگر اب میں نے بڑی جانکاہی سے کچھ اوپر چار ہزار برس کے ضروری واقعات تک جمع کر دیئے ہیں جس کے مضامین کی فہرست ایک جزو میں ہے اور اب یہ کتاب چالیس جزو سے اُوپر کی ہے

صُورۃ الخیال ناول

اس ناول کے تین حصے ہیں ۱۸۷۶ء جبکہ اردو زبان میں ناول کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ یہ ناول چھپ کر شائع ہوا۔ چونکہ اہل مطبع کو حق تصنیف وغیرہ میں دے چکا تھا۔ پانچ دفعہ اُنھوں نے اس کو چھاپا۔ ہندوستان کے علاوہ انگلنڈ و فرانس تک اس کی شہرت ہوئی۔ حیدر آباد دکن کی ایک علمی سوسائٹی نے طلائی میڈل میرے لئے بذریعہ پٹنہ کے جج صاحب کے بھیجا۔ اب میں نے مناسب ترمیم اس میں کر دی ہے۔ تینوں حصے ۲۵ جزوں میں ہیں۔

صُورتِ حال

اس کتاب میں مسلمانوں کی شادیوں اور غمیوں میں جو لغو باتیں اور برباد کن رسومات برتی جاتی ہیں۔ یہاں کی بیگمات ہی کی زبان میں اس کی تفصیل کر کے دلچسپ پیرایہ میں اُنکو سمجھایا ہے۔ نو جزو کی کتاب ہے۔

اُردو تعلیم

صوبہ بہار میں اُردو کی جگہ ناگری و ہندی حرفوں کے سرکاری دفتر
میں جاری ہونے کی کوشش میں جو میموریل گزشتہ سال مخالفین اُردو کے
سرغنہ منشی سوہن لال صاحب نے بہت سے بھولے بھالے ہندو بھائیوں
اور بعض ناواقف مسلمانوں کو ہم خیال بنا کر پیش کیا تھا۔ اُس میں اردو طرز
تحریر پر بیس پچیس اعتراضات کئے گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قطع نظر اُن
عیوب کے جو اسی طرح بلکہ اُس سے بھی زیادہ ہندی و ناگری میں بھی ہیں
بظاہر موئدین اُردو کی طرف سے چند اعتراضوں کا بجز اس کے کہ ہندی
ناگری پر بھی ویسا ہی معارضہ کریں اور کچھ نہ ہو سکا۔ اخر اُردو اُٹھا دی گئی
جاننے والے جانتے ہیں کہ اہل دفتر و ہندو مسلمان رعایا کی مشکلیں کس
قدر بڑھ گئیں۔ اس بحث گزشتہ کا کچھ مقصد نہیں الا [illegible]
بہرکیف دو تین اعتراض بظاہر بہت سخت تھے ایک یہ کہ اُردو بہ مقابلہ ہندی
کے بہت دیر میں آتی ہے۔ برسوں گذر جاتے ہیں۔ مگر لکھنا پڑھنا نہیں آتا
برخلاف ہندی کے کہ ایک مہینے میں کافی طرح آجاتی ہے۔ دوسرے
اُردو میں الفاظ مشتبہ الاشکال کی کثرت ہے۔ اگر انسان زبان اُردو سے
ناواقف ہو اور پیشتر سے وہ لفظ کا علم نہ ہو تو درست طرح سے پڑھ نہیں
سکتا۔ مثلاً شیر، شیر وغیرہ حالت مفرد میں بلکہ بعض دفعہ ترکیب کے ساتھ
بھی اشتباہ ہو جاتا ہے۔ اسی قبیل کے اعتراضات تھے جو مجھ کو مدتوں
کھٹکا کئے اور میرے ذہن میں ان کا تدارک بھی تھا۔ جب میں اُردو و فارسی
و عربی کا نصاب تعلیم لکھنے بیٹھا اور سب سے پہلے یہی کتاب اُردو تعلیم

سے اس کو پیش کیا۔ اتفاق سے بجز میرے اور سب ممبر اس وقت اُنکے
ہم خیال جمع تھے۔ مگر خوش قسمتی سے ڈاکٹر فیلن صاحب انسپکٹر فرلو پر گئے
تھے۔ اُن کی جگہ ایک دُوسرے تازہ ولایت کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے۔
منشی صاحب نے اِس کی تحریک پیش کی اور یہ کہا کہ صوبہ بہار کی عام
زبان اردو نہیں ہے اور جو تھوڑے سے لوگ اس زبان کو استعمال
کرتے بھی ہیں وہ صرف ونحو سے غلط ہے۔ اپنے دعویٰ پر چند چھپے ہوئے
اردو کے رسالے قاصد اخبار اور کچہری کے بعض کاغذات بھی پیش کئے۔
اِس میں شک نہیں کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے بوجوہاتِ چند ہمارے صوبہ
کے لوگوں کو صحتِ زبان کا خیال جاتا رہا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور بڑے
شدّومدّ سے اس کی تردید کی پریسیڈنٹ نے ڈاکٹر فیلن صاحب کے آنے
پر اس رزولیوشن کو اُٹھا لیا۔ مَیں نے اپنی جگہ غور کرکے جو دیکھا تو واقعی یہاں
کی زبان میں چند غلطیاں صرف ونحو کی پائیں۔ اِسی بنا پر یہ کتاب لکھی تاکہ
ہمارے ہم وطن چونکیں اور اپنی مادری زبان کی صحت کی طرف متوجہ ہوں
اس میں شک نہیں کہ بہ مصلحت مَیں نے کسی قدر سخت لہجہ سے ٹوکا تھا اور
یہی تدبیر بکار آمد ہو گئی۔ بعض نوجوان ہونہار اہلِ قلم کو غصہ آیا اور جہاں
تک اُن کے امکان میں تھا مجھ پر غصہ نکالا۔ گو وُہ میری توہین کرتے
تھے میرے سچے جھوٹے عیوب شائع کرتے تھے۔ مجھ کو گالیاں دیتے
تھے۔ مگر اُن صرف ونحو کی غلطیوں سے عبارتوں کو بچاتے تھے جن کو
مَیں نے کتاب میں درج کر دیا تھا۔ چونکہ یہ مخالفت سارے شہر میں پھیل کر
بہار بھر میں سرایت کر گئی۔ اِس لئے لوگ بہت جلد اُن غلطیوں کو سمجھ
گئے جن کی اِصلاح کا مجھے خیال تھا۔ یہ مخالفت اور ہجو سرائیاں سات آٹھ

برس تک مسلسل قائم رہیں۔ مگر الحمدللہ کہ نہ مجھ کو کسی سے کوئی خلش ہوئی اور نہ میں نے کسی کے جواب میں قلم کو حرفِ لغو سے آلودہ کیا۔

خدا کا شکر ہے کہ اتنے ہی عرصہ میں زبانِ تحریری اور کسی قدر زبانِ تقریری کی بھی اصلاح ہو گئی۔ اگر یہاں کے اہلِ قلم کسی جگہ کے اہلِ قلم سے زیادہ نہیں تو شائد کم بھی نہ ہونگے۔ یہ کتاب بارہ جزو کی ہے مگر اب گویا نایاب ہے۔

فارسی تعلیم

یہ کتاب پندرہ جزو کی ہے۔ ایک سال کی پڑھائی ہے اس کو پڑھکر متعلم فارسی کی صرف و نحو وادب پر ضرور حاوی ہو جائے گا۔ پنج رقعہ مینابازار وغیرہ رنگین عبارت کی کتابوں سے لیکر سادہ اور بامحاورہ کتابوں کو اچھی طرح خود سمجھ لے گا۔ حال کی فارسی پر کچھ کچھ دستگاہ بہم پہنچائے گا۔ اہلِ عجم سے بامحاورہ باتیں کرسکیگا۔ خود بھی مربوط عبارت لکھ لیگا۔

الصرف النحو المنطق الادب

یہ چاروں کتابیں عربی عبارت سمجھ کر پڑھ لینے کے لئے کافی ہیں۔ دو برس کی مدت میں بآسانی پڑھ جائیگا۔ غرض چھوؤں مذکورۂ بالا کتابیں استعداد فارسی وعربی کے لئے کفایت کرتی ہیں۔ یہ چار عربی کتابیں ۲۵ جزو میں ہیں۔

جواہر آبدار

خریطۂ جواہر کی طرح اس میں ہزاروں شعر دیوانوں سے منتخب کر کے جمع کر دیئے ہیں بارہ جزو کی کتاب ہے

مردم دیدہ

اِس کے نام سے ظاہر ہے کہ اسم بامسمّیٰ ہے جس جس سے مُلاقات ہُوئی یا جس کو دیکھا بقدر اپنے علم کے اُتنا حال اس کا لکھدیا۔ رفتہ رفتہ اس کی کئی جلدیں ہوگئیں۔ مقدمہ میں اس کتاب کے تین زمانے قائم کر کے سب کے خصُوصیات الگ الگ مذکور کر دی ہیں۔ ایک اچھّی یادگار ہے۔ اب یہ کتاب چالیس جزو کے قریب ہے۔

یُوں خیال فرمایئے کہ نظم کا ذخیرہ ایک سو چالیس جزو کا اور نثر کا دو سو جزوں کا ہے۔ خدا جانے کن کن مشقتوں اور دماغ سوزیوں کے بعد یہ ذخیرے جمع ہُوئے ہیں۔

پہلے جو چند کتابیں خرچ کر کے چھپوائیں اُتنے روپوں سے ہاتھ دھونا پڑا اِس کے علاوہ مطبع کے معاملات کتابت کی غلطیاں الگ جانکاہ۔ غرض کہ مجھ کو ایسے چند تجربے ہُوئے کہ جی چھُوٹ گیا۔ اس کے علاوہ میری تو محنت سب تصنیفوں میں ہے کس کو مقدم کروں کس کو مؤخّر۔ جب تک کل کے چھپنے کا سامان نہ ہو۔ میرا یہ دل نہیں چاہتا کہ ایک چیز کو چھپوا کر اُسکے بکنے کی راہ دیکھوں۔ ان سب کے چھپنے کا جب تک یہ بندوبست نہ ہو کہ مطبع میرے ہی گھر میں ہو اور خرچ اسکا پہلے سے فراہم نہ ہو۔ تب تک میں کسی طرح اقدام نہیں کر سکتا گو

رنگِ سیار

یعنی

عیّار قلندر

(ایک حیرت انگیز حکایت جو مسٹر ایچ۔ ایل۔ آڈم کی دلچسپ کتاب "لوبیٹل کرائم" سے خاص مخزن کے لئے مرتب کی گئی)

جاڑا اب پا بر کاب ہے اور گرمی کی لین ڈوری آ چکی ہے۔ بمبئی۔ چوپاٹی۔ دریا کے کنارے آفتاب اُفق تک آ پہنچا ہے اور دن بھر کا جلا بھنا اب دریا میں غوطہ لگانے کی فکر میں ہے۔ ہوا بیباکی کے ساتھ آب دریا سے شوخیاں کر رہی ہے۔ لہریں اُچھلتی کودتی ساحل تک آ آ کر موجیں اُڑا رہی ہیں شام کا جھٹپٹا وقت آج معمول سے کسی قدر زیادہ ٹھنڈا ہے اور اسی برودت کی وجہ سے ساحل دریا پر سائرین کا جمگھٹا معمول سے کم ہے۔ ایسے میں ایک نوجوان خوش رو۔ خوش لباس حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔ یہ سبزہ آغاز جہوشس پارسی بچہ گھر سے خوش مگر بشرے سے اسوقت مغموم اپنے ارادوں میں ناکامیاب اسیر اندوہ و اضطراب ہے۔ تشویش کا مارا یہ نوجوان لب دریا آیا اور "یا داوار" کہکے ایک تکیہ دار بنچ پر آبدیدہ بیٹھ گیا۔ دُور دُور اور بھی مرد عورت خصوصًا پارسی گوناگون لباس میں خراماں سیر کناں ہیں مگر کم کم۔ کیونکہ سردی میں دریا کی سیر یہاں پُر خطر سمجھی جاتی ہے۔ ابھی کوئی پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہونگے کہ ایک طرف سے ایک بے فکرے لکھنوی لمبا انگرکھہ پہنے۔ ہاتھ میں جریب لئے آئے سامنے

والی بنچ پر جوان کے مقابل جا بیٹھے اور ایک مستانہ ادا کے ساتھ لگے جھوم جھوم کر غزل گانے ؎

جو بے ثبات تھے تو کاش رنگ و بو ہوتے ۔۔۔ کسی مٹے ہوئے عاشق کی آرزو ہوتے
شراب سرخ جو ملتی تو با وضو ہوتے ۔۔۔ نماز پڑھتے خدائی میں سرخرو ہوتے

میاں بے فکرے یہ شعر گاتے گاتے ایسے جھکے۔ ایسے جذبے میں آئے جیسے انہیں حال آگیا۔ ہمارے بھولے نوجوان اُن کی چال بازی نہ سمجھ سکے اور حیران ہوکر پوچھنے لگے۔ میاں صاحب۔ یہ شراب۔ وضو اور نماز یہ سب آپ کیا گا گئے۔ ذرا اس کے معنے ہمیں تو سمجھائیے"

"سیٹھ صاحب یہ حقانیت کے رموز ہیں ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتے!" بے فکرے میاں نے بڑے استغنا سے جواب دیا۔ اور بھولے نوجوان کے اصرار پر کہنے لگے "صاحب شاعر کہتا ہے کہ شراب سرخ جو ملتی تو ہم اس سے وضو کرتے۔ کیونکہ شراب بھی ایک رقیق اور سیال شئے ہے پانی جیسی۔ آیا خیال شریف میں؟ لیکن وہ شراب کون سی۔ کچھ یہ بھی معلوم ہے؟ وہ آپ کی تار والی برانڈی یا لال مسالے کی نہیں۔ مگر شراب وحدانیت وحقانیت بائیں آگے سارا مطلب خود سمجھ لیجئے"۔ اتنا کہا اور حضرت مست پھر گانے لگے ؎

نکلتی ساری تمنا ہمارے دل کی اگر ۔۔۔ وہ ہم ہیں۔ پھر بھی سراپا آرزو ہوتے
عدم میں جاکے بھی آتا ہمیں قرار کہاں ۔۔۔ وہاں بھی تیرے لئے گرم جستجو ہوتے
گہر کی طرح نہ منہ کھولتے بشر طالب ۔۔۔ اگر زمانے میں خواہانِ آبرو ہوتے

مقطع پورا ہوتے ہی کو نغا کہ کھٹ کھٹ کھڑاؤں کی آواز آئی ایک پارسا صورت۔ ولی صفت۔ شاہ جی ابجل میں بوریا ہات میں تسبیح لئے

فقیرانہ مجلس کے تشریف لاتے نظر آئے۔ ایک خاص ادا انداز سے قدم دھرتے۔ سب کی توجہ اپنی طرف مائل کرتے قریب آگئے۔ بوریا بچھا کے۔ ایک نادر نمائش کا رنگ جما کے۔ شاہ جی۔ نماز دُعا خشوع خضوع میں مشغول ہو گئے۔ حاضرین کی آنکھیں حیرت و اشتیاق سے اسی طرف جا لگیں۔ کیونکہ یہ نظارہ کسی معمولی نمازی کے جلوے سے کچھ زیادہ شاندار اور دلکش تھا۔

مُسن نمازی نے دُنیا سے اپنی پُوری بے لوثی کا ایک دل آویز فوٹو ناظرین کے دلوں پر کھینچا اور بوریا سمیٹ کر جدھر سے آیا تھا محض بے پروائی کے ساتھ اُدھر کو چل دیا۔ مگر جاتا جاتا ہمارے بھولے نوجوان کو کنکھیوں سے بھانپتا گیا!

نوجوان پارسی نے اُس ادھیڑ نمازی کو کئی دن بلا ناغہ آتے اور طاعت الٰہی میں سر جھکاتے بڑی حیرت سے دیکھا اور اس کی خدا پرستی کے قائل ہو گئے۔ یہ اب اس بات کے درپے ہُوئے کہ ان اللہ والے صاحبِ کمال نمازی کا پتہ لگائیں اور ان کے اعجاز سے اپنی مراد پائیں۔

ایک دن شام کو حسبِ معمول۔ ہمارے من چلے نوجوان لبِ دریا بیٹھے کچھ منصوبے گانٹھ رہے تھے کہ اُنہوں نے شاہ جی کو آتے دیکھا۔ شاہ جی ہنوز چلے ہی آ رہے تھے کہ اتنے میں دوسری جانب سے ایک اور حضرت ثقہ صورت نمودار ہُوئے۔ نوجوان کے بالمقابل کھڑے ہو گئے اور شاہ جی کی طرف عقیدت کی نظر سے دیکھتے ہُوئے بآوازِ بلند کہنے لگے "اہا! کیا جلال ہے۔ بخدا کیا کمال ہے۔ یہ خدا رسیدہ بھی آج اس دُنیا میں بے مثال ہے (نوجوان سے) ہاں سیٹھ جی قسم وحدہٗ لاشریک لہٗ کی بے مثال ہے"! بھولے نوجوان کے سمندِ شوق کے لئے یہ تحریص دینے والی تحریک گویا

تازیانہ بن گئی۔ انہوں نے بے اختیار پوچھنا شروع کیا" مگر کیوں میاں صاحب یہ ہیں کون یہ رہتے کہاں ہیں؟ آج ہم کئی دن سے"......

" ہیں کون! کیا خوب! سیٹھ جی کیا آپ "پیر مغربی" کو نہیں جانتے؟ جنکا ایک زمانہ قائل۔ موکلان عرش و ارض جنکے تابع۔ جن پری جنکے خزانچی ارے آپ انہیں نہیں جانتے!! عجب عجب سخت عجب!"

"زمانہ قائل! جن پری خزانچی"! ہمارے نادان نوجوان حیرت و اضطراب میں ڈوبے۔ یہ فقرے کہتے۔ منہ کھولے کے کھولے رہ گئے! حُسن نازی یعنی پیر مغربی نے دکھاوے کی نماز پڑھی۔ بوریا لپیٹی اور خاص تمکنت کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ وہ کوئی دس بیس قدم چلے ہونگے کہ ایک اور صاحب ایک سمت سے نکل آئے۔ جھٹ شاہ جی کے پاؤں پہ گر پڑے اور دیر تک قدم لیتے رہے۔

شاہ جی" پیر مغربی" نے جھٹ پاؤں ہٹالئے اور بناوٹ سے چلّا اُٹھے "بس بچا بس! سر اُٹھا مجھے زیادہ گنہگار نہ بنا۔ سجدہ اس کے تئیں روا ہے جو دوجہاں کا خدا ہے۔ لاحول بلا کوبت" (لاحول لاقوۃ)

" پیر صاحب! کل جو آپ نے دس ہزار روپے نہ دلائے ہوتے تو بخدا آج ناظر کے پیادے گھر کا صفایا کر جاتے کیونکہ مہاجن نے قرقی کرالی تھی۔ بلکہ گرفتاری کا وارنٹ بھی جاری کرالیا تھا"۔ اتنا کہا اور اس انگن نے شاہ جی کے قدموں پر اپنا سر دے مارا۔

"بیٹا وہ تیرے نصیب کا تھا۔ وہ روپیہ تیرا ہی تھا۔ مَیں نے جو کیا حکم معبود سے کیا۔ ورنہ میرے لئے تو اس دنیا کی دولت سانپ بچھو کے برابر ہے۔ اَل دُنیا جی پھنّن وطالب فلاں بن! (الدّنیا جیفۃٌ وطالبہا کلابٌ یعنی دُنیا

مرداریے اور اس کے طلبگار کتے ۔ حدیث شریف) پیر روشن ضمیر آپ سا صاحب اعجاز ہوا ہے نہ ہوگا"۔ جیسے کوئی کسی کو سُنا سُنا کے کہے اِس طرح اس پاؤں پڑنے والے شخص سے بے یقینی لہجے میں اتنا کہا اور پھر قدم چوم کر ایک طرف کو چل دیا۔ شاہ جی آگے بڑھے کہ ناگہاں ایک اور آدمی سامنے آیا اور پاؤں پر گر پڑا "اے خدا کے پیارے پیر ذی توقیر۔ آپ نے جو روپے مجھے پر سال دلوائے تھے سب اُٹھ گئے۔ اب ایک نئی مصیبت درپیش ہے۔ بیٹی جوان ہو گئی اُس کی شادی ٹھہر چکی۔ مگر میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ للہ کرم کیجئے۔ ایک پانچ ہزار مجھے اور دلوا دیجئے"۔

شاہ جی نے بڑی نخوت سے ہمارے بھولے نوجوان کی طرف دیکھا اور اُس سائل سے کہا "اچھا بچا کل شام کو میرے تکیے پر آنا۔ روپے لے جانا"۔ اتنا فرما کے وہ ایک استغنا کے ساتھ قدم بڑھائے چل دیئے اور درختوں کی آڑ میں غائب ہو گئے۔

دس ہزار! پانچ ہزار! یا دادا! دس ہزار اور یہ نمازی پرہیزگار ایسی کہتے یہی سوچتے سراپا دریائے حیرت میں ڈوبے۔ ہمارے بھولے نوجوان گھر آئے مگر رات بھر انہیں نیند نہ آئی۔ شاہ جی کے موکلوں نے نادان نوجوان کے شوق۔ استعجاب۔ ہوس اور حیثیت کی ساری حقیقت شاہ جی کو گھر بیٹھے پہنچا دی۔

دوسرا دن ہے اور شام کا سہانا وقت۔ ہمارے ناتجربہ کار نوجوان سخت انتشار و اضطراب میں لب دریا بیٹھے اور سیم و زر کے بھوکے پیاسے شاہ جی کی راہ تک رہے ہیں کہ اتنے میں شاہ جی آ گئے۔ ایک انوکھی آن بان کے ساتھ اپنی جگہ پر گئے اور جاتے ہی خدا سے لو لگائی۔ نادان نوجوان

کے اضطرار نے انہیں سیماب وار بیقرار بنا دیا۔ وہ بلا مبالغہ جلے پاؤں کی بلی بن گئے! اُٹھے۔ بڑھے۔ کچھ چلے۔ ہمّت نہ پڑی۔ پھر لوٹے۔ کئی بار پس و پیش کی ٹھوکریں کھا کر آخر بڑے جتھے سے شاہ جی کے سامنے گئے۔ سامنا ہوتا تھا کہ شاہ جی ریشہ خطمی ہو گئے اور عالم الغیب بنکر چلّا اُٹھے۔ "آ! اے مضیب کا دھنی جوان آ۔ باغ نوشیرواں کے شاداب بوٹے۔ آ۔ تیرے ہی لئے۔ اے دودمانِ دارا کے روشن چراغ بس تیرے ہی لئے میں اب تک بمبئی میں ٹھہرا رہا ورنہ کب کا "کالے سر پ" (کیجئے شریف) چلا گیا ہوتا"

"میرے دھن بھاگ! میرے زہے نصیب"! کہکر ہمارے نادان نوجوان شاہ جی کے پاؤں پر گر پڑے۔ "اُٹھ۔ اُٹھ۔ اے نوشیرواں کی اولاد اُٹھ مجھے گناہ میں نہ ڈال۔ میرے پاؤں نہ پڑ۔ بیٹا مجھے الہام ہوا ہے کہ جہاں میرا تکیہ ہے وہیں سوا لاکھ روپیہ تیرے نصیب کا گڑا ہے۔ اگلے زمانے میں تیرے ہی خاندان کے کسی امیر نے یہ خزانہ دفن کیا ہے۔ کل خواب میں مجھے اللہ کا حکم ہوا ہے کہ یہ خزانہ اس جوان کو۔ اس رستم جی کو دیدو!

"جی ہاں۔ میرا ہی۔ مجھ خاکسار ہی کا نام رستم جی ہے"۔

"ہاں۔ رستم جی۔ بن اسفندیار جی! یہی نام رات فرشتے نے مجھے بتایا تھا۔ چل بیٹا میرے ساتھ چل اور اپنا مال لے لے"!

بیم و رجا کے دو آبے میں پڑے ہوئے نادان نوجوان ایک سکتے کے عالم میں شاہ جی کے ساتھ ہو لئے۔ مگر انہیں یہ خبر نہیں کہ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں! گرانٹ روڈ کا پل۔ بمبئی بڑودہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ اندر جا کے ایک دالان ہے جس کی زمین بالکل کچی ہے۔ تیل بتی کے ٹمٹماتے ہوئے دو دیسی چراغ دو دیوٹ

پر جل رہے ہیں۔ تین چار برقعہ پوش آدمی سیاہ کپڑے پہنے ایک طرف کھڑے ہیں۔ لوبان جل رہا ہے۔ پھولوں کے ہار رکھے ہیں۔ شاہ جی نے نوجوان کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ نادان نوجوان پہلے تو گھبرائے مگر آخر جی کڑا کرکے اندر گئے۔ شاہ جی کے اشارے سے ایک برقعہ پوش نے آمنے سامنے دو چٹائیاں ڈال دیں۔ ایک پر پیر غربی یعنی شاہ جی اور دوسری پر ذرا دُور۔ ہمارے بھولے بھالے نوجوان بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے کچھ پڑھنا شروع کیا اور پھر پکار کے کہا "حسن کھودو"۔ معًا ایک برقعہ پوش ایک پھاوڑا لایا اور زمین کھودنے لگا۔ کچھ ہی کھودا ہوگا کہ اُس نے پھاوڑا پھینک دیا اور زمین پر گر کر کانپنے لگا!

"نہیں۔ پیر جی نہیں۔ میں نہ کھودونگا۔ وہ دیکھئے جنات منہ سے شعلے نکالتے مجھ پر لپکے آرہے ہیں! وہ دیکھو وہ۔ سانپ بچھو مجھ پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ بچاؤ پیر جی مجھے بچاؤ"! یہ کہا اور حسن نے منہ سے خون پھینک دیا!

"ڈر نہیں۔ کچھ ڈر نہیں حسن جب تک میں ہوں جنات کی یا حشرات الارض کی کوئی مجال نہیں کہ تیرا ایک بال بیکا کرسکیں۔ کھود تو بخوف کھود" پھر کھدائی شروع ہوئی۔ کچھ گہرے سے ایک سربمُہر دیگ نکلی۔ مُہر توڑی گئی۔ پھنکاریں مارتا ہوا ایک سانپ دیگ میں سے نکل پڑا! کئی بار آگ کے شعلے بھڑکے میاں حسن جھجک کے پیچھے ہٹے اور پھر دہائی دینے لگے "آہ! اب تو بڑے بڑے مہیب دیو منہ پھیلائے مجھ پر لپک رہے ہیں۔ آگ کے شعلے بڑھے آتے ہیں۔ بچاؤ پیر جی للہ مجھے بچاؤ"!

"کچھ ڈر نہیں۔ کیا طاقت (آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا کے) کیوں اب کیا حال ہے؟

"بجھ گئی! آگ بھی بجھ گئی اور دیو بھی بھاگ نکلے! واہ پیر جی آپ کے کرامات کی کیا بات ہے"! پیر جی نخوت سے سرشار ادر بھولے نوجوان حیرت سے نقش بدیوار بن گئے! سانپ دیگ سے نکال لیا گیا۔ ایک ہانڈی میں قید کیا گیا۔ شاہ جی نے ایک مٹھی اشرفی دیگ سے نکال کر نادان نوجوان کے آگے پھینکدی اور کہا۔ "بیٹا ایسی سوا لاکھ اشرفیاں رکھی ہیں جو خاص الخاص تیری ہیں۔ مگر جنات ان پر قابض ہیں۔ ایک جن سانپ بنا اس خزانے پر بیٹھا تھا جسے میں نے عمل پڑھ کر ہانڈی میں قید کر دیا ہے! تو امیر کا بیٹا ہے مگر اپنی فضول خرچیوں سے نادار دولت کا طلبگار ہو رہا ہے۔ یہ خزانہ ازل سے تیری ہی تقدیر کا ہے۔ ذرا ٹھہر میں شاہِ جن سے خط کتابت کرتا ہوں"! ایک لال رنگ کے باریک کاغذ پر لال روشنائی اور انار کے قلم سے کچھ لکھا گیا اور چراغ کے پیچھے غائب کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسی چراغ کے پیچھے سے ایک رقعہ نمودار ہوا۔ پڑھا گیا "شاہِ جن کا یہ حکم ہے کہ پہلے پچیس ۲۵ ہزار فقیر کھلائے جائیں اور انہیں ایک ایک کمل دیا جائے اس کے بعد سوا لاکھ کا خزانہ اس کے مستحق کو دیدیا جائے۔ بصورتِ خلاف ورزی تمام اشرفیاں سانپ بچھو بن جائیں گی"!

"بیٹا! اب تو گھر جا۔ بیس ہزار کسی حکمت سے لا اور اپنا خزانہ لیجا۔ میرے لئے مالِ دنیا حرام ہے۔ مُردار ہے۔ استنگ پھر لا" (استغفر اللہ) شاہ جی نے ابھی یہ بات پوری بھی نہ کی تھی کہ صدر دروازہ توڑ کر خان بہادر سردار میر عبد العلی خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ معہ اپنے ہمراہیوں کے قضائے مبرم کی طرح آ ٹوٹے "شہ سندر جی۔ یہ تمہارے نام کا وارنٹ ہے۔ تم نے دھوکا دیکر ایک دیسی ریاست سے ایک بڑی رقم اڑائی ہے۔ تم گرفتار ہوئے"!

سُندر جی مع کل بُرقعہ پوشوں کے باندھ لئے گئے۔ اور سندر جی ولد شنکر جی کی نانی مرگئی۔ کیونکہ وُہ پیر مغربی بنے ہُوئے ایک رنگے سیار گجرات کاٹھیاواڑ کے کوئی ٹھگ عیار تھے۔ وُہ سانپ پلاؤ تھا۔ وُہ اشرفیاں گلٹ کئے ہُوئے پیسے تھے اور وُہ عملیات سب فاسفورس اور تیزاب کے تھے۔ اور جنہوں نے سُندر جی کو با خدا بنا رکھا تھا وُہ کوئی اور نہیں مگر خاص سندر جی کے پُرانے گھاگ گرگے تھے۔ ہمارے نادان نوجوان سے

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

دام فریب میں پھنستے پھنستے بچ کر اس تازہ واردات کے گواہ قرار دیئے گئے اور چند روز کے بعد لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ جیل کے کپڑوں میں آگے آگے سُندر جی پیر مغربی ہیں اور ان کے پیچھے جیل خانے کے ڈنڈے باز سپاہی!

طالب بنارسی از بمبئی

اب میں کہا کروں تدبیر

بے کھبری میں من کے اندر۔ لاگو چتون تیر
تُو بجوگ میں مو یاپن کی۔ کو نہ دھراوت دھیر
نین کٹاری مار کے سجنی۔ تن من ڈارو چیر
ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ پھوٹ گئی تقدیر
من کی نگری رو کی نہیں گئی
نام دھرو جہانگیر!

برجیسِ فلک

ہزار برس سے ہم لوگ علم ہیئت و حرکاتِ کواکب کے دلدادہ ہیں مگر اس فن سے قوم کو کچھ نفع نہ پہنچا۔ ہمیں اگر یہ مسئلہ معلوم ہو گیا کہ مشتری آفتاب سے ہزار حصے چھوٹا ہے تو کیا حاصل۔ کاش اس مسئلہ کو بھی ہم سمجھ سکتے کہ الکٹرون عنصر ہیڈروجن کے ایک جزو سے ہزار حصے چھوٹا ہے۔ افسوس یہ ہوتا ہے کہ جن افاضلِ قوم نے کالجوں میں عمریں صرف کیں وہ بھی ان اسرار سے بے خبر رہے۔ پچیس برس ہوئے کہ مثنوی شگفتگیہ میں میرا یہ شعر۔

بی اے تک پڑھتا ہے اگر کوئی
چھوڑ دیتا ہے شعبۂ علمی

شائع ہوا تھا وہ گنبد کی صدا کی طرح واپس آیا۔ یہ ستارہ آفتاب سے اس قدر چھوٹا ہے پھر بھی تمام سیارات سے بڑا ہے۔ دوری اس کو آفتاب سے اس قدر ہے کہ بہ نسبت اس جسامتِ عظیم کے وزن اس کا کچھ بھی نہیں۔ جو ستارہ جسامت میں تمام سیارات نظامِ شمسی سے بڑا ہے وہ وزن میں اس کم مقدار کرۂ ارض سے بھی ہلکا ہے۔ ہمارے قدمائے متکلمین جنہوں نے جواہر و اعراض میں سے اکثر چیزوں سے وجود و ثبوت کا انکار کیا ہے۔ وجود وزن کے وہ بھی قائل ہو گئے ہیں جسے وہ اعتماد کہتے ہیں۔ مگر تحقیق جدید سے یہ امر ثبوت کو پہنچ گیا کہ وزن بھی ایک امر عدمی ہے۔ ہر ایک جسم بذاتہٖ وزن سے خالی ہو۔ دوسرے جسم کے مقابلہ میں باعتبار قرب و بُعد جو جذب و انجذاب باہمی پیدا ہوتا ہے اسی کو وزن سمجھتے ہیں۔ پھر اگر کسی تیسرے جسم کے ساتھ مقابلہ کریں

تو یہ وزن پہلے وزن سے مغائر ہوگا۔ مثلاً آ کا وزن ب کے مقابلہ میں دیکھو تو تولہ بھر ہے اور ج کے مقابلہ میں ماشہ بھر۔ یعنی بذاتہ کسی جسم میں کچھ وزن نہیں۔ اس تقریر سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اعظم سیارات ہمارے سیارہ ارض سے وزن میں کیوں ہلکا ہے۔

اس ستارہ کو دُوربین سے دیکھا جاتا ہے تو اس کے خطِ استوا سے متوازی چند دھاریاں معلوم ہُوا کرتی ہیں۔ ان دھاریوں میں کچھ تغیر ہوتا رہتا ہے اور جب اُن کا عدد بڑھ جاتا ہے تو چوڑان کم ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ خطِ استوا سے متوازی رہنا بھی سب دھاریوں کا ضرور نہیں۔ ایک دفعہ ایک دھاری ایسی بھی دیکھی گئی جو بیس درجے مائل تھی۔ یورپ کے اہلِ رصد تصریح کرتے ہیں کہ مشتری کی سطح اتنا جلد جلد بدلتے معلوم ہوتی ہے کہ اوّل شب سطح کی کچھ حالت دیکھی اور آخرِ شب تک کچھ اور ہو گئی۔ ارسطو کے پاس دُوربین ہوتی تو یہ کبھی نہ کہتا کہ اجرامِ فلکی تغیرات و حوادث سے محفوظ ہیں۔ یہ تغیرات اِس ستارہ میں شدتِ حرارت کی علامت ہیں کہ وُہی قوّتِ فاعلہ ہے۔ اور آفتاب کی حرارت اُس تک بہت ہی کم پہنچتی ہے۔ لامحالہ وُہ خود ہی مشتعل ہے۔ اس کے مشتعل ہونے کی بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ ۱۸۷۸ء میں اِس میں ایک داغ نمودار ہُوا جو پیمایش میں ستائیس ہزار میل لمبا اور آٹھ ہزار میل چوڑا تھا۔ یہ داغ تقریباً چار برس تک سُرخ معلوم ہوتا رہا۔ ۱۸۸۲ء کے بعد سے سُرخی اُس کی کم ہو گئی۔ ۱۸۸۶ء میں چکا گو میں اس داغ کی رصد لی گئی اور علمائے ہیئت کا یہ خیال جو تھا کہ داغ اِس ستارہ میں کائنات الجو کی ایک قسم ہے۔ بدل گیا۔ کائنات الجو کا ثبات و قیام سالہا سال تک نہایت مستبعد ہے۔ اِس سے مظنہ غالب

یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشتری میں اشتعال ہے اور یہی حال زحل کا بھی ہے کہ دسمبر ۱۸۷۶ء کی ساتویں تاریخ شام کے وقت پروفیسر ہال نے اس کے خطِ استوا میں ایک نورانی داغ دیکھا کہ وہ خطِ استوا سے بہ کر مشرقی کنارہ کی طرف چلا اور ایک روشن لکیر سی بن گئی۔ جنوری تک یہی حالت رہی پھر وہ روشنی بجھ سی گئی۔ ان ستاروں کے مشتعل ہونے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نوعمر و حدیث السن ہیں۔ بلکہ بسبب ضخیم و کثیر الجم ہونے کے وہ ابھی تک اس قدر سرد نہیں ہوئے ہیں کہ سطح بیرونی پر طبقہ منجمد پیدا ہو سکے۔ ورنہ ان سیاروں کی بھی اتنی ہی عمر ہے جتنی آفتاب کی ہے۔ استاد ماہر کانٹ نے اس امر کے شواہد پیش کئے ہیں کہ سارا نظام شمسی ایک لطخہ سحابیہ کی صورت میں تھا۔ جس کی نظیریں آسمان پر بہت سی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لطخہ سحابیہ کی حرارت جو فضائے نامتناہی میں تلف ہو رہی ہے تو اس میں تکاثف ہوتا جاتا ہے۔ اور کروڑوں کوس کا میدان چھوٹتا جاتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اتنا بڑا شعلہ جوالہ جب سمٹا تو اس میں حرارت کا اشتداد اس قدر ہو گیا کہ بعض اجزاء اس کے جدا ہو ہو گئے۔ اور وہی سیارات ہیں۔ غرض کانٹ کی تھیوری اگر صحیح سمجھی جائے تو آفتاب و سیارات کی ایک عمر ہے۔

حکیم کاسنی نے ۱۶۶۵ء میں مشتری کے ایک داغ کو متحرک پایا اور برابر اسے مرصود کرتا رہا جس سے ثابت ہوا کہ اس ستارہ کی حرکت محوری نو ساعت چھپن دقیقہ کی ہے۔

اقمار مشتری میں سے جب کوئی چاند اس کے جرم پر سے گذرتا ہے تو کنارہ پر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک روشن سا دھبہ تاریک زمین پر ہو اور جب مرکز پر پہنچتا ہے۔ تو تاریک دھبہ روشنی میں دکھائی دیتا ہے

اس سے اہلِ رصد نے یہ قیاس کیا ہے کہ یہ ستارہ کناروں کی نسبت بیچ میں زیادہ تر روشن ہے۔

اس بات پر قرینہ بہت قوی ہے کہ مشتری و زحل میں طبقۂ بخار ضرور ہے۔ مگر کسی قسم کا مشاہدہ اس کا نہیں ہوسکتا۔ برخلاف ستارۂ زہرہ کے کہ اس کے کرۂ بخار کا مشاہدہ ہوا کرتا ہے۔ جب زہرہ کا مرور آفتاب پر سے ہوتا ہے تو سیاہ نُقطہ کے گرد ایک دُھندلا سا حلقہ دکھائی دیتا ہے وُہ حلقہ طبقہ ہُوا کا ہے جو سطح آفتاب کو بالکل نہیں چھپا سکتا۔ اور کچھ کچھ نُور آفتاب کا اُس میں نفوذ کرتا رہتا ہے۔ چاند کی حالت اس کے برعکس ہے۔ اُسے آفتاب پر سے گذرتے بارہا سب نے دیکھا ہے۔ اس کے گرد اس طرح کا حلقہ نہیں پایا جاتا۔ اسی سبب سے کہا جاتا ہے کہ چاند میں کرۂ ہوا نہیں ہے۔ اور اُس میں کسی ذی رُوح کا مسکن نہیں ہوسکتا۔ مُشتری میں ہُوا کے ہونے نہ ہونے کا ایسا مشاہدہ ممکن نہیں۔

مشتری اور آفتاب کے درمیان جب زمین آجاتی ہے تو اس زمانہ میں یہ ستارہ ہم لوگوں کو بہت روشن دکھائی دیتا ہے۔ اور ہمیشہ تیرہ مہینے دو تین دِن کے بعد یہ صُورت پیدا ہوتی ہے۔ جیمبرس نے کتاب الھئیہ میں اس کی تصریح کر دی ہے۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ بس یہی زمانہ اس کے ہر شام طلوع کرنے کا ہے اور یہ زمانہ ہر سال ایک مہینہ کئی دن پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ اِس حالت کو کسی خاص مہینہ کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔ یہ مضمون لکھنے کا باعث مجھے یہ ہُوا کہ برجیس فلک کے عنوان سے ایک علمی رسالہ میں جو مضمون شائع ہُوا ہے۔ اس کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ اپریل میں اکثر شام کے بعد جانبِ جنوب ایک بہت روشن ستارہ نظر آیا

کرتا ہو) انتہی - جسے دیکھکر مجھے حیرت ہوئی اور جی چاہا کہ اصل امر سے متنبہ کردوں - اس زمانہ میں مشتری ستارہ قلب عقرب کے مشرق میں چند درجے کے فاصلہ پر دکھائی دیتا ہے - آدھی رات سے طلوع کرتا ہے اور نمازِ صبح کے وقت جانبِ جنوب خط نصف النہار کے قریب ہوتا ہے - اس سال جنوری کے مہینہ میں مشتری و زہرہ و عطارد کا طلوع ایک دوسرے کے بعد صبح کے وقت عجب عالم دکھاتا تھا-

جو لوگ ان ستاروں کو نہیں پہچانتے افسوس ہے کہ انہوں نے یہ تماشا نہیں دیکھا +

علی حیدر طباطبائی

تصویر پچھلے مہینہ ہز ہائینس نظام حیدرآباد کی تصویر دیگئی تھی جنکی ریاست کی علمدوستی اور اہل علم کی قدردانی ہمیشہ سے ہندوستان میں مسلّم رہی ہے - اب کے دربار نورتن اکبری کا مرقع پیشکش کیا جاتا ہے- اکبر اعظم کی عہد میں جس طرح راجہ مان سنگھ- ٹوڈرمل اور بیربر- شیخ ابوالفضل فیضی- خانخانان وغیرہ کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں- خدا آجکل کے ہندو مسلمانوں کو بھی ویسی ہی توفیق عطا فرمائے- وہ دن ہندوستان کے لئے واقعی بڑا مبارک دن ہوگا- جب فروعی تفرقے مٹ کر ساری قومیں محبت اور یگانگت کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آئیں گی- ہمارے ملک معظم حضور جارج پنجم بھی اپنی واپسی کے وقت اپنے خیالات کا اظہار فرما کر رخصت ہوئے تھے-

---

ٹیکس یا محصول

ٹیکس کی ضرورت ہر مہذب ملک میں لوگوں سے ٹیکس وصول کرنا۔ ایک ضرورت کی چیز ہے۔ تاکہ گورنمنٹ کے اخراجات مثل حفاظت جان و مال۔ دادرسی خلائق۔ ارزانی بلا تاخیر اور عموماً ہر دو امیر و غریب کی حالت کی بہتری میں امداد۔ ادا ہو سکیں۔ انگلستان اور یورپ کے تمام بڑے بڑے ممالک میں ٹیکس سوائے عوام الناس کے وکیلوں کی منظوری کے نہیں لگایا جاتا۔ حکمران کو ٹیکس لگانے کا اختیار نہیں اور اگر روپیہ جمع بھی ہو جائے تو وہ اپنی خوشی سے اس کو نہ اخراجاتِ جنگ میں صرف کر سکتا ہے۔ نہ خود رکھنے اور اپنے مصرف میں لانے کا مجاز ہوتا ہے اور نہ اپنے دوستوں کو دے سکتا ہے۔ غرض وہ اپنی مرضی سے اسکو کسی طرح خرچ نہیں کر سکتا یہ اختیار محض لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ گویا عوام الناس اپنے فائدہ کے لئے جس طرح مناسب سمجھتے ہیں اپنے آپ پر ٹیکس لگاتے ہیں اور اس امر کا بھی فیصلہ کرتے ہیں کہ روپیہ کس مصرف میں خرچ کیا جائے۔ ہندوستان کے اضلاع آئین یعنی برٹش انڈیا میں ٹیکس کے نفاذ کی طاقت نواب گورنر جنرل بہادر اور انکے کونسل عالیہ کے اختیار میں ہے۔

ایام سابق میں ٹیکس ہندوستان میں بادشاہ کی خوشی خاطر پر موقوف تھے۔ جب اس کا جی چاہتا لگاتا اور جس طرح سے منشا ہوتا انکو کام میں لا

اب جو روپیہ سرکار برطانیہ بطور ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس کے آمد و خرچ کی پڑتال نہ صرف ہندوستان میں ہوتی ہے۔ بلکہ انگلستان کی قومی مجلس میں اس کی پائی پائی کا حساب دینا اور یہ بتانا پڑتا ہے کہ کہاں اور کیوں خرچ ہوئی اور یہ سب کچھ قید تحریر میں لایا جاتا ہے۔ ہر سال گورنمنٹ آف انڈیا ایک فرد حساب جسکو بجٹ کہتے ہیں تیار کرتی ہے اس کے ایک طرف وہ رقومات درج ہوتی ہیں۔ جن کے صرف کی آئندہ بارہ مہینوں میں ضرورت ہو اور اس کے مقابل یہ دکھایا جاتا ہے کہ یہ اخراجات کن وسائل یا ٹیکس محصولات کے ذریعہ سے وصول ہونگے۔ اس بجٹ پر پہلے تو کلکتہ میں بحث ہوتی ہے اور پھر اس کو ولایت روانہ کر دیا جاتا ہے جہاں اس پر مزید بحث مباحثہ ہو کر وہ پاس ہو جاتا ہے۔

پہلے دنوں میں اور بعض مقامات میں اب بھی ہندوستان میں ٹیکس کا لفظ سرقہ بالجبر کا ہم معنی ہے۔ زبردست ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں سے جو چاہتے رہے ہیں وصول کر لیتے رہے ہیں اور اس بات کا کبھی کسی کو اطمینان نہیں ہوتا رہا کہ ہم کو کیا ادا کرنا ہے اور کس مطلب کے لئے ادا کرنا ہے۔ حفاظت جان و مال جو سب سے اول درجہ کی وجوہ میں سے ایک ہے کہ ٹیکس وصول کئے جائیں۔ تاکہ پولیس اور سپاہ کو تنخواہیں دی جائیں۔ ایک فقرہ تھا جس کے معنی کچھ بھی نہ تھے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ حفاظت جان و مال کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا تھا۔ دراں حالیکہ غریب لوگوں کی غلبہ رانی کے بیلوں سے کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔ جن کو صبح سے شام تک کام کرنا ہوتا تھا۔ اور حاکموں کی دست برد سے جو بچا کھچا رہ جاتا تھا۔ اس پر وہ بری بھلی طرح جیسے ممکن ہوتا تھا اپنا پیٹ پالتے

تھے۔ اُن ممالک میں جہاں کی حکومت اچھّی نہیں ہوتی تھی۔ اور ہندوستان میں چند دیسی ریاستیں اب بھی ایسی موجود ہیں۔ وہاں محض اس بنا پر ٹیکسوں میں اضافہ روا رکھا جاتا ہے کہ حکمراں کی وجاہت اور سامان عیش و عشرت میں ترقی ہو۔ جمع شدہ روپیہ کو فضول افواج اور بیفائدہ عمارات اور اس سے بھی بدتر یہ کہ عیاشی اور اوباشی میں اُڑا دیا جاتا ہے۔ لُطف یہ ہے کہ امیروں سے کچھ نہیں لیا جاتا اور غریبوں سے اُنکی طاقت سے زیادہ وصُول کیا جاتا ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں اُنکو کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔

ٹیکس کے لگان کے متعلق انگلستان کے ایک دانشمند ترین شخص ایڈم سمتھ نے یہ چار قاعدے وضع کئے ہیں جن کا ترجمہ قریب قریب ذیل کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے۔

اوّل۔ لازم ہے کہ کسی ملک کے لوگوں پر انکے ٹیکس ادا کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے ٹیکس لگایا جائے۔ یعنی لوگ اپنی حیثیت کے تناسب سے گورنمنٹ کی معاونت کریں۔ امیر زیادہ دیں اور غریب کم دیں اور بالکل مفلس اور نادار کچھ ادا نہ کریں۔

دوم۔ ٹیکسوں کی مقدار معین اور یقینی ہونی چاہئے۔ اِس کے یہ معنی کہ بجز لمبی پیشتر اطلاع کے انکے مقدار میں اضافہ نہیں ہونا چاہئے۔ اور نیز ان کی کمی بیشی کا مدار ایک شخص کی مرضی پر رکھنا چاہئے۔

سوم۔ ٹیکس اس طریق پر لگانے چاہئے کہ وُہ ادا کرنے والوں کے لئے بلحاظ وقت اور بلحاظ طریق ادائیگی جہانتک ممکن ہو باعث سہولت اور آسانی ہوں۔

چہارم۔ ٹیکس ایسی قسم کے ہونے واجب ہیں کہ جو روپیہ ادا کنندہ سے

اس کا زیادہ سے زیادہ حصّہ سرکار کے خزانہ میں پہنچ جائے۔

ان قواعد پر ایک پانچواں قانون ایسے ممالک کے لئے جیسا ہندوستان ہے اور زیادہ کرنا چاہیئے اور وہ یہ کہ محصُول کی آمد ملک اور محض اہل ملک کی بہتری اور مفادمیں خرچ کرنی چاہیئے اور کسی خاص حاکم یا عامل کے فائدہ یا راحت کے لئے صرف نہیں ہونی چاہیئے۔

اب آؤ دیکھیں کہ ان قوانین کا مطلب کیا ہے۔ پہلا قانون بیّن طور پر منصفانہ معلوم ہوتا ہے۔ امیر شخص کو اپنی جان اور اپنے مال کے لئے حفاظت ضروری ہے اور وہ اُن کے واسطے معقول معاوضہ ادا کرسکتا ہے۔ مفلس کے پاس نہ زر ہے نہ مال۔ لہٰذا اسکو حفاظت کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ اِس لئے اسکو نسبتاً کم ادا کرنا مناسب ہے۔ دوسرا قانون بھی صاف صاف درست ہے۔ کوئی شخص بھی اپنے کاروبار کا اِنتظام اچّھی طرح نہیں رکھ سکتا جسکو یہ خبر نہ ہو کہ مجھے سرکار کو کیا اور کس وقت دینا ہے علاوہ بریں اگر تعداد محصُول معیّن اور معتدل نہ ہو اور ہر شخص کو اس کی پُوری پُوری اطلاع نہ ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام الناس عمّال اور محاصلانِ ٹیکس کے پنجہ میں گرفتار ہو جائینگے۔ اور وہ جس قدر چاہینگے رعایا سے زیادہ ستانی کرلینگے۔ اور یہ لوگ اکثر زیادہ تر ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جو غریبوں کو ستانے والے ہوں۔

تیسرے اصُول کے لئے قدرے تشریح کی ضرورت ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس ایک خاص موقعہ پر روپیہ موجود ہو تو ایسے وقت اس سے محصُول طلب کرنے میں سہولت بھی ہوگی اور معقولیت بھی۔ لیکن اگر کسی سے ایسے وقت روپیہ مانگا جائے جب اس کے پاس موجود نہ ہو تو سوائے

سب بے فائدہ تکلیف کے اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ زمینداری کی مثال لیجئے
اب اس سے فصل کٹ چکنے کے بعد محصول لینا انسب ہوگا۔ بہ نسبت
اس کے کہ فصل سے قبل۔ پھر ٹیکس وصول کرنے کے طریق کو دیکھئے
بطور مثال اگر شراب پر ٹیکس وصول کرنا ہو تو یہ زیادہ قرین مصلحت ہوگا
کہ بجائے ہر خریدار سے جوں جوں وہ شراب خریدنے جاتے ہیں۔ جدا
جدا محصول لینے کے دوکانداری سے یکدم وصول کر لیا جائے۔ اگر فی کس
ٹیکس لینا منظور ہو تو جدا جدا ہر شخص سے اس کے وصول کرنے میں
بے انتہا خرچ ہوگا۔ مزید براں ہر متنفس کو جو تکلیف ہوگی وہ علیحدہ رہی
اب اگر ایک خفیف سا محصول نمک پر لگا دیا جائے جو ہر ایک کے استعمال
میں آتا ہے تو فی کس ٹیکس بھی بسہولت تمام وصول ہو جائیگا اور فساد
بھی برپا نہیں ہوگا۔ بلکہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔

قانون چہارم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا ٹیکس جس کے جمع کرنے پر
بہت سا خرچ آجائے اور صرف تھوڑا سا ہی سرکار کو وصول ہو۔ قرین
دانش و انصاف نہیں۔ فرض کرو ایک ٹیکس عوام الناس سے ہر ایک
کے رہنے سہنے کے گھر کی بڑائی چھٹائی کے مطابق لگایا جائے۔ تو یہ
اسی قبیل کا محصول ہوگا۔ اور سرکار کو بے شمار محرر اور نقشہ نویس رکھنے
پڑینگے جو ہر سال گھروں کو ماپتے رہیں اور ان کا حساب رکھتے رہیں
اس تمام عملہ کی تنخواہ میں سارے کا سارا یا محصول کا بیشتر حصہ جذب
ہو جائیگا اور سرکار کے لئے کچھ بھی نہیں رہیگا۔ مزید براں لوگوں کو
ناحق تکلیف اور کشمکش ہوگی اور فائدہ اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔

پانچواں اصول ایسا ہے کہ اسپر یورپ اور انگلستان میں خصوصًا

کوئی نکتہ چینی نہ ہوگی۔ وہاں لوگ اپنے حقوق سے واقف تھے۔ اور بقائے حکومت کی یہ سب سے پہلی شرط ہے کہ وُہ لوگوں کے فائدہ کے لئے اور انکی خوشنودی پر موقوف اور منحصر ہے۔ اور وہاں ٹیکس محض اسی بنا پر لگائے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان اور دُنیا کے بہت سے دیگر ملکوں میں لوگوں کو باہمی ہر دو حاکم اور محکوم کے بہت سے فرائض سیکھنے ہیں۔ تاہم ہند کے اضلاع آئین میں کم از کم وہ وقت آپہنچا ہے کہ لوگ ٹیکس لگانے اور اس کے صرف کرنے کے سبق عملی طور پر سیکھیں۔

گورنمنٹ آو انڈیا لوگوں کیلئے تمام مقامی معاملات میں ٹیکس لگانے اور سلف گورنمنٹ یعنی اپنے پر آپ حکومت کرنے کے معقول اختیار منظور فرما کر اب (۱۹۲۳ء) دیسی ریاستوں کے روبرو ایک مثال پیش کرنے کو ہے۔ وُہ اپنے اپنے اضلاع میں ٹیکس کی قسم اور مقدار معین کرنے کے مجاز ہونگے اور اپنے وکیلوں کے ذریعہ ایک معقول حد تک اسباب کے بھی مجاز ہونگے کہ جمع شدہ روپیہ کس مصرف میں لگایا جائے۔ یہ تجربہ بڑا دلیرانہ ہے اور اس کی کامیابی ہند کے تعلیم یافتہ اصحاب کی دانشمندی اور زیادہ تر صبر اور تحمل پر موقوف ہے۔ انکو معلوم ہونا چاہئے کہ یورپ اور خصوصاً انگلستان میں عوام الناس صدیوں کی تعلیم سے بتدریج اس نظام سلطنت سے واقف ہوئے ہیں۔ اور چونکہ ہند میں جو فرائض اور ذمہ داریاں اس طریق گورنمنٹ سے لوگوں پر پڑ جائینگی۔ نئی اور اچانک ہونگی۔ اسلئے انپر عمل پیرا ہونے میں انتہا درجہ کی احتیاط اور تحمل شرط ہے کہ کہیں ناکامی کا مُنہ نہ دیکھنا پڑے ✦

صادق از سرینگر کشمیر

قدیم ایرآن اور زرتشت

مہاتما گوتم بدھ کے مابعد کوہستانِ ایران کی جفاکش
ایک مذہبی پیشوا پیدا ہوا۔ جس کا نام زرتشت تھا اور جسے اہل
کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس نے ایک ایسے مذہب کی تلق
اسرائیل کے مذہب کی طرح ضروری اخلاقی باتوں سے پُر
سادہ تھا۔ اہل ایران اُس وقت نیچر پرست تھے۔ اور اُن کی
لازمی طور پر ناقص ہونی چاہئیے تھی۔ کیونکہ وہم پرست لوگ ظ
کو دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ اور اُنکی بدح
فرضی افسانے گھڑ لیتے ہیں۔ پھر چونکہ نیچر کی پرستش میں اخ
دخل نہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ ان دیوتاؤں کی سـ
لباس خود نیچر ہیں) نیچر کے پوجنے والے اخلاق سے لاپروا
ہیں۔ غرض ایسے ہی وجوہات سے زرتشت کی پیدائش سے
ایران کی اخلاقی حالت بہت کچھ قابل اصلاح ہو چکی تھی۔ ز
مادی طاقتوں کے پردے میں۔ نیکی اور بُرائی کے گہرے تو
لیا تھا۔ اس نے معلوم کیا کہ میں نے دو متضاد طاقتیں در
جو انسان کے دل میں اور نیز اس ظاہری دُنیا میں سرگرم پیکا
کیا ہیں؟ روشنی اور تاریکی کی قوتیں۔ صداقت اور کذب کی
قوت جو زندگی بخشنے والی اور خوشگوار ہے۔ دُوسری
مہلک ہے۔ ہر انسان اُن میں سے ایک نہ ایک کے جزو

بحیثیت - ہر مزد کے پیرو ہونے کے اُس نے فرض کر لیا کہ میں آسمانی فوج میں ملازم ہوں اور میرا کام - گناہ اور معصیت - بدکاری اور بُرائی ناانصافی اور دروغگوئی - اور سب قسم کی فرومایہ باتوں کے خلاف جنگ کرنا ہے - اور ہر وہ شخص جس میں نیکی کو بُرائی پر ترجیح دینے کا مادہ تھا - ان مذہبی لڑائیوں میں جنگ کرنے کے لئے طلب کیا گیا - جسکا مدعا یہ تھا کہ اہرمن کو مغلوب کیا جائے -

ایرانیوں نے بہت جلد زرتشت کے عقائد اخذ کر لئے - چونکہ ابھی عیش و عشرت کا مزہ نہ چکھا تھا - اُنہوں نے ایک ایسی آواز کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا - جسے وُہ سمجھتے تھے کہ انہیں صداقت سکھاتی ہے - قدیم اہلِ ایران کو پُرانے زمانے کے صُوفی کہا جاتا ہے - کہتے ہیں کہ کبھی کسی قوم نے بت پرستی سے ایسی نفرت ظاہر نہیں کی - جیسی کہ ایرانیوں نے اس کا یہ باعث ہے کہ انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی - ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ ایک ایرانی لڑکے کو تین باتیں خصُوصیت سے سکھائی جاتی تھیں یعنی گھوڑے پر چڑھنا - شکار کھیلنا - اور سچ بولنا - گویا اُسے بہادر - چالاک اور راستباز بنایا جاتا تھا - اگر کوئی شخص سچ بولنے کا عادی ہے - تو تم یقیناً سمجھ لو - کہ اس میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہونگی - دُنیا کی آدھی بُرائیاں بزدلی سے پیدا ہوتی ہیں - اور وُہ جو جھوٹ بولنے سے ڈرتا ہے - عموماً کسی اور چیز سے خوف نہیں کھاتا - "تقریر" ایک جنس ہے - جس کی ہم سب تجارت کرتے ہیں - مگر دُنیا ایسی تجارت گاہ ہے - جہاں ہم نہایت عُمدہ اور نفیس مال لانے پر مجبور ہیں -

اس قسم کی طبیعت کے یہ ایرانی تھے - اور یہی سبب تھا کہ دُنیا کو اُن

بدعنوں سے پاک وصاف کرنے کے لیے جواب ناقابلِ برداشت ہو گئی یقیں مشیتِ ایزدی سے انہیں کو چُنا۔ شاہِ بل اُن کے سامنے تابِ مقاومت نہ لاسکا۔ لیبو کو سرِ نیاز جھکانا پڑا۔ شہر بابل کی جو عروس البلاد سمجھا جاتا تھا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور اس کے ستارہ شناس منجم اور رمّال باوجود اپنے ہُنر اور کمال کے بھی اسے نہ بچا سکے۔ وُہ خود اور اُن کا شہر تباہ اور برباد کر دیئے گئے۔ اب مصر کی باری آئی۔ اس ملک کو معصیت کی سزا ذرا دیر میں ملی۔ مگر آخرش اس کا جام بھی لبریز ہو گیا۔ کھجوروں کے مقدس جھنڈ دریاؤں میں پھینک دیئے گئے۔ مندروں کی بےحرمتی کی گئی۔ اور بُتوں کے اعضا کاٹ ڈالے گئے۔ متبرک ایپس اپنی الوہیت سمیت۔ رسّی سے باندھکر شاہِ فارس کے سامنے لایا گیا۔ اور ایرانی تلوار نے دُنیا بھر کے سامنے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

جیسا کہ عموماً مذہبی لوگ ایسے موقعوں پر کہا کرتے ہیں۔ اہلِ مصر چلّا اُٹھے۔ "بے ادبی! بے دینی! یہ ایرانی تو مقدس چیزوں کی بھی عزت نہیں کرتے" حقیقت یہ ہے کہ وُہ ان چیزوں کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اِس لئے کہ وُہ ایسی چیزوں کی عزت کرتے ہیں جو دراصل عزت کے قابل ہیں۔ تصنّع اور حیلہ سازی اگر وُہ کسی کام کی نہیں تو اِس سے زیادہ اَور کیا توقع رکھ سکتی ہے۔ کہ اُسکے صحیح تسلیم کرنے سے اِنکار کیا جائے۔ عوام میں ذلیل و رسوا ہو۔ اور پاؤں تلے روندی اور اُس پر ہنسی اُڑائی جائے۔ حتیٰ کہ بیوقوف سے بیوقوف بھی اُس سے نفرت کرنے لگے۔ کیا ہم فرضی دیوتاؤں کی پیشانی پر ہالہ پُرنُور ہی چمکا بنائیں۔ پاس لئے کہ کہیں ان احمقوں کے نازک خیالات کو صدمہ نہ پہنچے۔ جو ایسے

مقدس اور آسمانی سمجھتے ہیں؟ ....

کچھ عرصہ تک یہی حالت رہی۔ ایران کا سیلاب فتوحات رو کے نہ رکتا تھا۔ نیکی اور صداقت نے انہیں قوت عطا کی۔ قوت سے سلطنت قائم ہوئی سلطنت سے دولت بڑھی۔ دولت سے عیش پرستی آئی۔ عیش و عشرت کا آنا تھا۔ کہ کمزوری اور تباہی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اور یہ وہ لازمی نتیجہ ہے جس کا بار بار تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر جس سے کبھی کوئی مفید سبق نہیں لیا گیا۔ کوہستان کا جفاکش جنگجو ایرانی۔ کمینہ نفس پرست اور عیش دوست بن گیا۔ شجاعت زنانہ پن سے بدل گئی۔ ریاکاری نے پارسائی نام پایا۔ اور وہ خود جھوٹا بزدل اور غلام بن گیا۔

....

ایسے حالات میں اہل یونان کا اُسے زیر کر لینا کونسی مشکل بات تھی

حفیظ الدین ملازم دفتر نہر

ناول نویسی

جناب اے۔ ایچ صاحب نے اپنے ایک ناول کا کچھ حصہ مخزن میں درج ہونے کے لئے بھیجا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک طویل مگر دلچسپ اور مفید خط بھی لکھا ہے۔ جس میں فن ناول نویسی کے متعلق اپنے خیالات بہت عمدگی کے ساتھ ظاہر کئے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم ناول کو درج کرنا شروع کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم صاحب موصوف کا خط بجنسہٖ چھاپ دیں۔ افسوس ہے کہ اے ایچ صاحب نے اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی:۔

فی زماننا ناول لکھنا اور پڑھنا ایک نہایت عام بات ہو گئی ہے اور اب یہ دیکھا گیا کہ کچھ عرصہ تک مقبولِ عام رہکر ناولوں کی کسادبازاری ہو گئی اور آجکل اردو کے ناول علم دوست اور ستھرے مذاق والی طبیعتوں کے لئے چنداں دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ بات کچھ اردو ہی کے ساتھ مخصوص پائی گئی کہ کچھ عرصہ تک ایک طرز کو پبلک نہایت پسند کرتی ہے اور تھوڑی مدت بعد وہی پسندیدہ طرز ایسا نظری ہو جاتا ہے کہ پھر لوگ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے ورنہ انگریزی میں دیکھئے کہ شیکسپیر۔ ملٹن وغیرہ حتیٰ کہ چاسر تک اسی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں جیسے کہ ٹینیسن اور ورڈسورتھ وغیرہ باوجودیکہ دونوں کے طرز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ فارسی کو لیجئے تو عرفی و انوری فردوسی و نظامی اور سعدی کو لٹریری دنیا اسی وقعت سے دیکھتی ہے جیسا کہ شعرائے حال کو اور ظہوری و ابوالفضل کی لکھی

ہوتی تھیں باوجود اس کے کہ زمانہ سادگی کو پسند کرنے لگا ہے اسی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں جیسی خود اُن کے زمانہ میں دیکھی جاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی اور فارسی وغیرہ معراج کمال کو پہنچ چکیں اور اُن میں جیسی ترقی اعد جو بات متقدمین نے کر دکھائی اس سے اچھی آئندہ نسلوں سے ہونا ممکن نہیں بخلاف اِس کے اردو میں ابھی بہت ترقی کی ضرورت ہے اور ہر دَور میں ترقی کرتی رہی ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی لوگ اس اعتبار سے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں بمقابلہ اَور زبانوں کے تبدیلی (جو زمانہ کے ساتھ ساتھ ہے) زیادہ واقع ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اور یہ انسان کا خاصہ ہے کہ نئی شئے کی طرف زیادہ رغبت کرتا ہے کُلّ جدیدٍ لذیذٌ لٹریری ہسٹری سے پتہ چلتا ہے کہ جو تغیرات اور تبدیلیاں آجکل ہم اپنی زبان میں دیکھ رہے ہیں وُہ ایک نہ ایک وقت میں سب زبانوں میں ہو چکی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیکسپیر نے اپنے سے پہلے سب ڈراماٹسٹ کی جو اپنے وقت میں ویسے ہی یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے وقعت خاک میں ملا دی اور ایڈیسن نے اپنے متقدمین اور نیز اپنے معاصرین کا جو اپنے اپنے وقت میں لٹریری حیثیت سے ہر طرح اس کے ہم پلّہ تھے ایک طرزِ خاص اختیار کر کے سارا رنگ پھیکا کر دیا۔ فارسی میں تبدیلیاں ضرور ہوئیں۔ مگر ایک طرز کو دُوسرے پر فوقیت کبھی نہیں دی گئی ایک شاعر دوسرے شاعر پر اور ایک نثّار دُوسرے نثّار پر جو سبقت لیگیا وُہ اپنے اپنے جوہرِ ذاتی کا نتیجہ تھا۔ مثلاً فردوسی نے رزم لکھنے میں وُہ کمال کر دکھایا کہ نہ کبھی کسی سے ایسا ہوا اور نہ آیندہ امید۔ سعدی اور عمر خیام نے اخلاق پر جیسی بے بہا کتابیں لکھیں وُہ ایسی نہ تھیں کہ پچھلوں کو شرما

دیتیں یا اگلوں کے لئے رستہ رکھتیں - ایسی حالت میں ہم کو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئیے جبکہ ہم دیکھیں کہ نثر اردو کا پرانا ہر دلعزیز طرز جس کے نہایت اعلیٰ نمونے میر رجب علی بیگ سرور کی تصانیف میں موجود ہیں غالب کے اردوئے معلیٰ کے سامنے ہیچ سمجھا گیا - یا بوستان خیال اور طلسم ہوش رُبا جیسے فسانے موجودہ طرز ناول کے سامنے بیقدر ہو گئے - مگر ہر حالت میں جب ایک طرز متروک ہوا تو دوسرا اس کی جگہ موجود ضرور تھا - لیکن آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ طرز ناول بغیر اس کے کہ اس کا کوئی نعم البدل پیدا ہو اور اس سے کوئی زیادہ پسندیدہ اور موثر طرز قصہ لکھنے کا رواج پکڑے اپنی اُس لٹریری حیثیت سے جو ابتدا میں اسے حاصل ہوئی تھی بہت گر گیا - اس کی ظاہرا وجہ یہی کہی جا سکتی ہے کہ ہر شخص جس نے چند شعرا کا تھوڑا بہت کلام پڑھا اور جس کی نظر سے دو چار ناول گذرے - ناول لکھنے اور مصنف کہلانے پر تیار ہو گیا اور پبلک کو یہ طرز کچھ عرصہ کے لئے ایسا بھایا تھا کہ اس میں اس نے خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرْ کے گولڈن اصول سے انحراف کر کے ہر کتاب کو جس کا کوئی چٹ پٹا نام ہو اور ناول کہلاتا ہو پڑھنا اختیار کر لیا - کچھ ہی عرصہ میں قلعی کھل گئی اور سخن فہم اصحاب پر ظاہر ہو گیا کہ زبان اردو کے ناولوں کے اتنے بڑے اسٹاک میں صرف چند ناول جن کی تصنیف کا فخر صرف چند ہی قابل ناولسٹوں تک محدود ہے ناول کہلائے جانے کے مستحق ہیں اور باقی سب کوڑا کرکٹ ہیں - ناولوں کی بیقدری کی ایک یہ بھی وجہ ہوئی کہ اُن میں شروع سے لیکر اخیر تک جتنی کتابیں لکھی گئیں سب میں ایک ہی قسم کا پلاٹ ہوتا تھا یعنی یہی کہ ہیرو صاحب کسی پر

عاشق ہوئے۔ اگر خوش نصیب ہیں تو چند ے ہجر کی چوٹیں جُدائی کے صدمے سہکر وصال یار سے بہرہ ور ہوئے اور اگر پھوٹی قسمت لیکر آئے تھے تو بیدرد معشوق کی بے اعتنائیوں اور حضرت عشق کی افتراپردازیوں سے تنگ آکر خودکشی کر بیٹھے۔ بس تب لیجئے کامیڈی ٹریجڈی دونوں ختم ہوگئے۔ سوائے اس پلاٹ کے ناولسٹوں کے لئے دُوسرا پلاٹ نہ تھا اور سوائے حضرت عشق کا دکھڑا رونے کے اُنکو کوئی اور کوئی دھندا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ موجودہ طرز ناول سے (جس کا مطالعہ ہر زبان میں تحصیل زبان کے لئے ضروریات سے ہے اور جسے اگر روزمرّہ زبان کی جان کہیں تو بیجا نہیں) بچّوں اور عورتوں کے اخلاق پر نہایت مذموم اثر پڑنے کا اندیشہ ہوا اور یہ بھی ایک سبب اس نئے طرز کی بیقدری کا تھا۔ میری رائے ناقص میں ناول کو صرف ایک "عشق کی داستان" تک محدود رکھنا گویا اس موثر اور دلچسپ طرز کا بیجا استعمال کرنا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ تعلیم یافتہ پبلک کے ایک بڑے حصّہ کو اُس فائدہ سے (جو اس کے مطالعہ کرنے کی صُورت میں متصوّر ہو سکتا تھا) محروم رکھنا یا اس سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچانا ہے۔ اور شاید کوئی بھی ناول سوائے زبان اُردو کے مُحسن مولانا نذیر احمد صاحب کی تصانیف کے جنھوں نے ملک کو تحصیل زبان اور حصُول واقفیت میں معتدبہ فائدہ پہنچایا ہے۔ اِس سے مُبرّا نہیں۔

میرے اِن چند صفحوں کے رنگنے سے یہ خواہش نہیں کہ مَیں بھی مصنّف کہلایا جاؤں اور نہ مَیں اپنے کو کسی طرح اس اعزاز کا مستحق سمجھتا ہُوں۔ بلکہ اسی وجہ سے جناب سے میری ایک استدعا یہ بھی ہے اور

اس درخواست کا پورا ہونا ناول کے شائع ہونے کی صورت میں لازمی ہی کہ میرا حقیر نام مضمون کے ختم پر ہرگز درج نہ فرماویں - میرا یکسی صورت میں دعوی نہیں ہو سکتا کہ میرے یہ چند اوراق اُن ناولوں پر جنکے واسطے اوپر میں "کوڑا کرکٹ" کا لفظ استعمال کرچکا۔ کسی طرح قابلِ ترجیح ہیں۔ نہیں اسی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں بہت سے ایسے ہونگے جن کے مقابلہ میں یہ بالکل ردّی بلکہ اس سے بھی کمتر خیال کیے جائینگے مگر جس وجہ سے مَیں اِسے پبلک کے سامنے لانا چاہتا ہُوں وُہ یہ ہے کہ اِس کا پلاٹ (جہانتک کہ مجھے علم ہے) بالکل نیا ہے۔ اُردو کے اچھے بُرے کئی سو ناول میری نظر سے گذرے ہونگے مگر مَیں نے اس مضمون پر کوئی نہ پایا۔

وہ خاص بات جس کے دِکھانے کی میں اس میں کوشش کرونگا یہ ہی کہ نئی تعلیم کے ساتھ مذہبی پابندی اور تعلیم نہ ہونا کن کن خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔ اِس کے ضمن میں بے پردگی کے نقصانات تعلیم نسواں کے فوائد وغیرہ دکھانے کی کوشش کیجائے گی۔ اگرچہ درمیان میں تھوڑی بہت حُسن و عشق کی داستان بھی آگئی ہے اور اس حالتیں بھی ہیں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ مَیں نے دوسروں کی طرح "عشق کا دُکھڑا" نہیں رویا ہے۔ مگر وُہ ناول کا مقصود اصلی نہیں۔ صرف ضمناً سمجھنا چاہیئے۔ جہانتک مجھے معلوم ہے مضمون اوّل الذکر پر جسکو میرے ناول کا (Keynote) (یا مقصودِ اصلی) سمجھنا چاہیئے کسی صاحب نے قلم نہیں اُٹھایا ہے۔

مَیں ایک چھوٹی سی جگہ کا رہنے والا ہُوں اور بدقسمتی سے نہ تو مجھے دہلی لکھنؤ والوں کی طرح اہلِ زبان ہونے کا فخر ہوسکتا ہے۔ اور نہ اتنی

قابلیت ہے کہ زباندانی کا دعویٰ کروں۔ بہرحال جو کچھ میں نے اپنی ٹوٹی
پھوٹی زبان میں لکھا ہے پیشکش کرتا ہوں۔ زبان کی شائستگی
اور الفاظ کی برجستگی بیشک ایک نہایت موثر چیز ہے مگر اہل خرد کی نظر
ہمیشہ خیالات کی طرف جاتی ہے۔ اُس کی اہمیت تو دوسرے درجہ کی ہے۔
آجکل ہمارے ملک میں یہ مسئلہ نہایت زور کے ساتھ درپیش ہے اور
واقعی نہایت اہم مسئلہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم
کسقدر ضروری ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نئے تعلیم یافتوں کے خیالات
دہریت سے بھرے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے اکثر کلاس فیلوز کو
یہ کہتے سُنا ہے کہ اگر اخلاقی تعلیم کے لحاظ سے ہم محمدؐ صاحب کو یا بودھ
کو پیغمبر مانیں تو شیکسپیئر۔ سعدی۔ اور عمر خیام کا کیا قصور ہے جو وہ
اس زمرے میں نہ شمار کئے جائیں یا اگر فصاحت و بلاغت قرآن کی
آسمانی کتاب ہونے کی دلیل ہے تو سحبان۔ امرالقیس اور کالیداس
کے کلام پر بھی یہی اطلاق کیوں نہ کیا جائے۔ جہانتک میں نے
ایسے لوگوں کو ٹٹولا اُن کی مذہبی معلومات نہایت محدود بلکہ معدوم
دیکھیں اور میں نے اُنکے اِن خیالات کو ہمیشہ اُنکی کمی معلومات کی طرف
منسوب کیا۔ اس ساری خرابی کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانیوں نے
اپنی ساری توجہ صرف نئی تعلیم کیطرف مائل کردی ہے اور سوائے اس کے
ہر چیز کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ہم نئے نئے خزانوں کی تلاش میں ہیں نئے
نئے گنجینوں کا کھوج لگا رہے ہیں۔ مگر ہماری میراثی دولت جو ہمارے
پاس ہے چپکے ہی چپکے علیحدہ ہوئی جاتی ہے۔ اُس کا خیال نہیں کرتے
دیکھئے انگریزی تعلیم کی طرف راغب جو شخص ہے اُسی کا کلمہ پڑھتا ہے

بعض حضرات

پہلے تو بالکل خاموش رہتے ہیں۔ اور پھر یکایک پانچ پانچ چھ چھ ماہ کے پرچے اکٹھے طلب کر لیتے ہیں۔ کہ ہمارے پاس ماہ بماہ نہیں پہنچتے رہے۔ حالانکہ دفتر سے حسب معمول سب خریداروں کے نام رسالہ وقت پر روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسے صاحبان کی اطلاع کے لئے دوبارہ التماس ہے۔ کہ جس ماہ کا پرچہ ان کے پاس نہ پہنچے۔ وہ ایک مہینہ کے اندر اندر دوسرا پرچہ طلب فرما لیا کریں۔ ورنہ اس میعاد کے گذرنے کے بعد پھر رسالہ ان کی خدمت میں بلاقیمت نہیں روانہ ہو سکے گا۔ ایسی صورت میں ٹکٹ بھیجا کریں یا وی۔ پی روانہ کرنے کی اجازت ہو۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

مینجر

رُباعی

ہو مالکِ مُلک و تخت یا صاحبِ تاج
ہو باج گذار یا ستانندہ باج
سُلطان و وزیر ہوں کہ درویش و فقیر
یارب ترے انعام کے سب ہیں محتاج

کانوں کا مذاق فکر خوش نوشی ہے
ازار کی سیر شغل مے نوشی ہے
رہ جیحو چلاؤ کوئی سُنتا ہی نہیں
اللہ بہ آزار گراں گوشی ہے

کوثر خیرآبادی

ریویو

حل قصائد خاقانی (حصہ دوم)

(کورس منشی فاضل و ایم۔ اے)

...سنۂ مشرقیہ مولیٰنا سید احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی نے نہ صرف
...یلیم پر بلکہ پبلک پر بڑا احسان کیا ہے کہ مذکورہ بالا سنگلاخ قصائد
...اور بسیط شرح سے پانی کر کے بہا دیا ہے۔ اور نہ صرف قصائد
...عربی اور فارسی کی مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک کتابوں
...نے میں مولوی صاحب فرد ہیں۔ اس سے قبل قصائد خاقانی
...عالم اور نکات مولانا مرزا محمد عبدالقادر صاحب بیدل اور
...دو مرزا غالب دہلوی حل کر کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء اور
...کو مستفید فرما چکے ہیں۔ اب انہیں کی فرمائش پر قصائد
...وان حل کر کے پبلک کو پیشکش گذار کیا۔
...بیر گذرا کہ پہلے حصہ اوّل شائع کیا گیا اور اعلان دیا گیا کہ تمام
...ان ہیں اگر کوئی صاحب دوسرا حصہ حاصل کر سکتے ہیں تو چشم ما
...ماشاد"۔ مگر جب کامل ایک سال خالی مہینے کی طرح طے ہو گیا اور
...دوسرا حصہ حل ہونے سے خالی رہا تو انتظار دیکھ کر اور ہر طرح
...م کر کے حصہ دوم بھی حل کر کے شائع کیا۔ حصہ اوّل کی قیمت
...حصہ دوم کی قیمت ع سعہ محصول ڈاک ہے۔ جس قدر اجزاء طبع ہوتے
...تکمیل طبع ہی شائقین بعد ادخال قیمت پیشگی ہاتھوں ہاتھ منگوا لیتے
...ں سے زیادہ کسی کتاب کی مقبولیت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس سے

ثابت ہے کہ اگر حضرت محبّد کو گورنمنٹ اور پبلک مدد دے اور قدر افزائی کرے تو وہ مشرقی زبانوں (عربی - فارسی - اُردو - بھاشا) کے خزانوں سے کیسے بے بہا جواہرات نکال کر پبلک میں پیش کر سکتے ہیں اور پھر نہ صرف ترجمے اور شرحیں بلکہ شعرا سلف کی تصانیف کے مقابلہ میں ہر قسم کی اپنی تصانیف دکھا سکتے ہیں اور دکھا چکے ہیں۔ حل کے دونوں حصّے بغرض ریویو ہمارے سامنے ہیں - لہٰذا ہم ذیل میں حل کا کچھ انتخاب پیش کرتے ہیں :-

کہ معظمہ کی زینت اور مناسک حج اور حاجیوں کی پُر شوق حالت اور اُونٹنیوں کی وجد انگیز رفتار کی نیچرل حالت کا سماں باندھتے ہُوئے حضرت خاقانی اپنے قصیدے میں فرماتے ہیں :-

تُحفتیاں عرفِ نو عروساں بستہ کوہان و سنام — اختران شب پلاس چرخ کوہان دیدہ اند

حل - اُونٹنیاں نئی دلہنوں کی طرح حُدی کی آواز کے سماع سے رقص و وجد میں پیہم جھوم رہی ہیں - ستارے اور رات اُن کے زمین سے تھہرو اور آسمان باعتبار بلندی تن و توش بلندی مرتبہ اُن کا کوہان ہے -

روز ہا کم خور چو شبہا نو عروساں در زفاف — دہناشان از درا ہا مطرب الحان دیدہ اند

لغت - زفاف - بالکسر دُلہن کو دُولہا کے گھر بھیجنا اور زِف بالکسر شتر مرغ و شہر و کے پروں کے ریزے اور بالفتح ہوا کا چلنا اور کسی کا جلد چلنا۔

حل - جس طرح دولہن زفاف کی راتوں میں کم کھاتی ہیں یہ اونٹنیاں دنوں میں کم خور تھیں۔ ان کے دف گھنٹوں (جرس) کی آوازیں تھیں جو طرب انگیز دیکھی گئی ہیں -

حلقہا شاں از پلاس گیسوئے شاں از رہا　　　پارہ ہا خلخال و مشاطہ شتربان دیدہ اند

حل انکے حلقے ٹاٹ سے ۔ اُن کی زلفیں کمبل سے تھیں اُن کے کنگن
گھنگرو یا جھانجھنیں تھیں اور اُنکی کنگھی چوٹی کرنے والے شتربان تھے سبحان اللہ
کیا فطری سماں ہے اور کیسے نیچرل سین سے اونٹنیوں کو دولہنیں بنا کر دکھایا ہے

بختگان چوں بختیاں افتاں و خیزاں مست شوق　　　نے نشانے از مے و ساقی و مے داں دیدہ اند

حل بختگان (ارادت کے پکے حاجی) اونٹنیوں کی طرح گرتے اُٹھتے
ہوئے شوق زیارت میں مست تھے حالانکہ نہ شراب و ساقی کا نشان نہ
میدان (صراحی) کا

سرخ مویاں چوں مے و بے مے ہمہ مست آمدہ　　　برہم افتادہ چو گیسوئے زلف جاناں دیدہ اند

حل اونٹنیوں کے بال شراب کی طرح سرخ تھے (گورے رنگ والی عورتوں
کے بال اکثر سرخ ہوتے ہیں جیسے میموں کے) اور بے شراب پیئے
سب راہ چلنے میں مست تھیں اور اُنکے گھنگریالے بال معشوق کی زلف
کی طرح ایک دوسرے پر پڑے ہوئے (گنجان) تھے ۔ سرخ بالوں سے
مراد بھورے بال ہیں ۔

واں کجاوہ چیست میزانِ دو کفہ باردار　　　با جوزا و دو کفہ شکل میزاں دیدہ اند

حل اور یہ اونٹنی کا کجاوہ کیا ہے !! دو پلّوں والی باردار میزان ہے
اور چونکہ کجاوہ میں دو آدمی بیٹھتے ہیں لہذا وہ کجاوہ برج جوزا (دو پیکر)
اور دونوں پلّے میزان ہیں (جوزا اور میزان آسمان پر دو برج ہیں) للہ درہ
تصویر کھینچدی ہے ۔

باروارست چوں فلک خوش سر و مہ خورد شکم
وندو سو چوں مشرقین را دو زبان دیدہ اند

حل - جس طرح آفتاب اور چاند آسمان کے شکم میں دو بچے ہیں اسی طرح کجاوے سے اونٹنیاں بار دار ہیں اور جس طرح آسمان کی دو نوں جانب مشرق و مغرب دو زاہدان (بچہ دان) ہیں اسی طرح کجاوے کے دونوں پتے دو بچہ دان ہیں جن میں شمس و قمر جیسے دو نورانی شکل حاجی بیٹھے ہیں۔ اب صحرائے بادیہ کی تعریف کرتا ہے - جس سے سخت گرمی اور باد سموم کے زمانے میں حاجی گذر رہے ہیں -

شکل چوگان است پائے بادیہ گوئی بزیر   آسماں چوں گوئے غلطان زیر چوگاں دیدہ اند

حل اونٹنیوں کے پاؤں چوگاں کی مانند ہیں اور بادیہ اُنکے نیچے چوگان بازی کا میدان ہے اور آسمان ایک لڑھکتی ہوئی گیند کی طرح نظر آتا ہے اُونٹنیوں کی علو پائگی اور وسعتِ بادیہ کی تعریف ہے۔

قاع صفصف دیدہ وصف صف سپہ داران حاج   کوس را از زیر دستاں زیر دستاں دیدہ اند

لغت - قاع زمین ہموار جس کی واحد قیعہ ہے اور قیعان و اقواع جمع ہے اور بعض کے نزدیک قیعہ بھی قاع کی جمع ہے - صفصف زمین ہموار۔ یہ قاع کی تاکید ہے - کلام مجید میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا الآیۃ

حل گروہا گروہ سپہ داران حجاز نے زمین ہموار چٹیل میدان کو اور پھر اپنے خادموں کے ہاتھوں کے نیچے نقارے کو بجاتے ہوئے دیکھا ہے قاعدہ ہے کہ جب فوج روانہ ہوتی ہے یا قافلہ جاتا ہے تو نقارہ بجاتے ہیں - شعر میں تجنیس قابل ملاحظہ ہے۔

چار صفہائے ملک در صفہ ہائے فلک   بر زبانا جائے استسقا باران دیدہ اند

لغت - زُبانا بالضم چاند کی سولھویں منزل اور وہ دو ستارے جو

برج عقرب کے آگے دو شاخوں کی طرح ہیں۔

حل ملائکہ مقربہ کی چار صفوں سنے نہ فلک کے چبوتروں پر زبانا (منزل قمر) کو پیاسے حاجیوں کے سیراب کرنے کے لئے باران رحمت کے نزول کی دعا مانگنے کا مقام دیکھا یعنی حاجیوں کا یہ مرتبہ ہے کہ فرشتے ان کے سیراب ہونے کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کیونکہ بادیہ میں منزلوں تک پانی کا نشان نہیں۔

گرمگاہے کآفتاب استادہ در قلب اسد سنگ و ریگ ثعلبیہ بید و ریحاں دیدہ اند

لغت - ثعلبیہ ایک موضع کا نام۔ جب آفتاب برج اسد میں آتا ہے تو موسم سرما کا شباب ہوتا ہے۔

حل - ایسا گرم مقام یا گرم وقت کہ آفتاب گرمی کے خوف سے برج اسد میں مقیم ہے اور گرم مقام ثعلبیہ کے سنگریزے اور ریگ گویا بید مشک اور ریحان کی طرح ٹھنڈک پیدا کرنے والے دیکھے گئے ہیں یعنی حاجیوں کو شوق میں ہر تکلیف عین راحت ہے۔

تیرہ چشماں واں ریگ رواں اور زرود شاف شافی ہم ز حصرم ہم ز رماں دیدہ اند

لغت زرود بادیہ میں ایک موضع ہے جہاں ہوا کے تموج سے ہمیشہ ریگ میں روانی رہتی ہے اور یہ ریگ ایسا تیز اور قاتل بصر ہوتا ہے کہ آنکھ میں پڑتے ہی اندھا کر دیتا ہے۔ شاف آنکھوں کے اچھا کرنے والی ایک دوا۔ حصرم کچے انگور۔ رمان بہی۔ انگور و انار کا پانی طباشیر میں ملا کر آنکھ میں ڈالیں تو بصر کو تقویت پہنچتی ہے۔

حل - جو لوگ باطن بازروح کے اندھے ہیں زرود کا ریگ رواں ان کے لئے بھی آنکھوں کو اچھی کرنے والی مرکب دوا ہے۔ یعنی ریگ

زر و دمیں یہ اعجاز ہے"۔

خاقانی کا کلام ایسا دقیق ہے کہ بسا اوقات ایک مصرعہ کو دوسرے مصرعہ سے ربط معلوم نہیں ہوتا۔ پھر غلط چھاپے نے طلبہ اور پروفیسروں کو اور بھی مشکلات میں ڈال دیا ہے۔ مندرجہ ذیل قطعہ ملاحظہ ہو۔

"کوہ محروق آنکہ ہمچوں زر بلفشا ہنگ در دیو را زو در شکنجہ حبس خذلاں بدہ اند
ازدم پاکاں کہ بنشاند چراغ آسماں ناف باحورا بماجر ماہ آباں دیدہ اند

لغت کوہ محروق پہاڑ کا نام۔ باحورا سخت گرمی کے بیس دن ماجر بلند زمین جس کا وسط پستی میں ہو اور نام مقام۔ شفشاہنگ سناروں کا ایک آلہ جس میں چھید ہوتے ہیں اور اُن سے سونے چاندی کے تار کھینچتے ہیں۔ جسے جنتری کہتے ہیں۔ ماہ آبان سخت جاڑے کا مہینا جبکہ آفتاب بُرج عقرب میں رہتا ہے اور سردی اور برف باری کے ایام ہوتے ہیں۔

حل وُہ کوہ محروق کہ اگر شیطان کا وہاں گذر ہو تو وُہ باوصف اس کے کہ شیطان ناری ہے اور نار کو نار کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر وُہ بھی کوہ محروق کی حرارت کے عذاب کے شکنجے میں کھنچ جائے جیسے تار جنتری میں۔ وہاں پاکوں (حاجیوں) کی سرد آہوں سے جو آفتاب کو بجھا دیں سخت گرمی کا مہینا جاڑوں کے پچلے کا مہینا ہو گیا ہے"

ملاحظہ فرمایئے۔ بجز حضرت مجدد کے کون یہ معنے سمجھ سکتا ہے اور پتھروں کو گرمی فکر اور حدتِ ذہن سے موم کی طرح پگھلا سکتا ہے۔

ایڈیٹر

ٹمپرنس ڈیپوٹیشن

اور

...ور لاٹ صاحب بہادر پنجاب

...س سوسائٹی کی طرف سے ٹمپرنس ڈیپوٹیشن جس میں پنڈت
...ب رازدان۔ لالہ رام سرن داس صاحب آنریری مجسٹریٹ
...احب آنریری مجسٹریٹ۔ میاں فیروزالدین صاحب آنریری مجسٹریٹ
...صاحب محسن۔ پادری گلفرڈ صاحب۔ سردار کشن سنگھ صاحب
...ماسٹر بی۔ این ہائی سکول۔ ماسٹر سنت سنگھ صاحب آنریری
...سوسائٹی اور سکرٹری شامل تھے۔ ریسٹ ہوس میں جناب
...ڈین صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں حاضر
...رنے ۳ بجے کے بعد شرف باریابی عطا فرمایا۔ سکرٹری
...ٹی نے ہر ایک کو انٹروڈیوس کرایا۔ ہز آنر نے سب سے
...مصافحہ کیا۔ لالہ رام سرن داس صاحب نے حضور انور کو
...پنڈت بشن نرائن صاحب نے صاحب ممدوح الشان کی ان
...اپنے فریدکوٹ دربار۔ دہلی دربار۔ آبکاری رپورٹ وغیرہ
...ر ٹمپرنس معاملات میں انٹرسٹ لینے کا ذکر کرنے کے بعد
...م حضور کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر خدمت ہوئے
...ئے اقبال سے ٹمپرنس سوسائٹی کو بہت تقویت حاصل ہوئی

ہے۔ ہماری خواہش ہے۔ کہ آپ کی عنایت سے جو زمین ٹمپرنس سوسائٹی کو ملی ہے۔ وہاں ٹمپرنس ہال کا بنیادی پتھر حضور اپنے دست مبارک سے نصب فرمائیں۔ حضور نے ٹمپرنس ڈیپوٹیشن کی ملاقات اور امرتسر ٹمپرنس سوسائٹی کے کام پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور ٹمپرنس کام کی ترقی کے متعلق دریافت کیا۔ اور دوران گفتگو میں ارشاد فرمایا۔ کہ گورنمنٹ امرتسر ٹمپرنس سوسائٹی کی امداد کرچکی اور ہمیشہ امداد کرنے کے لئے تیار ہے۔ شراب خواری سے خرابی ہے۔ لائلپور میں آسودہ لوگ فصل کماد شراب بنانے کے استعمال کے واسطے بوتے ہیں۔ حضور انور نے ریورنڈ گلفرڈ صاحب سے علاقہ ترنتارن کی شرابخواری کی نسبت دریافت کیا۔ ٹمپرنس ہال کے بنیادی پتھر کے متعلق فرمایا۔ کہ ہم کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر کتنا روپیہ جمع کیا گیا ہے۔ سکرٹری نے عرض کیا۔ کہ روپیہ ابھی تک تو جمع نہیں کیا گیا۔ البتہ اب آپ کے اقبال سے بہت جلد فراہم ہو جائیگا۔ دہلی دربار کے موقعہ پر ٹمپرنس ڈراما وغیرہ کے لئے جو روپیہ خرچ ہوا تھا۔ وہ صرف دو تین ہفتہ میں جمع ہوگیا تھا۔ حضور انور نے فرمایا۔ کچھ روپیہ اکٹھا کر کے ہم کو خبر کیجئے۔

سب نے حضور انور کا شکریہ ادا کیا۔ اور واپسی کے وقت ہز آنر نے ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ اور ڈیپوٹیشن کامیابی سے واپس آیا۔

نندلال آنریری سکرٹری

دلِ بیقرار سو جا!

"دلِ بیقرار سو جا" پر مخزن میں کئی حضرات خامہ فرسائی کر چکے ہیں۔ لیکن ان صاحبوں نے جو نظمیں اس فقرہ پر لکھی ہیں وہ محض عشقیہ ہیں۔ عام اس سے کہ وہ عشق مجازی ہو یا حقیقی۔ ان کا دل وہی دل ہے جو بظاہر کسی خوبرو پر کٹ مر رہا ہے۔ لیکن فی الواقع دیکھئے تو ہٹا کٹا اُنکے پہلو میں بیٹھا ہوا اُچھل کود مچا رہا ہے۔ مگر اس دل کا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ جس کا مافی الضمیر "قومی ہمدردی" ہے۔ جس کی آجکل سب کو بڑی سرگرمی سے تلاش ہے۔ اس لحاظ سے یہ "دل بیقرار" کچھ نرالی ندرت رکھتا ہے اور بخلاف دوسروں کے اس میں جو رنگ رس بھرا ہے اور سب سے الگ تھلگ اسے جس پہلو پر جھکا دیا ہے وہ سخن فہم حضرات سے ضرور داد طلب ہے۔ اہلِ نظر دیکھیں گے کہ جناب طالب نے اسے "نو طرز مرصع" بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

(ایک مفلس اور اسکا بیدار دل)

مفلس

نہ تڑپ تمام شب تو۔ نہ ہو اشکبار سو جا — نہ کر انتشار سو جا۔ نہ کر اضطرار سو جا
تیرے دل کی جو کسک ہے نہ مٹے گی وہ مٹائے — غمِ لاعلاج سے تو نہ ہو سوگوار سو جا
نہ کر عیش تلخ اپنا کہ ہے نیند نعمِ عظمیٰ — تو مزے سے خواب نوشیں کی[1] لئے بہار سو جا
ترے رنج کا مداوا کسی گنج سے نہ ہو گا — نہ ہو ایسی راحتوں کا تو امیدوار سو جا
ترا نخل جانفشانی نہیں ہو گا بارور یاں — نہ ہو خار خار سو جا۔ نہ ہو تار مار[2] سو جا

[1] یعنی لیتا ہوا۔ [2] تہ و بالا ۱۲

ترے ولولے عبث ہیں۔ ترا اشتیاق باطل — نہیں تجھ کو عزمِ دل پر کوئی اختیار۔ سو جا
تجھے کیا پڑی ہے غم سے تو فقط نبیڑ اپنی — نہ حرام زندگی کر۔ نہ ہو سوگوار سو جا
نہ سمندِ فکر دوڑا۔ شامت سوار سو جا
نہ دے مفت جان اپنی۔ دلِ بیقرار سو جا"

دل

کسی برق وش کی الفت میں ہے نہ تڑپتا — نارِ محبتِ جفا جو ہرگز نہیں میں جیتا
محمل نشین لیلیٰ کا میں نہیں ہوں مجنوں — فرہادیوں میں جا کر اصلاً نہیں میں کھپتا
روتا نہیں میں عشقِ آہو نظر کے غم میں — دو روز کی شباہت کو میں نہیں کلپتا
اس باغ میں ہے اپنی طرفہ شگوفہ کاری — اے کاش نخلِ ارماں اپنا کبھی پنپتا
تم خوب جانتے ہو۔ تم خوب مانتے ہو — جن من چلوں میں میرا بھی تذکرہ ہے چھپتا
جس شوق کا بھرا ہوں جس کام پر مرا ہوں — اس کے لئے مثالِ بسمل ہوں میں تڑپتا
کوئی اور آگ میرے سینے میں تم نہ دیکھی — کسی شعلہ رو کی خاطر دیکھا ہے مجھ کو تپتا
مجھے کب سے کہہ رہے ہو تم بار بار سو جا
مگر اب کبھی نہ کہنا۔ دلِ بیقرار سو جا

مفلس

مجھے علم ہے بخوبی کہ تو قوم پر فدا ہے — مجھے ہے خبر کہ تو بھی ہمدردِ ملک کا ہے
لیکن تو کامراں ہو۔ تیری بساط کیا ہے — تو تنگدست عاجز۔ تجھے کون پوچھتا ہے؟
نہ کچھ اقتدار تجھ کو۔ نہ کچھ افتخار تجھ کو — تیری مقدرت ہی کیا ہے؟ تیری ہستی کیا دھرا ہے
نقار خانہ دنیا تو اس میں مثلِ طوطی — تیری شکر بیانی یاں کون سن رہا ہے؟
جو ہوں امیر عالی۔ جو فکر سے ہوں خالی — ان کے لئے یہ کوشش معقول ہے بجا ہے
تجھ میں نہ کچھ معیشت۔ تجھ میں نہ کوئی طاقت — کس بل ہمارے پہلو میں تو اچھل رہا ہے

ہوں پاس چار پیسے - ہوں پاسدار[1] پیسے تو قوم و ملک کا بھی دکھ دیکھنا روا ہے

باز آ گمانِ بیجا سے - اے نزار سوجا

مری جان - مان میری - "دلِ بیقرار سو جا"

دل

محشر مچا ہوؤں گا میں - مُردے جگا دوں گا میں
دیکر دہائی سب کے دل کو ہلا دوں گا میں

مفلس ہوں میں تو کیا ہے مفلس کا بھی خدا ہے
داغ جگر کو اپنے درہم بنا دوں گا میں

میرا غمِ نہانی پتھر کرے گا پانی
تڑپوں گا - لوٹ جاؤں گا - خوں بہا دوں گا میں

ناحق خوشی غمی میں دولت لٹاتے ہیں جو
اُن کو جلالِ حق کی قسمیں دلا دوں گا میں

تو نے بھلائی میں کچھ - زر خرچنے کی خاطر
رو رو کے سنگدل کو موم بنا دوں گا میں

دنیا کی بہتری میں ہے دین کی بھلائی
از روئے وید قرآں ثابت کرا دوں گا میں

نالوں سے اپنے ہر جا - آہوں سے اپنی ہر دم
قومی فلاحیت کے ڈنکے بجا دوں گا میں

یہ کلام ہے تمہارا نہ مجھے ناگوار سو جا
مجھے اب کبھی نہ کہنا "دلِ بیقرار سو جا"

مفلس

تجھے کیا خبر نہیں ہے مطلب کا سب جہاں ہے
ہندوستاں میں قومی ہمدردی اب کہاں ہے؟

اس بحر موجزن میں کر آبرو نہ پانی
اس آب کے لئے تو یہ ہی سا کیوں طپاں ہے؟

دانت ہیں دکھانے کے - کھانے کے نہیں ہیں
یہ ہے وہ نجم تاباں جو عرش آشیاں ہے!

نامی کمیٹیوں میں ہے نام کی نمائش
تقریر میں عمل کی صورت کہاں عیاں ہے!

اسپیچ اور لکچر باتیں ہی باتیں ہیں سب
دل ہیں تو کچھ نہیں ہے - لیکن زباں پاں کو -

گل پھول کی شگفتہ امید - کون سی ہو
اُجڑا ہوا چمن ہے - بدرنگ باغباں ہے

اے دل نہ ان خیالوں میں تو خراب ہونا
اس راہ کس مپرسی میں سعی رائگاں ہے -

[1] پاسدار یعنی مددگار حامی - مکہ مرا -

نہ ہو فکرِ غیر ممکن میں خستہ خوار۔ سو جا

سُن۔ مان میرا کہنا۔ "دلِ بیقرار سو جا!"

دِل

نہ اگر کوئی سُنیگا۔ تو مرا خدا سُنیگا — وُہی مالکِ دو عالم۔ وُہی کبریا سُنیگا

وہ مقلب القلوب اب بدلیگا سب کے دل کو — وُہی قوم ناتواں کی آہ و بکا سُنیگا

سرِ آغا خاں سا ملکی ہمدرد ہوگا کوئی — کوئی مالوی[1] یہ بنکر وہی صدا سُنیگا

رہیں ہندو و مُسلماں بہم اتفاق کرکے — کوئی خیر خواہ بندہ یہ مری دُعا سُنیگا

مجھکو پسند آئی ہے قلتِ[2] للنامی — سونے کو جو کہیگا مجھکو۔ بُرا سُنیگا!

بیدار دل۔ جگاتا ہے نام اس جہاں میں — فریاد واجب اس کی مشکلکشا سُنیگا

سویا جو ہوکے غافل۔ کھویا اُسی نے سب کچھ — ذی ہوش یہ مقولہ۔ کہکر بجا سُنیگا

تجھے نیند آئی ہے تو۔ تو ہی جا کے یار سو جا

مجھے اب سے تو نہ کہنا۔ "دلِ بیقرار سو جا!"

طالب بنارسی (از بمبئی)

تعلیم

گورنمنٹ ہائی سکول لائل پور کے جلسہ تقسیم انعام کیلئے جناب مولوی عبد المجید صاحب وکیل نے مندرجہ ذیل اشعار تعلیم کے فوائد کے متعلق لکھے تھے جو جلسے میں پڑھے جانے پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے:۔

تعلیم کی طرف ہمیں لازم ہے التفات — تعلیم کی طفیل ہے۔ تہذیب کو ثبات

تاریکی جہاں ہوئی۔ تعلیم ہی سے دُور — عالم میں سارے پھیلا ہے تعلیم ہی کا نور

[1] آنریبل پنڈت مدن موہن مالویہ۔ [2] کم خوابی۔

تعلیم نے جہان میں پھیلائی روشنی
ظلمات میں بھی علم نے دکھلائی روشنی

یورپ میں۔ اس نے ایسے کرشمے دکھائے ہیں
اہلِ جہان دیکھ کے حیرت میں آئے ہیں

تعلیم سے ہی روز۔ وہ ایجاد ہوتے ہیں
انسان دیکھ دیکھ جنہیں شاد ہوتے ہیں

تعلیم کا ہی باغ ہے۔ ایسا پُر از بہار
جس میں گلوں کے ساتھ نہیں نام کو بھی خار

آتی نہیں ہے۔ اس میں کبھی بھول کر۔ خزاں
ہے خود بہار اس چمنستاں کی پاسباں

بُو۔ باس۔ اسکے پھولوں کی ایسی ہے خوشگوار
جس سے مشامِ جاں کو ملیں فرحت و قرار

خوش رنگ ایسے گل ہیں کہ دلکو لبھاتے ہیں
گلزارِ خلد کی۔ وہ بہاریں دکھاتے ہیں

تعلیم سے ہی آدمی بنتا ہے آدمی
انسانیت کے واسطے ہے۔ علم لازمی

ہیں جس قدر یہ انگلشی حکام ذی وقار
تعلیم کے ہیں دل سے مددگار و خواستگار

سب چاہتے ہیں دل سے رعایا کی بہتری
ہر وقت ہیں خیال ہے مدِ نظر یہی

برطانیہ کی سلطنت۔ ایسی عجیب ہے
جو اس کے زیر حکم ہو بس خوش نصیب ہے

دہلی میں جبکہ لائے تھے تشریف شہریار
خلدِ بریں کی آتی نظر تھی وہاں بہار

دربارِ شاندار میں اعلان جو ہوا
تعلیم کو۔ عطیہ عظمیٰ وہاں ملا

تعلیم سے ہی اُنس۔ شہِ بحر و بر کو بھی
جنکو جہاں کے شاہوں پہ دی حق نے برتری

یہ سلطنت ہمارے سروں پر رہے مدام
یہ سلطنت ہے رحمتِ خلاقِ صبح و شام

عبد المجید

فوّارہ

اے فوارے عجب دلچسپ ہے تیرا سماں
یہ تری طبع رواں اور یہ ترا جوشِ نہاں

[illegible]دن سانچے میں وہ موتی یہ موتی ڈھالنا
مہوشانِ باغِ رضواں پر وہ ڈوری ڈالنا

گوہر افشانی تری اور ہلکی ہلکی وُہ پھوہار — وُہ شبابِ اہلِ گلشن اور وُہ تیرا نکھار
وُہ اکڑ اکڑ کر دیکھنا اپنی جوانی کی بہار — وُہ ترا انگڑائیاں لینا چمن میں بار بار
مضطرب موجِ ہوا پر تو بہت بیتاب ہے — تیری دھاریں جھومتی ہیں یا کہ نخلِ آب ہے
تو چمن کی رُوح ہے اور یہ فضا میں تیرا دَور — اک بہارِ شادمانی ہی ہوا میں تیرا دَور
طائر آتے ہیں ترے دامن میں پر کھولے ہوئے — عاشقِ شوریدہ سر بیٹھے ہیں سر کھولے ہوئے
تیرے دستِ گوہر افشاں کی یہ حالت دیکھکر — جھولیاں گلشن نے پھیلا دیں سخاوت دیکھکر
گوندھتا موجِ ہوا پر موتیوں کے ہار کا — تیرے سر سہرا رہا ہے رونقِ گلزار کا
بنکے آنسو دیدۂ بلبل میں تو پنہاں ہوا — عارضِ گل تیرے قطروں سے عرق افشاں ہوا
مندمل کر دے تجھے ایسا کوئی مرہم نہیں — تیرا جو سوراخ ہے ناسُورِ دل سے کم نہیں
تیز ہو ہاں میرے فوّارے ذرا پھر تیز ہو — پھر جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز ہو
آتشِ گل کا جہاں کچھ بھی اشارا ہو گیا — اُڑ گیا موجِ ہوا پر یُوں کہ پارا ہو گیا
عاشقی کا خاص اثر جب ایک حد تک بھر دیا — نالۂ بلبل نے تیرے دل کو چھلنی کر دیا
تیرا جو قطرہ گیا گردوں پہ تارا ہو گیا — جب گرا آ کر زمیں پر دل ہمارا ہو گیا

سب غبارِ خاطرِ ناشاد تجھ سے دھو گیا
تیرا منظر اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا

[illegible]

سپاہی کا خواب

دوشِ افق پہ گرنے لگے پردہ ہائے شام — دینے لگی صدائے بگل امن کا پیام
پہرے پہ مستعد جو کواکب ہوئے تمام — فرشِ زمیں پہ لشکریوں نے کیا قیام

جو تھک گئے تھے مائلِ خوابِ گراں ہوئے
گھائل جو تھے وہ ملکِ عدم کو رواں ہوئے

میں بھی گیاہِ خشک کے بستر پہ سو گیا — روشن وہیں الاؤ پئے دفعِ گرگ تھا
دی تھی وہ آگ ہم نے سرِ شام ہی جلا — لاشیں نہ کھوئی جائیں یہ تھا اس سے مدعا

آدھی بجی تو خواب وہ دیکھا کہ واہ رے!
تا صبح تین بار وہ آیا نظر مجھے۔

دیکھا کہ دور ہوں میں صفِ کارزار سے — صحرا کو کاٹتا ہوں کسی رہگزار سے
ظاہر اثر خزاں کا ہے ہر شاخسار سے — سورج عیاں ہوا ہے ابھی کوہسار سے

اور میں رواں ہوں جانبِ کاشانۂ پدر
لیتا ہے وہ بلائیں مری رہ میں آن کر

جب کھیت وہ سہانے نظر پڑے — جو سیرگاہ تھے مری فصلِ شباب کے
بے اختیار دوڑ پڑا فرطِ شوق سے — نقشے پرانے سب مری نظروں میں پھر گئے

آواز بکریوں کی وہی تھی چٹان پر
جاری وہی تھے گیت کسانوں کی زبان پر

پہنچا میں اپنے گھر جو بعد شوق بیقرار — رل مل کے مجھ سے روتے تھے احباب زار زار
وعدہ کیا کہ اب میں نہ جاؤنگا زینہار — سب نے بطورِ عہد پیا جامِ خوشگوار

بچوں نے چوم چوم کے جتلائیں الفتیں
بیوی نے آہ کھینچ کے کیں لاکھ منتیں

للہ اب نہ جاؤ یہاں سے یہیں رہو — کافی سہے ہیں رنج۔ بلائیں اب نہ سہو
جھیلیں ہیں سختیاں بہت آرام بھی تو لو — میں خستہ جاں بھی سن کے یہ بولا کہ جو کہو

لیکن نمودِ صبح نے مجھ پر ستم کیا
بیوی تھی وہ۔ نہ بچے۔ نہ وہ یار و آشنا

(باقی)

گورِ غریباں

(مقبرۂ نورالدین جہانگیر شاہ و ملکہ نورجہاں بیگم واقعہ شاہدرہ۔ لاہور)

ہمارے نادیدہ کرمفرما جناب وزیرزادہ عبدالاحد صاحب نے مخزن کے لئے اپنی ایک تازہ نظم عنایت کی ہے۔ اسی مضمون پر پہلے بھی کئی صاحبوں کی نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر وزیر صاحب کی جولانی طبع خاص طور پر قابلِ داد ہے:۔

بندِ اول

ایک شب میں محوِ سیرِ عالمِ اسرار تھا — ساری دنیا سو رہی تھی اور میں بیدار تھا

بے ثباتی بن رہی تھی اس گھڑی شکلِ محیط — قلبِ مضطر بیچ میں جوں نقطۂ پرکار تھا

ہستیٔ موہوم بھی اک بن گئی اس دم خلش — انقلابِ دہر بھی دل میں کھٹکتا خار تھا

اس طلسماتی سماں میں ایسی چپ مجھ کو لگی — عالمِ حیرت میں بس اک صورتِ دیوار تھا

عالمِ بالا سے اس دم کان میں پہنچی صدا — "کچھ نہیں جو کچھ کہ ہے جو کچھ کہ تھا بیکار تھا"

"جن سروں میں تھے خیالاتِ من و مائی بھرے — بعد مردن پھر انہیں میں مور تھا یا مار تھا"

"جو نزاکت سے اٹھا سکتے نہ تھے پھولوں کا بوجھ — پھر وہی تھے ان پہ سو من خاک کا انبار تھا"

"موت کی جب دم چلی اس باغِ عالم میں ہوا — چہچہے بلبل کے باقی تھے نہ گل نہ خار تھا"

"کیا کہیں اس دارِ فانی میں کہ یوسف کون تھا — دو گھڑی کا میہماں تھا رونقِ بازار تھا"

"جبکہ پیغامِ اجل پہنچا سکندر چل بسا — فاتحِ عالم کو جینا ایک دم دشوار تھا"

"کس طرف کو آ گئے تھے کس طرف کو چل دیے — جم۔ فریدون و سلیماں قیصر و قاچار تھا"

"کون تھے یہ بھی مسافر تھے عدم آباد کے — موت تھی بانگِ جرس پیکِ اجل اہدار تھا"

چلتے چلتے تھک گئے دم بھر کو گویا دم لیا — ہستیِ موہوم کیا تھی سایۂ دیوار تھا
وہ لبِ گویا یہاں تک کر کے بس چپ ہو گیا — رات گذری تھی بہت میں رہ سہی بیدار تھا
نیند نے غلبہ کیا آنکھوں پہ پردہ چھا گیا
اور سپنے میں خدا جانے کہاں میں آ گیا

بندِ دوم

دیکھتا ہوں شہر اک واں خلق سے معمور ہے — ہر جگہ اسبابِ شادی ہر بشر مسرور ہے
سب ہیں خوش افسردہ خاطر ایک بھی انساں نہیں — چار سو فرحت ہے فرحت رنج کوسوں دور ہے
اک طرف ہے اک مکانِ سربلند و دلفریب — ہے یہ قصرِ کسروی یا مسکنِ فغفور ہے
"قصرِ نورالدین جہانگیر شہنشاہِ جہاں" — آبِ زر سے اس درِ دولت پہ یہ مسطور ہے
جب ہوا داخل میں اس دربارِ عالیشان میں — دیکھتا کیا ہوں کہ اس میں چار سو اک نور ہے
ہے ہر اک قندیلِ بلوریں جوابِ آفتاب — اور ہر شمعِ فروزاں رشکِ شمعِ طور ہے
زیب دہ ہیں فرش پر قالینِ سنجاب و سمور — سیم و زر لعل و جواہر سے مکاں معمور ہے
جلوہ فرما ہے ہوئے اس تختِ جوہر دار پر — جامِ مے پی کر جہانگیرِ زمن مخمور ہے
ایک جانب با ادب صف بستہ ہیں سارے امیر — اک طرف سر کو جھکائے آصفِ[1] دستور ہے
چل رہا ہے بے تکلف بادۂ احمر کا دور — مست ہے مسرور ہے ہر اک نشے میں چور ہے
شوکتِ شاہنشہی وہ رونقِ بزمِ نشاط! — دم بخود قیصر ادھر حیراں ادھر فغفور ہے
تخت کے پیچھے پڑا ہے پردۂ ابریشمی[2] — اور اس پردے میں اک ماہِ مبیں مستور ہے
ہاں یہی ہے ملکۂ والا نسب و مسارِ شاہ — نام جسکا خلق میں نورِ جہاں مشہور ہے

[1] آصف جاہ بادشاہ کا وزیرِ خاص تھا نورجہاں کا بھائی تھا۔ اسکا مقبرہ شاہدرہ میں جہانگیر کے مقبرے کے نزدیک مغربی طرف بوسیدہ حالت میں ہے۔

[2] مورخین کا بیان ہے کہ بادشاہ بیگم پر اس قدر فریفتہ تھا کہ دربار کرتے وقت بھی تخت کے پیچھے پردہ لٹکوا کر نورجہاں کو اپنے پاس بٹھاتا تھا۔

شاہ مثل کالبد ہے جس کی جاں نورجہاں ۔۔۔ فرقت جاں جسم کو کب ایک دم منظور ہے
صبح صادق ہوگئی مرغِ سحر چلّا اُٹھا
آنکھ میری کھل گئی سارا سماں جاتا رہا

بند سوم

سر میں چکّر اور آنکھوں میں وہی تصویر تھی ۔۔۔ بیقراری بیکلی یہ خواب کی تعبیر تھی
اُٹھ کے بستر سے مزارِ شاہ[۱] کا رستہ لیا ۔۔۔ دل کے بہلانے کی گویا ایک تدبیر تھی
برلبِ دریا تھا وہ میں اُسمیں جا داخل ہوا ۔۔۔ مقبرہ کیا تھا سراسر یاس کی تصویر تھی
بیکسی تھی ہمنشیں رنج والم تھے پاسباں ۔۔۔ قبر تھی مٹی کی یا عبرت کی اک تفسیر تھی
دل دھڑکتا تھا پھسل جاتا تھا میں ہر گام پر ۔۔۔ ہیبتِ شاہی کی اب تک اسقدر تاثیر تھی
درد تھا دل میں بھرا آنکھوں سے آنسو تھے رواں ۔۔۔ اور ہونٹوں پر مرے پُرسوز یہ تقریر تھی
"بندگی آداب ۔ کورنش ۔ عرض ہے اے حضور ۔۔۔ آمد و آنے کی یاں مدّت سے دامنگیر تھی"
"پاؤں اب پھیلا کے دانا خاک پر سوتا ہے کیوں ۔۔۔ ہند سے لے تا دکن چلتی تری شمشیر تھی"
"کانپتے تھے ڈر کے مارے بادشاہانِ جہاں ۔۔۔ خاک میں اب مل گئی جتنی تری توقیر تھی!"
"کیا ہوئی وہ شان و شوکت کرّوفر حسن و جمال ۔۔۔ کیا ہوئی صورت تری جو نقش پر تسخیر تھی!"
"ہم نہ بھولینگے قیامت تک ترے انصاف کو ۔۔۔ یاد ہے جو در پہ تیرے سونے کی اک زنجیر[۲] تھی"
"حق نے بخشی تھی تجھے وہ عقل وہ طبع رسا ۔۔۔ جو تری تدبیر تھی تقدیر کی تحریر تھی"
"پاس ہی سوتا ہے آصف گو کہ خستہ ہے مزار ۔۔۔ تیرے ہی قدموں میں اُس کی عزت و توقیر تھی"
ہم نے یہ مانا کہ آصف جاہ تیرے پاس ہے ۔۔۔ پر کہاں ہے وہ بیچاری آنکی جو ہمشیر تھی"

[۱] مزارِ شاہ یعنی مقبرہ جہانگیر شاہ ۔

[۲] مورخین کا قول ہے کہ جہانگیر نے اپنے دروازے پر سونے کی زنجیر لٹکا رکھی تھی ۔ کہ مظلوم آکر ہلاتے تھے اور بادشاہ محل سے نکل کر انصاف فرماتے تھے واللہ اعلم

قبر میں اِس دم کوئی اِک آہ کرکے رو دیا
اور بیتابی سے پہلو کو بدل کر سو گیا

بندِ چہارم

فاتحہ پڑھکر اُٹھا واں سے میں حیران حزیں — قبرِ آصف کی آیا تھی وہ اِک جانب وہیں
دونوں ہاتھوں کو اُٹھایا فاتحہ کیواسطے — واں سے بھی نکلا میں آخر بھر کے آہِ آتشیں
دُور سے چھوٹی سی اِک بارہ دری آئی نظر — حسرتیں آنکھوں میں جس کے دیکھنے سے چھا گئیں
دُور تک چاروں طرف کانٹے اُگے ہیں اس قدر — واں تلک جانے کو بھی تو راستہ ملتا نہیں
فرش پر ہے خاک چھت میں آشیانے جا بجا — بوم یا زاغ و زغن ہیں اس مکاں کے اب مکیں
یا الٰہی یہ مکاں ہے یا کہ اِک وحشت کا گھر — کہنگی سے جسکی دیواریں بھی ہیں جُھک سی گئیں
جب ہوا داخل میں اُس وحشت کدہ کے درمیاں — وسط میں مٹی کی دو قبریں نظر آئیں وہیں
ایک پر اُن میں لکھا تھا "ملکۂ نورِ جہاں" — تب میں سمجھا ہے یہیں مدفون وہ ماہِ مبیں
فاتحہ پڑھکر وہاں پھولوں کا اِک سہرا رکھا — اور پھر باچشمِ تر گویا ہوا میں دلحزیں
"سونیوالی قبر کی اے ملکۂ ہندوستاں! — حُسن کی دیبی تھی تو دنیا میں اے نازآفریں!"
تھا کبھی رائج ترا ہی سکہ سارے ہند میں — ذکر تھا ہر لب پہ تیرا حکم تیرا دلنشیں
ہمنشیں ہے کون اب اس جائے وحشت ناک میں؟ — کس طرح کٹتی ہیں راتیں اب تری زیرِ زمیں؟
دیکھتی ہے اب بھی گلشن میں تو پھولوں کی بہار؟ — اب بھی بلبل کے ترانے سنتی ہے اے نازنیں؟"
گور سے پُر درد اِک دھیمی سی یہ آئی صدا — "بشنو از ما اے وزیرِ خستہ جاں اندوہگیں"

"بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے"
"نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے"

وزیرزادہ محمد عبدالاحد خان وزیر
ڈیرہ اسمٰعیلخاں

پی

پپیہا او پپیہا! تو یہ کیوں آنسو بہاتا ہے زباں پر تیری پی پی کس لئے رہ رہ کر آتا ہے
صدائے درد و غم کیوں دردمندوں کو سناتا ہے جو خود ہی جل رہا ہو اور کیوں اسکو جلاتا ہے

کاٹوں توری چونچ پپیہا ڈاروں واپر نون
میں پیو کی اور پیو مورا۔ تو پی کہے سو کون؟

شمیم زلف عنبر بیز پھیلاتا ہے کیوں ظالم! تجھے افشائے راز دوستاں بھاتا ہے کیوں ظالم؟
مرے آگے ترانۂ عشق کا گاتا ہے کیوں ظالم! کسی کا نام لیکر یہ چلاتا ہے کیوں ظالم؟

کاٹوں توری چونچ پپیہا ڈاروں واپر نون
میں پیو کی اور پیو مورا تو پی کہے سو کون؟

غم آرام جاں میں او بے آرام کرتا ہے رموز خاص عشق و عاشقی کیوں عام کرتا ہے
سر بازار نام یار کیوں بدنام کرتا ہے کسی کا راز کیوں کمبخت طشت از بام کرتا ہے

کاٹوں توری چونچ پپیہا ڈاروں واپر نون
میں پیو کی اور پیو مورا تو پی کہے سو کون؟

سوا آہ غم افزا دوسرا کوئی نہ کام آیا خدا کو مان ظالم! اب تو چپ ہو وقت شام آیا
تری آواز کیا آئی اجل کا اک پیام آیا خبردار اب اگر تیری زباں پہ پی کا نام آیا

کاٹوں توری چونچ پپیہا ڈاروں واپر نون
میں پیو کی او پیو مورا تو پی کہے سو کون؟

اندھیری رات میں تو نے مجھ چونکا دیا چلا کر برنگ بوئے گل ناداں! جامے سے نہ ہو باہر
اری ننھی سی چڑیا جان ننھی سی زباں گز بھر چڑھا دیگا کوئی منصور کے مانند سولی پر

کاٹوں توری چونچ پپیہا ڈاروں واپرلون
میں پیو کی اور پیو مورا تو پی کہے سو کون؟

ابو اعظم سید احمد حسین امجد دار العلوم حیدر آباد دکن

تازہ غزلیں

(از جناب منشی حیات بخش صاحب رسا کیل و شاعر دربار رام پور)

بے نقاب آئے اگر وہ تو یہ صورت ہوگی
بزم کی بزم اک آئینۂ حیرت ہوگی

پاس آکر جو شریک غم فرقت ہوگی
اک مصیبت میں گرفتار مصیبت ہوگی

آج پھر ابر ہے میخوار چلے آتے ہیں
گرم پھر محفل یاران طریقت ہوگی

جب کہا میں نے کہ میں جی سے گذر جاؤنگا
مسکرا کر یہ کہا اسنے عنایت ہوگی

یہی رفتار اگر ہے تو ہزاروں فتنے
تم سلامت ہو تو سو بار قیامت ہوگی

ایک عالم ہے محبت یہ تمہارے نازاں
اسکی تقدیر تمہیں جس سے محبت ہوگی

دل کہیں رہتا ہی خالی ترے ارمانوں سے
ایک نکلیگی اگر دوسری حسرت ہوگی

بخشدینگے وہ اگر جرم محبت میرا
اُنکی محفل ہی مرے واسطے جنت ہوگی

آئیے جو مجھے کہنا ہو وہ خلوت میں کہوں
چار میں آپ سنیں گے تو ندامت ہوگی

زندگی ہے تو یہ ہوگا دل ویراں آباد
لاکھ ارمان اگر جان سلامت ہوگی

کیا توقع ہے کہ روز جزا مجھ کو جزا
ساتھ میرے مری پھوٹی ہوئی قسمت ہوگی

اُٹھی فریاد نہ کرنا سر محشر اے دل
انگلیاں اٹھینگی بدنام محبت ہوگی

اے رسا دیکھیے کب تک مرے دن پھرتے ہیں
دُور کس روز بلائے شب فرقت ہوگی

(از جناب کے۔ ایس جہانگیر امرتسری)

یہاں درسِ مہر و وفا ہو رہا ہے — وہاں ذکرِ جور و جفا ہو رہا ہے
خدائی میں تیری بتوں کی پرستش! — الٰہی زمانہ میں کیا ہو رہا ہے
نیاز اُن پہ تھا میرا اک قرض گویا — کہ جو ناز سے اب ادا ہو رہا ہے
تگ و دو میں ہے جسکو دیکھو یہاں پر — یہ ہنگامہ کیا اے خدا ہو رہا ہے
مری جان جاتی ہے اک اک ادا پر — وہاں دلبری مشغلہ ہو رہا ہے
لیا تو نے ہی ساری دنیا کا ٹھیکہ — کہ جو ہے ترا مبتلا ہو رہا ہے
مرے حق میں ہے زہر انکا تلطف — بھلا کر رہے ہیں بُرا ہو رہا ہے
دمِ نزع تم بھی ذرا اسیر دیکھو — اسیرِ محبت رہا ہو رہا ہے
غضب تھا شبِ وصل اُن کا یہ کہنا — ہٹو بھی تمہیں ہائے کیا ہو رہا ہے
من و تو کہاں تھا نہ میں تھا نہ تو تھا — پھر اب کیوں یہ ما و شما ہو رہا ہے
رضا اور تسلیم کا پڑھ سبق تو — کہ جو ہو رہا ہے بجا ہو رہا ہے
جہانگیر کیوں تو نے کی مے سے توبہ — یہی ذکر اب جا بجا ہو رہا ہے

(از جناب مخمور)

سبزہ خط سے ترے طرفہ بہار آنکھوں میں ہے — پھر رہا گویا ہماری سبزہ زار آنکھوں میں ہے
جلوہ آرا جب سے وہ روئے نگار آنکھوں میں ہے — ہر گھڑی پھرتی بہارِ لالہ زار آنکھوں میں ہے
دیکھ چل اے بے مروت عاشقِ خستہ کا حال — لب پہ دم ہے اور تیرا انتظار آنکھوں میں ہے
کیا کہوں کیا شوخ ہے تیرا تصور مہ جبیں — چین ہے دل میں نہ کچھ اسکو قرار آنکھوں میں ہے
کیوں نہ سرگرداں رہے یہ عاشقِ مضطر ترا — جبکہ تیری گردشِ لیل و نہار آنکھوں میں ہے
جس نے دیکھی نرگسِ مخمور وہ بیخود ہوا — اِن بتوں کی سحر کیا پروردگار آنکھوں میں ہے
دیدۂ مدہوش ہمارا آج پھر مخمور ہے — چشمِ بد دور آج اے ساقی بہار آنکھوں میں ہے

مخزن
اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ
پشاور
لاہور
دہلی
آگرہ
لکھنؤ
الہ آباد
پٹنہ
کلکتہ
کراچی
بمبئی
حیدرآباد
مدراس
داغ کی گل افشانیاں
ایک گمنام شاعر
تازہ غزلیں

H. H. The Maharaja Sayajeerav Gaikawar of Baroda.

Chitrashala, Poona.

اخلاقی اور سوشل معاملات میں اکثر معاملات اکثر امور ایسے ہیں کہ جو سرسری
نظروں میں معمولی دکھائی دیتے ہیں اور ایک معاملہ کا دوسرے معاملہ سے چنداں
تعلق نہیں پایا جاتا اور بادی النظر میں کہا جاتا ہے کہ ایسے امور اور ایسے معاملات محض
شخصی ہیں دوسروں کو اُنسے کوئی واسطہ یا کوئی غرض نہیں یا یہ کہ بعض حالات میں
صرف مذاہب یا سیاسی حلقوں کا ہی اُن سے تعلق اور وابستگی ہوتی ہے اُنکی
ذات اور وجود کا فائدہ یا تو شخصیتوں کو ہے اور یا مذہبی اور سیاسی رنگ میں اُن
سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اسیطرح اُن کی عدم اور اُن کی نفی اور اُن کی وجہ سے جو
نقصان اور گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے وہ بھی یا تو کسی نہ کسی شخصیت سے وابستہ ہوتا ہے
اور یا اُسے مذہبی اور سیاسی رنگ میں تاویل کرنا پڑتا ہے

ہر شخص کی ذات اور ہر شخص کے معاملات مفید و مضر کا تعلق اکثر خاص کر
اُس کی ذات سے سمجھا جاتا ہے یا اُن چند شخصیتوں سے جو اُس ایک شخصیت سے
بوجہ بعض قریبی تعلقات کے وابستہ ہوتی ہیں ایسے سلسلوں سے بالاتر صرف ایک
معمولی تعلق اور معمولی وابستگی سمجھی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ شخصیتیں ایک دوسرے

سے اس قدر دور ہو جاتی ہیں کہ ان میں گویا قریبی تعلق تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو ہٹتا ہٹتا یا گھٹتا گھٹتا اس قدر دور فاصلہ پر چلا گیا ہے کہ اب اس کا خیال کرنا بھی مشکل ہے اگرچہ بادی النظر میں اس قسم کے خیالات ایسے نہیں معلوم ہوتے کہ ان میں کوئی کمزوری قیاس کیجا سکے لیکن واقعات کے پتہ پر غور کرنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انکی حقیقت میں بہت کچھ فرق آگیا ہے اور انکے صحیح مفہوم میں بہت کچھ غلطیاں پیدا ہو چکی ہیں۔

صحیح مفہوم یہ ہے کہ

ہر زندگی اور ہر ہستی موجود اور زندہ ہونے کی صورت میں کائنات اور موجودات کے ساتھ چند معاہدات رکھتی ہے ہر شخصیت گو ایک شخصیت بھی رکھتی ہے لیکن کئی ایک قسم کے معاہدات سے بھی وابستہ ہے ہر زندگی ایسے معاہدات کی صورت میں اقرار کر چکی ہے کہ اس کے افعال کا خاص حصہ انکے معاہدات کے خلاف نہیں جاسکتا۔

اور خلاف جانے کی صورت میں دوسرے فریق کا یہ حق ہے کہ اعتراض کرے اور نکتہ چینی کرکے ایسی غلطیوں کے صحیح کرانے کی کوشش عمل میں لائے ہماری زندگیاں اور ہمارے وجود یا ہماری ہستیاں کتنی قسم کی پابندیوں اور معاہدات کی جوابدہ ہیں اور کن کن امور کے ہم ذمہ وار ہیں۔

ایک بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہے مختصراً یہ ہے۔ کہ ہم اپنی زندگیوں کے ساتھ ذیل کی پابندیاں اور معاہدات رکھتے ہیں:۔

(الف) اخلاقی معاہدات

(ب) تعلیمی معاہدات

(ج) ضمیری معاہدات

(د) مذہبی معاہدات

(ہ) سیاسی معاہدات

(و) اخلاقی معاہدات

(ز) سوشل معاہدات۔

(ح) پبلک معاہدات

(ط) شخصی معاہدات

یہ نو معاہدات ایسے ہیں کہ ہر زندگی کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک وابستہ ہیں۔ کوئی زندگی اور کوئی وجود انکی پابندیوں سے باہر اور آزاد نہیں یا یوں کہو کہ ان معاہدات کی پابندی کے سواے انسان زندگی بسر ہی نہیں کرسکتا نہ اُسے کسی قسم کی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے کوئی سے انسان چن لو۔ اور کوئی سے فرد دیکھو ان معاہدات پر انکے دستخط نہ ہونگے اور عملی رنگ میں اُس کا اقرار نہ شامل ہوگا کہ وہ انکی تعمیل میں ہمیشہ منہمک رہے گا اور انکی حد اور دائرے سے باہر نہیں جانے گا۔ سوسائٹی اور تمدن کا ایک ایسا سلسلہ ہے کہ کوئی انسان باوجود دعوے آزادی و بے تعلقی کے بھی اس سے باہر نہیں جاسکتا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو آزادی کے مدعی ہونگے اور اپنے خیال میں اُن کا تعلق اور وابستگی ایسے معاہدات سے نہیں ہوگی لیکن اُن کا یہ دعوے نرا دعوے ہی ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

کوئی مچھلی بھی پانی میں رہ کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ پانی سے باہر رہتی ہے۔ اور پانی کی موجوں سے آزاد ہے اور پانی کی لہریں اُس پر سے گذر نہیں سکتی ہیں۔ جو مچھلی دریا اور سمندر میں رہتی ہے وہ پانی کی موجوں اور لہروں سے کبھی بھی باہر اور آزاد نہیں رہ سکتی اور باوجود اس کے اُس کا یہ کہنا حقیقت الامر کے صریح خلاف ہے۔

دنیا اور دنیاداری بھی ایک سمندر ہے اور انسان اُس کی مچھلیاں ہیں کوئی انسانی مچھلی اِس بحرِ زخار کی زد اور موجوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی اور نہ اُس کا گزران موجوں کی کشتی کے سوا ہو سکتا ہے۔

جو شخص یا جو شخصیت دنیا کے سمندر میں رہ کر یہ چاہتی ہے کہ وہ سمندر کی موجوں لہروں اور جوار بھاٹے سے آزاد رہے یا سمندر کے فوائد اور مضار کا اُس سے کوئی تعلق اور کوئی وابستگی نہیں وہ ایک ایسی غلطی میں گرفتار ہے جو تمدنی راہوں میں ایک سخت ٹھوکر ہے۔

ہر انسانی زندگی اور ہر انسان سوسائٹی اور متمدنہ افراد سے ایک معاہدہ رکھتا یا ایک معاہدہ کرتا ہے اور ہر سوسائٹی اور ہر مجموعہ متمدنہ افراد ہر انسان اور ہر انسانی شخصیت سے ایک اقرار کرتا اور چند شرائط کی پابندیاں اپنی ذات پر عاید کر کے خود کو ذمہ دار بناتا ہے۔

جیسے ایک انسان یا ایک انسانی شخصیت کا دعوے ایک سوسائٹی اور مجموعہ متمدنہ افراد کے مقابلہ میں چل سکتا اور قابل سماعت ہے اسیطرح ہر سوسائٹی اور ہر مجموعہ افراد متمدنہ کا دعوے ہر انسان اور ہر انسانی شخصیت کے مقابلہ میں قابل سماعت ہے سوسائٹی اور متمدنہ مجموعہ کیا ہے ان معاہدات کا مجموعہ یا اُن معاہدات کی تفسیر جو افراد انسانی کیطرف سے کئے یا کیے جاتے ہیں اور اُن ذمہ داریوں اور مطالبات کا گوشوارہ جو ہمیشہ وقت پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں قابل نفاذ تصور ہوتا ہے۔

جب تک ان ذمہ داریوں اور ان معاہدات پر سوسائٹی اور مجموعہ افراد متمدنہ کاربند رہتا ہے تب تک حالت اور کیفیت درست رہتی ہے۔ جب اس میں نقص اور نقض عہد عاید ہونے لگتا یا عاید ہوتا ہے تو کام بگڑتا اور مجموعی

زندگی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے۔

بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ

ایک سوسائٹی ایک مجموعہ افراد متمدنہ کیوں خواہ مخواہ شخصیتوں کے بعض افعال یا ترک افعال پر معترض اور حکم ہوتا ہے اور کیوں ایسے حقوق اور ایسی دست اندازی کا اقبال اور اعتراف کرانے کی کوشش کرتا ہے یہ غلطی اس واسطے سرزد ہوتی ہے اور یہ دھوکہ اس وجہ سے لگتا ہے کہ ہم اُن معاہدات اور اُن ذمہ واریوں کی شرائط اور پابندیوں سے خبر نہیں رکھتے جو ہماری جانب سے متفرد تاً ومجموعۃً مختلف رنگوں میں تسلیم کی گئی ہیں۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم صرف سیاست یا سیاسی قوانین ومذہبی احکام کے بھی پابند ہیں یا صرف اپنی حکومت اور اپنی پابندیاں ہی ہمیں ذمہ وار بناتی ہیں یہ ایک فریب وہ خیال ہے ہم سوسائٹی اور مجموعہ افراد متمدنہ کے بھی جواب دہ اور ملزم یا مجرم ہیں جس طرح اسکی سیاست یا سیاسی قانون ہم سے جواب طلب کرسکتا اور ہمیں ذمہ وار بنا سکتا ہے اسیطرح ایک سوسائٹی اور مجموعہ افراد متمدنہ بھی ذمہ وار بناتا ہے۔

ایک رہزن ایک چور صرف ایک حکومت اور ایک سیاست کا ہی جواب دہ نہیں ہے سوسائٹی اور مجلس متمدنہ کا بھی جواب دہ ہے ایک مفسد صرف ایک سیاسی قانون کا ہی جواب دہ نہیں ہے ایک سوسائٹی بھی اُس سے جواب لے سکتی ہے ایک چغل خور دہ۔ ایک غماز ایک کذاب اور ایک مفتری صرف چند اشخاص کا ہی جواب دہ نہیں ٹھیرایا جاسکتا تمام سوسائٹی بھی اُس سے جواب لینے کا حق رکھتی ہے اور وہ اس امر کا مستوجب ہے کہ اُس سے جواب لیا جائے۔

جو شخص سوسائٹی میں بھی زندگی بسر کرتا ہے اور کاہلی وسستی سے اپنی

زندگی اور کاروبار زندگی کا اوروں پر بار ڈالتا ہے وہ سوسائٹی اور مجموعہ متمدنہ پر بار ڈالتا اور انہیں چند ذمہ واریوں کا صعوبت کے ساتھ انہی غلطیوں کی وجہ سے ذمہ وار بناتا ہے جو شخص ایک حکومت کی خواہ مخواہ نافرمانی اور بدخواہی کرتا ہے وہ صرف حکومت ہی کی بدخواہی نہیں کرتا بلکہ ایک قوم اور ایک سوسائٹی کی بھی نافرمانی اور بدخواہی کرتا ہے اور اسکی ذلت اور رسوائی کا باعث بنتا ہے کیونکہ اسکی فریب وہ رفتار سے سوسائٹی اور قوم بدنام ہوتی ہے اور ملک میں ایک فساد اور شرارت نشوونما پاتی ہے۔

اسیطرح جو شخص واجبات سے پہلوتہی کرتا اور اپنے ذاتی مفاد کی غرض سے ان ذمہ واریوں میں فرق لاتا ہے جو اس پر عائد ہوچکی ہیں اور جن کا تعلق اس کی قوم اور سوسائٹی سے ہے اور جنکا ذمہ وار اور نگران قوم کی جانب سے وہ بن چکا ہے قوم کے سامنے ہر حالت میں جواب دہ ہے۔ قوم اور سوسائٹی کا یہ حق ہے کہ وہ ایسے معاملات میں دخل دے اور بازپرس کرے لیکن بردباری اور تحمل کے ساتھ۔

پچھلے دنوں ملتان چھاؤنی میں ایک گورے نے خودکشی کر لی۔ پادری صاحب نے اسکی تجہیز و تکفین سے انکار کیا اور آخیر تک اسپر قایم رہے ایک حاکم وقت نے حکم دیا کہ اس کا جنازہ کیا جائے پادری صاحب نے کمشنر صاحب بہادر کے حضور جاکر فریاد کی۔ کہ یہ حکم منسوخ کیا جائے۔

کسی دیسی نے پادری صاحب سے دریافت کیا کہ

اس میں آپ خواہ مخواہ کیوں ضد کرتے ہیں جنازہ ہونے دیجئے اور عیسائیوں کے قبرستان میں دفنائیے۔

پادری صاحب نے جواب میں کہا۔

خودکشی کرنے والے گورے کا وجود اپنا وجود نہیں تھا اور نہ اس کی زندگی اسکی اپنی زندگی تھی اس کی زندگی قوم اور سوسائٹی کی زندگی تھی اس نے خودکشی کرکے قوم کو کنبہ کو سوسائٹی کو جماعت متمدنہ کو نقصان پہنچایا ہے اسواسطے اس کا وجود

اس قابل نہیں رہا کہ اُس کی باضابطہ تجہیز و تکفین کیجائے اور اُس کو عیسایوں کی قوم کے قبرستان میں دفنایا جائے۔

پادری صاحب کا یہ استدلال نہایت اہم اور قیمتی استدلال ہے اور پادری صاحب اس استدلال کے واسطے مبارک باد کے قابل ہیں اور انکی جرأت دوسری قوموں کے پیشواؤں اور محترم لیڈران مذہبی کی تقلید کے قابل - بلاشک جو شخص کسی قوم میں سے خودکشی کرتا ہے وہ صرف اپنے کنبہ اور اپنے خاندان کو ہی نہیں بلکہ ساری قوم اور ساری سوسائٹی کو نقصان اور گزند پہنچاتا ہے اور وہ صرف مذہب اور سیاست کا ہی مجرم نہیں ہے بلکہ قوم اور سوسائٹی کا بھی جواب دہ ہے۔

وہ پانچ جرم کرتا ہے۔

(الف) ایک خدا کا

(ب) دوسرے سوسائٹی کا۔

(ج) تیسرے قوم کا۔

(د) چوتھے خاندان اور کنبہ کا۔

(ہ) پانچویں حکومت کا۔

کیا جو شخص پانچ جرم کرے وہ اس قابل ہے کہ اُسکے ساتھ ہمدردی کی جائے۔

خدا نے جان دی ہے اسواسطے ہمارا یہ حق نہیں ہے کہ ہم اُس کی دی ہوئی جان کو خود برباد کریں یہ اُسکا حق ہے کہ وہ اپنی چیز خود واپس لے اور اپنے قاعدہ سے واپس لے خود اپنی جان گنوا دینا اس معاہدے کے خلاف ہے جس قوم اور جس سوسائٹی کا وہ ممبر ہے وہ اُس کی زندگی کی محتاج ہے یا وہ اپنی زندگی میں اُس کا مقروض ہے خودکشی سے ایسا شخص اس ذمہ واری کو کھو دیتا ہے - فرض کرو کہ ایسی سوسائٹی کا ایک حق قومی دو نوعوں سے مل سکتا ہے اب اگر اُس کے ممبران خودکشیاں کرتے

جائیں تو ووٹ کسطرح پورے ہوں۔

جس خاندان اور جس کنبہ کی پرورش اور نگرانی کا بوجھ اُسکے ذمہ پر ہے وہ اس فعل قبیح سے اُس میں ابتری ڈالتا ہے جو شخص بال بچے چھوڑ کر خودکشی کرتا ہے وہ اُن کی پرورش کا بوجھ دوسروں پر ڈال کر اُنکے حقوق میں دست انداز ہوتا ہے اور جو نگرانی اُسکے ذمہ ہمت پر لگائی گئی تھی اُسکو وہ پوری نہیں کرتا اور بے ہمتی سے ترک کر دیتا ہے یہ ایک بڑا بھاری گناہ اور ارتکاب ہے اور اُس کے جواب میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا اور یہ اُس کی سزا ہے کہ قوم اور خاندان اُس کے وجود کی کوئی قدر و منزلت نکرے جسطرح اُسنے اپنے بقبوح فعل سے قوم سوسائٹی اور کنبہ کو لاوارث چھوڑا ہے اسی طرح وہ بھی اخیر پر لاوارث چھوڑ دیا جائے۔

حکومت کا بھی ایسے فعل سے واقعی نقصان ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ ایسے اشخاص کی ایسی جرائیں بند کرے فرض کرو کہ

زید خودکشی کرتا ہے۔

وہ حکومت کا ٹیکس گزار ہے۔

اُس کی آمدنی سے بھی ٹیکس پورا ہوتا ہے۔

وہ فوج میں سنتری یا سوار ہے۔

وہ ایک اچھا اہلکار یا افسر ہے۔

وہ اپنا ایک کنبہ چھوڑتا ہے جس کی پرورش حکومت پر عاید ہوتی ہے۔

وہ گورنمنٹ کی مردم شماری میں آچکا ہے۔

کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ گورنمنٹ اور سیاست ان حقوق کے جانے پر برافروختہ نہیں ہو سکتی اور کیا باوجود ان امور کے سرزد ہونے کے حکومت اور سیاست ایسے لوگوں کی ایسی بزدلانہ جرات کے انسداد پر کوئی توجہ نکریگی۔ اور اُس کا یہ حکومتی فرض نہ ہوگا۔

اس قسم کی وارداتیں دنیا میں کیوں سرزد ہوتی ہیں اسواسطے کہ لوگ زندگی کے معاہدات سے ناواقف رہتے ہیں اور اُن کے ایفا پر توجہ نہیں کرتے۔

دختر کشی کی وارداتیں بھی اس قبیل سے ہیں جو شخص لڑکیاں مارتا ہے وہ گویا وہی جرم کرتا ہے جو ایک خودکشی کرنے والے پر لگائے جاتے ہیں اور وہ اُن معاہدات سے بے خبر ہے جو وہ فطرتاً کرچکا ہے اور جن کا ایفا اُس پر ہر حالت میں واجب اور لازم ہے۔

جتنی قسم کے معاہدات زندگی ہیں وہ سب اپنے اپنے وقت پر قابل ایفا اور قابل تکمیل ہیں اور اُن کا ایفا اور اُنکی تکمیل ہر حالت میں ایک اخلاقی کوڈ کی تعمیل ہے مذاہب۔سیاست۔سوسائٹی۔تمدن۔قومیت بالاتفاق اُنکے ایفا اور اُنکی تکمیل پر زور دیتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اُنکے ایفا سے انسان انحراف کرے بجز اس کے کہ وہ بوجوہ مجبور اور معذور ہو

اے خدائے کریم!

"ہمیں زندگی کے معاہدات کے امتحان میں ناکامیاب نہ کر۔

"ہمیں اُنکے پورا کرنے کی توفیق بخش۔

"ہم اس امتحان میں شرمندہ نہ ہوں"

آمین

سلطان احمد بہلول پریسیڈنٹ

حکیم سقراط

ذیل کا دلچسپ علمی مضمون ہمارے کرمفرما منشی محمد خلیل الرحمن صاحب مترجم تاریخ اخلاق یورپ و مؤلف ورزش جسمانی وغیرہ نے تاریخ الفلاسفہ مصنفہ سید عبداللہ آفندی المصری سے ترجمہ کر کے عنایت فرمایا ہے۔ جو شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ امید کہ یہ ناظرین مخزن کے ذخیرہ علم کے ازدیاد کا باعث ہوگا۔

یہ حکیم ۷۷ اولمپیاد کے چوتھے سال میں پیدا ہوا۔ ستر سال کی عمر پائی۔ اور ۹۵ اولمپیاد کے پہلے سال میں مر گیا۔

محققین قدیم نے اس کو زمانہ جاہلیت کے بہت بڑے حکیموں میں شمار کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ حکیم نہایت صاحب فضیلت تھا اور خصائل حمیدہ رکھتا تھا۔

ایتھنیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں الوپیس کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد کا نام سوفرونزین تھا جس کا پیشہ پتھروں پر بیل بوٹے بنانے کا تھا۔ والدہ کا نام فرامیت تھا۔ جو طبیبہ تھی۔ اور مطب کیا کرتی تھی۔

علم فلسفہ پہلے حکیم انکسفوراس سے۔ اور علوم طبعی ارخیلوس سے حاصل کیا۔ لیکن جب دیکھا کہ اشیاء طبعی پر غور و فکر کرنے سے کوئی نفع نہیں ہے اور فلسفی میں خصائل حمیدہ پیدا نہیں ہو سکتے تو علوم آداب و اخلاق کی طرف ایسا مائل ہوا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ حکمت علم آداب کا تمام یونان میں یہی استاد اول ہے۔

چنانچہ قیقروں جیسے مصنف نے لکھا ہے کہ جہاں تک میں نے اس حکیم کے اقوال پر غور کیا ہے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم سقراط نے ہی سب سے پہلے فلسفہ ا

کے منہ پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی دوسرے شخص نے بھی اسطرف توجہ کی ہو۔ لیکن مقصود اصلی تک یہی حکیم پہونچا ہے - اور انسانوں کے باہمی سلوک کے طریقے اسی نے خوب بتلائے ہیں - چنانچہ خصایل حمیدہ وذمیمہ یعنی نیکی اور بدی کے درجات اسی نے مقرر کئے ہیں - یہ اسی نے کہا ہے کہ نجوم وکواکب کا علم ہمارے ادراک معرفت سے بہت بعید ہے - مام اس سے کہ ہمارا ادراک معرفت کتنا ہی بڑھا ہوا کیوں نہ ہو اگر بالفرض والمحال ہم کو یہ علم کچھ حاصل بھی ہو گیا تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے - اس لئے فلسفہ کے صرف اس حصہ کو حاصل کرنا چاہئے جو متعلق بہ آداب ہو تاکہ آدمی کے اطوار اچھے بنیں اور اپنی عمر اچھی گذار سکے - یہ نئی قسم کا فلسفہ عام طور پر مقبول ہوا خصوصاً اس لئے کہ جس شخص نے اس کو اختراع کیا تھا وہ اس کی پوری پابندی کرتا تھا - اور اپنے امکان بھر حسن سلوک کرتا تھا - اور مصلحت ملکی میں - خواہ زمانہ صلح کا ہو زمانہ حرب - لوگوں کے حقوق کا خیال رکھتا تھا -

سقراط ان مشہور حکیموں میں سے ہے - کہ جو کسی جنگ میں سوائے دو جنگوں کے شریک نہیں ہوا - ایک مرتبہ اس کا فریق بے طرح گھر گیا تھا - اور جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو سقراط خود میدان میں کود گیا - اور داد شجاعت و مردانگی دی - اسی موقعہ پر جب افلاطون اثنائے جنگ میں اپنے گھوڑے سے گر پڑا تو اس نے اسکو ہلاکت سے بچا لیا - اور اپنی کمر پر سوار کر کے اس کو بے خطر جگہ میں پہنچا دیا - اور پھر واپس آ کر آ لڑا کہ دشمنوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے - دوسرے مرتبہ اہل اثینا نے شکست فاش کھائی اور تمام فوج سر پر پیر رکھ کر بھاگی - مگر ایک حکیم سقراط ہی ثابت قدم رہا - دشمنوں نے تعاقب کیا تو بھی اکیلا بار بار دشمنوں کے مقابلے کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا - جس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ اسی نے دشمنوں کا منہ پھیر دیا - ان دونوں واقعوں کے بعد وہ پھر کبھی شہر اثینا سے باہر نہیں نکلا - اور اس خصوص میں اس نے وہ کام کیا کہ

جو اُس کے پہلے حکیموں نے نہ کیا تھا۔ یعنی وہ لوگ عمر بھر اکتسابِ علوم کے لئے سفر کرتے رہے اور یہ بآرام اپنے وطن میں بیٹھا رہا۔ لیکن چونکہ سقراط کا فلسفہ یہ تھا کہ انسان کے لئے اپنے ہی نفس پر غور کرنا بہترین علوم ہے اس لئے اُس کو سفر کی صعوبت برداشت کرنی اور غیر کی معرفت حاصل کرنی فضول تھی۔ اور زیادہ مناسب یہ تھا کہ وہ اتھینا ہی میں رہ کر اپنے ملک اور اہلِ ملک کی اصلاح میں مشغول رہتا۔

چونکہ فلسفہ ادب ایک ایسا علم تھا کہ جو عمل پر زیادہ منحصر تھا نہ کہ عبارات پڑھنے اور غور کرنے پر۔ اس لئے اُس نے ایک قانون کلیہ بنایا جس کا ماحصل یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اُس راستے پر چلے جس پر عقلِ سلیم چلانا چاہے۔ اُنہی راؤں پر عمل کیا جائے۔ جو قانون کے موافق ہوں۔ اور کوئی ایسا حکم نہ دیں۔ جو خلاف قانون ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ نو افسران فوج کو خلاف ضابطہ کام کرنے کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ اور باوجود اُس کے کہ اس حکم کی تعمیل تمام ملک والوں۔ اور بالخصوص سقراط کو ناگوار تھی۔ مگر وہ قتل کر دئے گئے۔ اور سقراط نے اس موقعہ پر یہ کہا کہ یہ امر صاحبِ فضل و شرف کی شان کے خلاف ہے کہ وہ لوگوں کی خاطر سے اپنے عہد کو توڑ ڈالے۔

اپنے حسن سلوک و فضائل کی وجہ سے سقراط کی عزت بانی ارباب مشورہ سے زیادہ تھی۔ معاملات خانہ داری میں وہ خود دخل دیتا تھا اور جو شخص ایسا نہ کرتا اُسکو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ ہمیشہ پاک صاف کپڑے پہنا کرتا تھا۔ شرم و حیا کا بہت ہی خیال رکھتا تھا توسط کی حد سے نہ گزرتا تھا نہ اتنا جزرس تھا کہ بخیل کہلائے۔ نہ اتنا فراخدست کہ مسرف سمجھا جائے۔ حالانکہ مالدار نہ تھا مگر طمع کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ اپنے شاگردوں سے کبھی کچھ نہ لیتا تھا اور جو حکما، ایسا کرتے تھے اُنکو ملامت کیا کرتا تھا کہ یہ لوگ علم کو دنیا کے بدلے میں بیچتے ہیں۔ اور اپنی شہرت کے موافق علم کا سودا کرتے

ہیں۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ تعجب ہے کہ جو شخص تعلیم اخلاق دیتا ہے۔ وہ کیسے اسکو گوارا کرتا ہے کہ علم کو وہ ذریعہ سود بنائے۔ کیا یہ فایدہ اُس کو کافی نہیں ہے کہ اُس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تمام لوگوں میں بہترین شخص ہے؟ یہ کیا کچھ کم ہے کہ اُس کے تمام شاگرد اُس کے دوست بن جاتے ہیں؟ یہی ایک منافع دیگر فواید پر فایق ہے۔

انتیفون سوفسطائی کو سقراط سے چشمک تھی۔ اُس نے ایک روز سقراط سے کہا کہ معاملۂ عدم حرص میں تم ہی حق پر ہو۔ تمہارے نیک ہونے پر بھی دلیل کافی ہے کہ تم اپنے شاگردوں سے کچھ نہیں لیتے۔ لیکن اگر تم اپنا مکان۔ یا کپڑے یا اسباب فروخت کرنا چاہو تو تاوقتیکہ تم کو زیادہ سے زیادہ قیمت نہ ملے کبھی فروخت نہ کروگے۔ اور کبھی یہ گوارا نہ کروگے کہ ان چیزوں کو رائگان جانے دو۔ مگر جب تم یہ جانتے ہو کہ تم کچھ نہیں جانتے ہو۔ تو اس صورت میں تم کسی دوسرے کو تعلیم بھی نہیں دے سکتے اور اگر دو بھی تو کسی سے کچھ نہیں لے سکتے۔ لہذا تمہارا کچھ نہ لینا بے شبہ تمہاری فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔" سقراط نے اس کے جواب میں کہا کہ " جو کچھ تم نے کہا یہ بعض حالتوں میں صحیح ہے اور بعض میں نہیں۔ کیا تم اسمیں کچھ فرق نہیں کرتے کہ ایک شخص اپنے درختوں کے پتے دوستوں کو بطور تحفہ مفت بھیجتا ہے۔ دوسرا دوستوں کے لئے درخت خرید لیتا ہے؟" یہ سنکر وہ سوفسطائی بالکل خاموش ہو رہا۔ دیگر حکما اور سقراط میں یہ فرق تھا کہ وہ لوگ وقت معین اور جائے مقرر پر لوگوں کو پڑھاتے تھے۔ اور سقراط نے کوئی وقت یا مکان یا انسان مقرر نہیں کیا ہوا تھا۔ بلکہ باتوں ہی باتوں میں سبکو تعلیم دیا کرتا تھا۔

ایک شخص مالیطوس نامی نے سقراط پر کئی بڑی بڑی تہمتیں لگائیں منجملہ اُسکے ایک یہ تھی کہ وہ اتھینا کے دیوتاؤں کو نہیں مانتا۔ بلکہ اُس نے اپنا ایک الگ ہی دیوتا بنا رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس الزام سے بالکل بری تھا۔ کیونکہ اس خصوص میں جو کوئی اُس سے سوال کرتا تو سقراط اُس کو یہی جواب دیتا کہ اس معاملہ میں

بت خانۂ آفتاب و ولفیس کے کاہن جو کچھ تم سے کہیں اُس پر عمل کرو۔ کاہنوں سے پوچھا جاتا تو وہ یہی کہتے تھے کہ انسان کو چاہئے کہ عبادت کے معاملہ میں وہ اپنے اہل شہر کا ساتھ دے۔ چنانچہ یہی طریقہ سقراط کا تھا کہ اور لوگوں کیطرح وہ بھی قربانیاں چڑہایا کرتا تھا۔ گو اس میں شک نہیں کہ یہ قربانیاں اپنی وسعت کے موافق بہت ہی قلیل ہوا کرتی تھیں سقراط کا یہ بھی گمان تھا کہ بہ نسبت امیروں کے جو بڑی بڑی قیمتی قربانیاں چڑہاتے ہیں غربا کی کم قیمت اور حقیر قربانیاں زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ کیونکہ اُن کو اُس سے زیادہ وسعت ہوتی ہے اور انکو اتنی بھی مقدرت نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ امیروں سے عبادت ہو بھی نہیں سکتی۔

سقراط کا قول تھا کہ دین کے کاموں میں نماز اور دعاؤں سے زیادہ کوئی چیز سہل نہیں ہے۔ لیکن آدمی کو چاہئے کہ خدا سے کسی معین چیز کی دُعا نہ مانگے۔ بلکہ یہ دُعا کرے کہ جو بات اُس کے لئے بہتر ہو وہ عطا کیجائے۔ مثلاً اگر مال و دولت مانگے اور وہ مل بھی جائے تو ممکن ہے کہ آدمی اُس کو کھیل کود ہی میں اُڑا دے۔ اور کچھ فایدہ نہ اُٹھائے۔

سقراط ہمیشہ لوگوں کو دیندار بننے کیطرف مائل کیا کرتا تھا چنانچہ زینفون نے اُس کے وہ مقالات لکھے ہیں کہ جو اُس نے ایک شخص ارستدموس نامی سے مخاطب ہو کر لکھے ہیں۔ یہ شخص دین کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ مگر سقراط کے افہام و تفہیم سے بڑا دیندار ہو گیا تھا۔ ان مقالات کو دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کا یہ فلسفی عقاید توحید پر کیسا مستقیم تھا۔

سقراط گو نہایت غریب تھا مگر اپنی حالت میں بہت ہی خوش تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ میرا فقر میرے ہی فعل کے سبب سے ہے۔ اگر وہ امیر بننا چاہتا تھا تو اپنے دوستوں اور شاگردوں کے تحفہ و تحایف سے ہی بڑا امیر بن سکتا تھا۔ مگر وہ ان کو کبھی قبول

نہ کرتا تھا۔حالانکہ اُس کی بیوی کو اُس کی سخت شکایت رہتی تھی۔اور چونکہ وہ اسکے فلسفہ کی لذت کو نہ جانتی تھی اس لئے ہمیشہ اسباب معیشت کا رونا روتی رہتی تھی اور سخت تنگدست رہا کرتی تھی۔ایک مرتبہ اُسی سوفسطائی نے جس کا اوپر تذکرہ آچکا ہے سقراط سے کہا کہ تم ہمیشہ فقر و ذلت و مسکنت میں رہتے ہو۔تمہارا ہی جگر ہے کہ تم اس کو گوارا کر لیتے ہو۔تم بہت ہی بُرا کھانا کھاتے ہو۔بہت ہی ذلیل کپڑا پہنتے ہو۔ایک کرتہ ہے کہ تم اُسی کو گرمی اور جاڑے میں پہنے رہتے ہو۔تمہیں اتنا میسر نہیں کہ جوتہ تک پہن لو۔ہمیشہ ننگے پیر مارے پھرتے ہو۔سقراط نے کہا کہ تمہاری یہ غلطی ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ انسان کی سعادت امیری میں ہے۔حالانکہ اگر تم کو میرے فقر کے لطف معلوم ہو جائیں تو تم خود تسلیم کر لو کہ میں تم سے بدرجہا بہتر ہوں۔فی الاصل غنی مطلق ایک معبود کی ذات ہے۔انسان کو اُس کے ظرف کے موافق جو کچھ ملتا ہے وہ اُس کے واسطے بالکل کافی ہے۔جتنا آدمی کو دیا گیا ہے اگر وہ اُسی پر قناعت کرے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے اُسپر حسد نہ کرے تو اُس کو اتنا ہی اپنے معبود سے قرب حاصل ہو گا۔

سقراط سے زیادہ کسی شخص کو صفائی باطن حاصل نہ تھی۔اُس کے حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ جن سے سخت تعجب ہوتا ہے۔اس شہر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا۔جو اُس سے مل کر اُس کے حسن سیرت کا معترف نہ ہوتا۔اُس کے حسن سلوک ہی کیوجہ سے بہت جلد اُسکا اعتبار لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہو گیا۔اور شاگرد جوق جوق جمع ہو گئے۔تمام لوگوں کو اُس کی باتوں میں وہ مزہ ملتا تھا کہ اپنی تمام لذات و خواہشات نفسانی کو چھوڑ کر اُسی کے ہو رہتے تھے۔لوگوں کیا اسواسطے اُس کیطرف اور بھی زیادہ کشش ہوتی تھی کہ باوجودیکہ وہ اپنے نفس کے لئے سخت تکلیف گوارا کرتا تھا لیکن دوسروں کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتا تھا۔سب سے پہلے دنیات کی

تعلیم دینی شروع کرتا تھا۔ اور شاگردوں کو عفت کی تلقین کرتا تھا اور برائیوں سے ڈراتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ لذات میں بالکل مشغول رہنے سے انسان کی بہترین صفات یعنے تذاوی ضایع ہوجاتی ہے۔

تعلیم آداب میں بالخصوص سقراط کیطرف اس لئے عام کشش ہوتی تھی کہ وہ کسی خاص وقت یا موقعہ کا منتظر نہ رہتا تھا بلکہ جب اور جہاں موقعہ دیکھتا وعظ شروع کردیتا۔ ہمیشہ سائل کے فہم وادراک کا خیال رکھتا تھا۔ اور اس طرح ہر ایک بات پر دلایل پیش کرتا تھا کہ آخر ہر چیز کی ماہیت کھلجاتی تھی۔ چونکہ شب و روز اُس کا اسی حالت میں گزرتا تھا۔ اس لئے جو شخص اُس تک پہونچتا وہی کچھ نہ کچھ فایدہ حاصل کرکے آتا تھا۔

اگرچہ سقراط نے اپنے پیچھے کوئی تصانیف نہیں چھوڑیں جن سے اُسکی فضیلت ثابت ہوتی۔ مگر افلاطون اور زنفون کی تالیفات سقراط کے فضائل کی کافی شہادتیں ہیں۔ ان دونوں (یعنی افلاطون و زنفون) نے سقراط کے آداب و معارف قلمبند کئے ہیں۔ ان میں اس حکیم کے مناظرات بھی ہیں۔ جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خوبصورتی کے ساتھ اپنے دلایل و براہین موقعہ و محل کے موافق بیان کیا کرتا تھا اگرچہ افلاطون نے اسکا لحاظ نہیں رکھا کہ سقراط ہی کے الفاظ کو قلمبند کرے۔ لیکن زنفون نے اس کا التزام رکھا ہے کہ وہی عبارات درج کی ہیں کہ جو بحث ومباحثات میں سقراط کی زبان سے نکلی ہیں۔

سخت تعجب ہے کہ باوجود اس کے کہ سقراط ہمیشہ لوگوں کو عبادت کیطرف مایل کیا کرتا تھا۔ اور لذات وشہوات سے بچانے کی کوشش کرتا تھا اسی کو اس جرم میں سزائے موت کا حکم دیا گیا کہ وہ کافر ہے۔ اور فساد برپا کرنے والا ہے لیکن وہ وقت ہی ایسا تھا کہ سلطنت کی حالت خراب تھی اور حکام کا ظلم تعدی زوروں پر تھا۔

خصوصاً تین حکام جو سخت ظالم تھے۔ اور انہی نے سقراط کو سزائے موت کا حکم دیا تھا۔ یہ سنکر اور بھی تعجب ہوگا کہ یہ تینوں سقراط کے شاگرد تھے۔ ان میں سے ایک کا نام اقرسیاس تھا۔ اور دوسرے کا القبیادہ۔ دونو نے فلسفہ کی تعلیم سقراط سے حاصل کی تھی۔ لیکن استاد کے مواعظ اُن کی طبیعت کے خلاف تھے اور وہ شہوات ولذات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے سقراط کو چھوڑ دیا۔ اقرسیاس تو اُسکا جانی دشمن بن گیا۔ کیونکہ سقراط اُس کی بُری سیرتوں اور مظالم کیوجہ سے اُس کو سخت ملامت کیا کرتا تھا۔ غرض یہ بھی اوروں کے ساتھ جاملا۔ اور سب نے مل کر سقراط کے مار ڈالنے کا ارادہ کر لیا سقراط کو بھی جب انکے ظلم وتعدی کی خبر پہنچی تو انکو بہت ہی بُرا بھلا کہا کرتا اور انکی سطوت کی کوئی پروانہ کرتا اور جب اُسنے یہ دیکھا کہ وہ لوگ رعایا کو قتل کرائے ڈالتے ہیں تو سقراط سے رہا نہ گیا۔ اور اس نے عام لوگوں کے سامنے کہا۔ کہ جب چرواہی ہر روز ایک نہ ایک دبلی پتلی بکری کو کھا جائے۔ تو کوئی شک نہیں کہ وہ اس منصب پر قائم رہنے کے قابل نہیں۔ جب اقرسیاس اور فارقلیس نے (جو ظالموں کے سرگروہ تھے) یہ بات سنی۔ تو انھوں نے حکم دیا کہ شہر اثینہ میں کوئی شخص تعلیم وتعلم نہ کرے اور خصوصاً اشاروں اور کنایوں میں جس سے یہ مقصود تھا کہ سقراط کی بالکل زبان بند کر دیجائے۔ سقراط خود ان قانون سازوں کے پاس گیا ان سے اس حکم کی وجہ پوچھی اور ایسے ایسے سوالات کئے - کہ ان سے چپ ہی رہتے بنی۔ اور مجبور ہو کر انکو یہ کہنا پڑا۔ کہ ہمارا یہ مقصود ہے۔ کہ تم جوان لوگوں سے کبھی ہمکلام نہ ہو۔ سقراط نے پوچھا۔ کہ جوانی تمہارے نزدیک کب تک باقی رہتی ہے؟ کہا کہ تیس برس تک۔ سقراط نے کہا۔ بھلا اگر کوئی مجھ سے تمہارا مکان پوچھے تو میں اُسے جواب دوں یا نہیں۔ فارقلیس نے کہا کہ ہاں جواب دو۔

اقرسیاس نے کہا کہ تم کو اس امر سے منع کیا جاتا ہے کہ تم اُن لوگوں سے کچھ نہ کہو۔ جنکے کان تمہاری ملامتیں سنتے سنتے بہرے ہوگئے ہیں۔ سقراط نے کہا کہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ شفقت و انصاف کسکو کہتے ہیں تو اُس کو بھی جواب دوں یا نہیں۔ خارقلیس نے کہا کہ بیشک چرواہے اور بکری کی مثل بیان کرو۔ (اس میں اُسی قول کیطرف اشارہ ہے جو سقراط نے کہا تھا) مگر یہ احتیاط رکھنا کہ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکلے جسکا نتیجہ یہ ہو کہ بکریوں کو نقصان مزید پہنچے۔ سقراط نے سوچا کہ اب ان لوگوں سے زیادہ کلام کرنا فضول ہے۔ نیز یہ کہ فی الاصل ان لوگوں کو چرواہے اور بکریوں کی مثال نے سخت مشتعل کر دیا ہے۔ اس آگ پر سقراط کی شہرت و نیک نامی نے اور بھی تیل ڈال دیا۔ اور ان لوگوں کو انتقام لینے پر مائل کر دیا۔ اس پر ان لوگوں نے ایک شخص ارطوفان نامی کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ایک لمبا چوڑا قصہ بیان کرے۔ چنانچہ سالانہ کھیل کے موقعہ پر یہ بیان کیا گیا اور اس میں سقراط پر بڑے بڑے الزامات لگائے گئے۔ جب سب لوگ برانگیختہ ہوگئے تو ایک شخص میلیطوس نے کھڑے ہو کر کہا کہ سقراط کے اور جرایم تو ایک طرف یہ جرم کیا کچھ کم ہے کہ وہ اہل اثینا کے دیوتاؤں کو نہیں مانتا اُس پر یہ غضب ہے کہ اُس نے غرباء کے لئے الگ دیوتا قرار دیئے ہیں۔ اور نوجوانوں کو ایسی تعلیمات دیتا ہے کہ وہ حکام و رعایا کی تحقیر کریں۔ ایسا آدمی بے شبہ واجب القتل ہے۔

اگرچہ اقرسیاس و خارقلیس (یہ دو شاگردان سقراط) اور اُنکے ہمرازوں کو سقراط سے سخت تعصب تھا۔ لیکن اگر وہ ان الزامات کی جواب دہی کرتا تو امید تھی کہ اُس کے جرایم معاف کر دیئے جاتے لیکن سقراط کو اُس کی بزرگی نے اسکی اجازت نہ دی۔ اور اُس نے یہ سوچا کہ جواب دہی میں گویا جرایم کا اعتراف ہے۔ چنانچہ حکام نے جب اُس کو جواب دہی کے واسطے کہا تو اُس نے متکبرانہ

جواب دیا کہ "میرا حق ہے کہ میں عمر بھر اپنے اقوال پر مُصِر رہوں"۔ بس اسی جواب پر اُسکے لئے سزائے موت کا فتوےٰ دیدیا گیا۔

ایک فلیسوف لوسیاس نامی نے حکم سزائے موت سنایا۔ پھر سقراط کو پڑھنے کو دیا۔ سقراط نے پڑھ کر کہا کہ بہت درست ہے۔ مگر میرے مناسب حال نہیں۔ لوسیاس نے وجہ پوچھی تو کہا کہ بس یہ سمجھ لو کہ کپڑے اور جوتے اچھی چیز ہیں۔ مگر ایک ہی کپڑے یا جوتے ہر ایک کو پورے نہیں آتے۔ اس کے بعد سقراط نے ایسے احکام کی تعریف کی کہ جو بے عمل نہ ہوں۔ مگر یہ حکم چونکہ عدل وطہارت کی بیخ کنی کرتا ہے اس لئے نہایت قبیح ہے۔

غرض اس کے بعد سقراط قید کر دیا گیا۔ اور اسی حالت میں اُس کو ایک زہر آلودہ پیالہ پلا کر مار ڈالا گیا (اُس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کو سزائے موت دیجاتی تھی اُنکو زہر ہی پلا دیا جاتا تھا)

ڈیوجینیس لویرتھ نے لکھا ہے کہ سقراط نے دو عورتوں سے شادی کی تھی۔ منجملہ اُنکے صرف ایک عورت کا حال معلوم ہے، جس کے بطن سے اُسکا بیٹا طینوفلیس پیدا ہوا تھا۔

یہ عورت سخت بدمزاج اور تندخو تھی۔ مگر سقراط اُس پر بہت تحمل کرتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ آخر تم نے اس سے شادی ہی کیوں کی تھی تو کہا کہ محض اس لئے کہ اس عورت کی بدمزاجی سہتے سہتے مجھے عوام کی تندخوئی و سخت کلامی ناگوار نہ گزرے۔

یہ بھی مشہور تھا کہ سقراط کے قابو میں ایک جن تھا جو اُس کو اکثر امور میں ہدایت کرتا رہتا تھا۔ افلاطون وغیرہ۔ قدما مصنفین نے بھی یہی لکھا ہے۔

سقراط نے اڑسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

محمد خلیل الرحمٰن

ایشیائی شعرا کی نازک خیالی

نمبر ۳

مولٰنا عبد القادر بیدل قدس اللہ سرہ العزیز کا ہمپایہ تمام شعراء فارس میں بلحاظ نازک خیالی کوئی نہیں گزرا جدت کا یہ عالم ہے کہ دیگر نازک خیال شعرا کے کلام میں ثقیل۔ گرانڈیل اجنبی لغات اور ٹیڑھی ترکیبات ہیں مگر حضرت بیدل کا کلام تنافر اور تعقید سے بالکل پاک ہے عام فہم الفاظ ہیں تاہم معانی ایسے نازک کہ دماغ چکرا جائے۔ بیدل کا کلام زیادہ تر اخلاقی ہے سنیے۔

دیگر - بحصول مقصد عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب
تو ز اشک آنہمہ پس نۂ قدمے ز آبلہ پا طلب

حل دنیا میں عافیت و آرام و آسایش کی منزل مقصود پر پہنچنے کو نہ کوئی دلیل (رہبر) ڈھونڈھ نہ عصا تلاش کر کیونکہ رہرو کو انہیں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اے مخاطب تو کسی طرح اپنے تھک جانے میں اشک سے کم نہیں پس ایک قدم اُس شخص سے جس کے پاؤں میں آبلے ہوں مانگ یعنی جس طرح آنسو سے تھک کر نہیں چلا جاتا مطلب صرف اس قدر ہے کہ دنیا میں آسایش نہیں۔ اشک جب گرتا ہے تو پھر نہیں اٹھتا۔ اشک کو آبلہ پا قرار دینا کتنا موزوں ہے؟

دیگر: زہر او عالم آب و گل بدر حیوں رس دوا گسل
اثر اجابت مشتغل ز شکست دست دعا طلب

حل عالم آب و گل (دنیا) کی مراد سے درگزر اور جنون محبت الہیٰ کے دروازے پر پہنچ۔
اجابت خود شرمندہ ہے اس کا اثر دست دعا کے ٹوٹ جانے سے طلب کرلینے جس
صورت میں تیرا دست دعا پہلے ہی ٹوٹ گیا ہے تو بیچاری اجابت کیا اپنا سر پھوڑیگی
مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مراد حاصل نہیں ہوتی نہ کوئی دعا قبول ہوئی ہے۔
یہاں دست دعا ٹوٹا ہے اور اجابت شرمندہ ہے۔

دیگر　　ز سپہر گر ہمہ بگزری تو ہماں بہ سایہ برابری
　　بہ علاج شعلہ خودسری نمے از جبین حیا طلب

حل اگر تو آسمان سے بھی گزر جائیگا تو سایہ کی برابر ہوگا یعنی کچھ حاصل ہوگا تو اپنے
شعلہ خودسری (تکبر) کے علاج کے واسطے جبین حیا سے قطرے مانگ اور اس پر چھڑک
تاکہ یہ شعلہ بجھ جائے یعنی عاجز بن اور تکبر سے شرم کر۔

دیگر　　بفسانۂ ہوس آنقدر مفروش شہرت کروفر
　　چو غبار انجمن سحر نفسے شمار و ہوا طلب

حل غبار انجمن سحر کی طرح افسانۂ ہوس بیان کرکے شہرت کروفر کی دکان نہ کھول۔
یعنی ہوا و ہوس کی باتوں کو فروغ نہ دے۔ جیسا صبح کے وقت غبار ہوتا ہے ایک
سانس گن اور ہوا کا طالب ہو کر فنا ہو جا۔ یعنی اگر تو نے اپنے کروفر کی شہرت فروخت
کی بھی تو نتیجہ وہی فنا ہے۔ غبار انجمن سحر میں اضافت بیانیہ ہے۔ سحر کا ہنگامہ غبار
کیطرح تھوڑی دیر میں فنا ہو جاتا ہے۔

دیگر　　ز ہوائے کبر و سرکشی ہمہ راست ننگ فروتنی
　　تو بہ ذوق منصب ایمنی ز پر شکستہ ہما طلب

حل لوگ غرور اور تکبر کی خواہش میں فروتنی کو عار سمجھتے ہیں تو سب سے بے ڈر اور فارغ
ہو جانے کے ذوق میں اپنے ٹوٹے ہوئے پر (فروتنی) کو اپنے لئے ہما بنا اور فضا سے

معرفت میں پرواز کر۔

دیگر

کفِ پائے حجلہ نشینِ ما بہ خیالِ کبر و کمین ما

پئے آرزوئے جبینِ ما بہ چراغِ رنگِ حنا طلب

حل یہ شعر تمام اشعار سے سخت تر اور نہایت پیچیدہ اور نازک ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے حجلہ نشین (معشوق) کا کفِ پا عالم خیال میں ہماری گھات میں لگا یعنی ہم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ معشوق کی کفِ پا سے جبیں سائی کریں اے مخاطب اگر تجھ کو ہماری آرزوئے جبین کا سراغ لگانا منظور ہے تو چراغ رنگِ حنا سے سراغ لگا یعنے معشوق کے پاؤں میں جو مہندی لگی ہے وہ چراغ ہے پس تجھے اس چراغ کی روشنی میں ہماری آرزوئے جبیں سائی کا سراغ مل جائے گا۔

شدہ رمزِ جلوۂ بے نشاں بغبارِ آئنہ ات نہاں

نفسے بہ صیقلِ امتحاں بروا زمیاں و صفا طلب

حل تیرے آئینہ دل کے غبار میں جلوہ بے نشاں (جناب باری) کے جلوہ کی رمز چھپ گئی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے درمیان سے نکل اور امتحان سے صفائی طلب کر یعنی تو امتحاناً ہی دل کو صاف کر پھر دیکھ کہ وہ جلوۂ بے نشان کیونکر نظر نہیں آتا۔

دیگر طلب تو بس بود آنقدر کہ زمعنئے سببی اثر

بخودت اگر نرسد نظر بخیالِ ہیچ و صدا طلب

حل تیری طلب اسی قدر کافی ہے کہ تو باطن سے اثر لے جا یعنی معرفت الٰہی سے موثر ہو اگر اپنے وجود پر تیری نظر نہیں پڑتی یعنی تو اپنے نفس میں خدا کو نہیں پہچان سکتا تو اپنے خیال میں لپٹ ایک آواز مانگ کہ ہوالموجود (یہاں ہیچ امرِ پیچیدہ ہے)

خوش آنکہ ترکِ سبب کنی بہ یقیں رسی و طلب کنی

ز حقیقت آنچہ طلب کنی بہ طریقِ بیدلؔ طلب

حل خدائے تعالٰے بے سبب اور بے دلیل ملتا ہے پس تیرے لئے یہی اچھا ہے کہ سب کو چھوڑے اور یقین کا رتبہ حاصل کرکے خوشی منائے حقیقت الٰہی کی اگر تجھے طلب ہے تو ہمارے بیدل کے طریق پر طلب کر یعنی تو بھی ایسا ہی طالب بن جیسا بیدل ہے۔

پھر حضرت بیدل کی نظم نثر سے نازک اور دقیق ہے اور نثر نظم سے اوق۔ ملاحظہ ہو:

نکتہ۔ گواہ قوتِ جسمِ آدمی است سعی در ادائے شرائطِ عبادت و شاہد قوت عقل توجہ بہ اکتساب علوم حکمت است و دلیل قوت روح پرواز ہمت بہ عروج نسبت وحدت مادۂ این ہر سہ قوت مقدار اعتدال غذا است کہ تقویت آن جسم توانا شود بہ قدرت اعمال و عقل اعانت یابد در سعی تحصیل کمال و روح بال کشاید بقضائے محبت ذوالجلال۔ اگر اسباب غذا مفقود باشد تردد جسم در طلب معیشت مانع ذوق عبادت است و تصرفِ عقل در تدبیر حصول آن محروم کسب علم و حکمت و توجہ روح از تشویش انبیابہ برجوع سر منزل جمعیت۔

حل شرائط عبادت کے ادا کرنے میں جسم انسانی کی قوت گواہ ہے اور قوت عقل کی شاہد علوم حکمت کے اکتساب کی جانب متوجہ ہونا ہے۔ جسمانی قوت اس لئے دی گئی ہے کہ انسان واحد حقیقی کی نسبت وحدت کے عروج کی جانب ہمت کو پرواز دے یعنی نسبت وحدت کو بڑھائے مادہ ان تینوں قوتوں کا غذا کی مقدار کے اعتدال پر رکھا ہے۔ یعنی معتدل غذا کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ غذا کی تقویت سے اعمال پر قدرت رہے اور تحصیل کمال نسبت وحدت میں عقل مدد پائے اور قضاء محبت ذوالجلال میں روح بازو کھولے اگر اسباب غذا مفقود ہیں تو طلب معاش میں تردد رہنا ذوق عبادت کو روکے گا اور عقل کا تصرف حصول غذا کی فکر میں علم و حکمت سیکھنے سے محروم رہے گا اور روح کی توجہ بھی اسباب معاش کی تشویش میں سر منزل جمعیت پر پہنچنے سے قاصر رہے گی مطلب یہ ہے کہ حد سے زیادہ چلہ کشی وغیرہ میں بھوکا رہنا ممنوع

ہے اور شریعت اسلامی کا یہ حکم ہے کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام ۔

خلقے است دریں جنوں سرائے نیرنگ
زندانی اختراعِ چندیں فرہنگ
من بندۂ آنکہ در ادب گاہِ ثبات
جوشش مجنوں نسازد و سیری ونگ

حل: جنوں سرائے نیرنگ (دنیا) میں ایک مخلوق بہت سی دانائیوں کی اختراع کی زندانی (قیدی) ہے یعنے بھوک کے سودا میں جو طرح طرح کی شکلیں نظر آتی ہیں تو یہ مخلوق انکو اپنی دانائی کا اختراع سمجھتی ہے ۔ میں تو اس شخص کا غلام ہوں جس کو ثبات واستقلال کے ادب گاہ میں نہ بھوک دیوانہ بنائے نہ شکم سیری حیران کرے

دیگر
اگر بہ گلشنِ ز ناز گرد و قدِ بلندِ تو جلوہ فرما
زپیکرِ سرو موج خجلت شود نمایاں چو مے زمینا

حل: اے معشوق اگر تیرا قد بلند ہمارے گلشن میں جلوہ فرما ہو تو سرو کے پیکر سے عرق خجالت کی موج یوں نمایاں ہو جیسے شیشۂ مے سے شراب۔ مطلب یہ ہے کہ سرو تیرے قد سے منفعل ہو۔

دیگر
ز چشمِ مستت اگر نیابد قبول کیفیتِ نگا ہے
تپد ز مستی برونِ آئینہ نقشِ جوہر چو موجِ صہبا

حل: اگر تیری چشم مست سے آئینہ کیفیتِ نگاہ کی قبولیت حاصل کرے یعنی اس کو یہ علم ہو جائے کہ کیفیت نگاہ نے اُسے قبولیت سے دیکھا ہے تو موج صہبا کی طرح نقش جوہر (خود جوہر آئینہ) اسے مستی کے آئینے سے باہر نکلجائے یعنی تیری چشم مست میں یہ اثر ہے ۔

دیگر
نخواند طفلِ جنوں مزاجم خطے ز پست و بلندِ ہستی
شوم فلاطونِ ملکِ دانش اگر شناسیم از کفِ پا

حل میرے جنون مزاج طفل رخود میں یا میرے دل نے دنیا کے پست و بلند کا خطر نہیں پڑھا یعنی پست و بلند سے بے خبر ہے۔

ہم تو ملک دانش کے گویا افلاطون بن جائیں اگر ہم کو پست و بلند کی شناخت کف پا کے ذریعے سے حاصل ہو کیونکہ پست و بلند (نشیب و فراز) کی شناخت پاؤں ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے نشیب و فراز کا سمجھنا بہت مشکل ہے

شیخ ناصر علی بھی شعراء فارسی میں نازک خیال ہیں اگرچہ اعلے درجہ نہیں رکھتے اور کلام میں اکثر درزیں ہیں ؎

الٰہی شوخئے برقِ تجلے دہ زبانم را
قبولِ خاطرِ موسیٰ کلاماں کن بیانم را

لغت الٰہی میں الٰہ بمعنی معبود برحق اور یے متکلم کی ہے اور حرف ندا مخفف ہے۔ یعنی اے خدائے من۔ تجلی مصدر ہے باب تفعل سے ظاہر اور روشن ہونا۔ مراد جلوہ نور الٰہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر بالائے کوہ طور طاری ہوا اور بمعنی شکستن و شکستن و تراویدن و دمیدن بھی مستعمل ہے اور فارسی والے کبھی اپنے قوافی میں تجلی کو تجلا باندھتے ہیں حالانکہ جس یاء کا ماقبل مکسور ہو وہ قاعدہ عرب کے موافق الف نہیں ہو سکتی۔ یہ تصرف غلط ہے۔

حل اے خدا میری زبان کو وہ شوخی عطا کر جو کوہ طور پر برق تجلی میں تھی یعنی روشن کر اور میرے بیان کو اپنے عارفوں میں مقبول بنا۔ شوخی محض برق کے تناسب سے ہے ورنہ زبان کے لئے شوخی کا کوئی محل نہیں۔ ہاں زبان سے کلام مراد لی جائے تو کسی قدر درست ہے۔

دیگر۔
خیالِ آں پری رو در شبستانِ عدم بردم
کہ سازد مطلعِ خورشید چوں صبح استخوانم را

حل میں شبستانِ عدم (گور) میں معشوق کا خیال اپنے ساتھ لے گیا تاکہ اس کی میری ہڈیوں کو مثلِ صبح مطلعِ خورشید بناوے لفظ پر یہ ٹھیک نہیں پہلا مصرعہ یوں ہو تو اچھا ہے

خیالِ شمع حسنش در شبستانِ عدم بردم

محبت جادہ در رہِ نہاں در خلوتِ دلہا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چو تارِ سبحہ گم گردید ایں رہ زیرِ منزلہا

حل - دلوں میں محبت الہٰی پوشیدہ راہ سے جاتی ہے جسطرح تسبیح کا تار دانوں میں چھپ جاتا ہے دانوں کو دل قرار دیا ہے حالانکہ شعر میں ذکر نہیں تارِ سبحہ سے التزاماً سمجھ لو - جادہ اور راہ دونو ایک ہیں دوسرے مصرعہ میں ضمیر کافی تھی دوم خلوت بمقابلہ جلوت ہے جو نہاں ہوتی ہے اس لئے نہاں حشو ہے پس یوں ہونا چاہئے۔

شعر

محبت جادہ دارد در درونِ خلوتِ دلہا
کہ گم گردید تارِ سبحہ آسا زیرِ منزلہا
تو چوں ساقی شوی در تنگ ظرفی نے ماند
بقدرِ بحر باشد وسعتِ آغوشِ ساحلہا

حل - اے محبوب اگرچہ میں تنگ ظرف ہوں لیکن جب تو خود ساقی بنے گا تو یہ عذر باقی نہ رہے گا کیونکہ دریا کو جس قدر وسعت ہوگی اُسیقدر ساحل میں بھی وسعت ہو جائے گی - دریا دُرو بے معنی ہے بلکہ مصرعہ اولے میں درو کی جگہ عذر چاہئے ساقی اور ظرف کے لحاظ سے درد لایا گیا۔

دیگر - ‏ ‏ ‏ تو رہ از کثرتِ اسباب بر خود تنگ مے سازی
اوا فہماں چو بوئے گل رہا کردند محملہا

حل - تو اسباب و وسائل ڈھونڈتا ہے اسی لئے اپنے اوپر راہ تنگ کر لیتا ہے۔ یعنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتا جو لوگ قرب وصل کے ادا فہم ہیں وہ بوئے گل کی

طرح کچھ پروا نہیں کرتے کہ عمل ہی کے ذریعہ سے سفر ہو وہ تو بے توسل منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں بوسکل کامل تو وہ گل ہے جس کو چھوڑ کر بوگل جاتی ہے۔
عرب کا شاعر متنبی بڑا نازک خیال ہے اس نے شعر میں نبوت کا دعوے کیا ہے خود متنبی کے معنے ہی تنباء بالشعر کے ہیں یعنی جس نے شعر میں نبی ہونے کا دعوی کیا۔ سیف الدولہ کے مدحیہ قصیدے کی تشبیب میں لکھتا ہے۔

شعر

عذل العواذل حول قلب التائہ ۔۔۔ وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

لغت۔ عذل بالفتح ملامت اور بفتحتین کوشش وملامت اور بضمتین سخت گرمیوں کے دن۔ عواذل عاذلہ مونث کی جمع یعنے ملامت کرنے والی عورتیں اور عاذل ملامت کرنے والا اور وہ رگ جس سے استحاضہ کا خون نکلتا ہے اور ایک دریا یا ندی کے پانی کا نام اور ایک موضع کا نام اور زمانۂ جاہلیت میں ماہ شعبان یا شوال کو بھی عاذل کہتے تھے۔ تائہ حیران اور گمراہ اور تیہ بالکسر بیابان اور تیہی مارنا اور تحیر کرنا اور گمراہ وحیران ہونا۔ سوداء مونث ہو وہ سیاہ نقطہ جو دل کے جوف میں ہے حل۔ ملامت کرنے والیوں کی ملامت عاشق متحیر کے دل کے گرد وپیش ہی رہتی ہے اور معشوقوں کی محبت اس کے سویدائے قلب میں گھسی ہوئی ہے پس ملامت کا اثر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی معشوقہ عورتیں ملامت کرتی ہیں کہ فلاں عورت میں ایسا کیا سرخاب کا پر ہے کہ تو اس کے عشق میں حیران وسرگردان ہے ہم تو اس سے کہیں زیادہ حسینہ وجمیلہ ہیں مگر عاشق ایک بھی نہیں سنتا کیونکہ لیلی را بہ چشم مجنوں باید دید بعض نسخوں میں قلب مضاف کے بدلے قلبی لکھا ہے اور یا ے متکلم کی ہے اس صورت میں التائہ صفت اور قلبی موصوف ہے اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ قلب کی صفت تائہ نہیں آتی اور عرب میں تائہ القلب نہیں بولتے ۔

پس اضافت ہی فصیح ہے لیکن یہ زبردستی ہے کیونکہ جب عاشق کی صفت تحیر
تو قلب کی صفت کیوں تحیر نہ ہو۔ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ اس مطلع کا قافیہ غلط
ہے کیونکہ تمام قصیدہ مہموز ہے یعنی قوافی بالہمزہ میں - جواب دیا گیا کہ ملے ہوئے قافیہ
میں اصلی ہے نہ کہ ردیف کی اور اس میں کوئی خرابی نہیں - دیگر

يشكو الملام الى اللوائم حرّه		ويصدّ حين يلمن عن برحائه

لغت لوائم لائمہ کی جمع یعنے ملامت کرنے والیاں - صد بالفتح و تشدید دال روکنا اور
رکنا - برحا - محبت کی سخت آگ جو عاشق کے دل میں ہوتی ہے۔

حل - جب عورتیں ملامت کرتی ہیں تو خود ملامت اُن سے شکایت کرتی رہتی
چلاتی ہے کہ میں عاشق کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کے پاس نہیں جا سکتی
اور اُس سے خوف کرتی ہوں - مطلب یہ ہے کہ ملامت کارگر نہیں ہوتی۔

دیگر

وبمهجتي يا عاذلي الملك الذي		اسخطت كل الناس في ارضائه

لغت - مہجہ بالضم جان اور دل اور خون - ملک سے مراد متنبی کا ممدوح سیف الدولہ
ہے - سخط ناراض ہونا - اسخاط ناراض کرنا۔

حل - اے ملامت کرنے والے میری جان اُس بادشاہ پر فدا ہے جس کے راضی رکھنے
میں مینے ساری دنیا کو ناخوش کیا ہے یعنی اُس کی رضامندی اور خدمت کو سب
پر مقدم سمجھا ہے۔

دیگر

ان كان قد ملك القلوب فانه		ملك الزمان بارضه وسمائه

حل - ممدوح اگر دلوں کا مالک ہو گیا ہے تو تعجب نہیں وہ تو زمانہ کا بھی مع زمین و
آسمان کے مالک ہے یعنی سب اُس کی مرضی کے موافق کام کرتے ہیں۔

الشمس من حسادہ والنصر من قرنائہ والسیف من اسمائہ
دیگر

حل - آفتاب اُس کے حاسدوں میں سے ہے کیونکہ اُس کا جلال یا جبروت یا حسن یا فیض آفتاب سے بڑھ کر ہے اور فتح اُس کے ساتھیوں میں سے اور سیف اُس کے ناموں میں سے ہے کیونکہ ممدوح کا نام سیف الدولہ ہے - دیگر

این الثلاثۃ من ثلٰث خلالہ من حسنہ و ابائہ و مضائہ

لغت خلال بالکسر کسی سے دوستی کرنا اور سخت لپٹنا اور کسی شے کا پیچ اور گھر کا شہتیر اور دانت کریدنے کا تنکا اور بالفتح کچا چھوارا جو درخت پر سبز اور گول ہو جائے اور جو بفتح و تشدید نام ہے کہ فروش لیکر یہاں مراد خلال جمع خلہ بالکسر بمعنے خصلت ہے - ابا بالکسر ذلت پر رضامند نہ ہونا اور انکار کرنا - مضاء رواں ہونا۔

حل - مضمون بالا سے اعراض کرتا ہے کہ آفتاب اور فتح اور تلوار اُس کی تین خصلتوں سے کیا نسبت رکھتی ہیں یعنی آفتاب کو اُس کے حسن سے فتح کو اُس کی عزت طلبی اور انکار ذلت سے اور تلوار کو اُس کی تیزی سے کچھ نسبت نہیں - دیگر -

مضت الدھور وما اتین بمثلہ ولقد اتی فعجزن عن نظرائہ

لغت نظراء نظیر کی جمع یعنی امثال -

حل - بہت سے زمانے گذر گئے مگر وہ ممدوح جیسا شخص پیدا نہ کر سکے اور جب ممدوح آگیا یعنی پیدا ہو گیا تو اب وہی زمانہ اُس کی امثال کے لانے سے عاجز ہیں یعنی ایسا شخص نہ تو پہلے پیدا ہوا نہ آئندہ ہوگا - لفظ نظراء جمع محض قافیہ کے واسطے لایا گیا ہے ورنہ نظیر مفرد کافی تھا جیسا کہ مصرعہ اُسی میں مثل مفرد ہے نہ کہ امثال -

حماسہ

انی علی ما قد علمت محسّدٌ اُحمی علی البغضٓ والشنآن

لغت محسد حسد کردہ شدہ - شنان عداوت -

حل۔ اے مخاطب جیسا کہ تو جانتا ہے۔ میں اپنے فضائل کے باعث لوگوں کا محسود ہوں تاہم نمو پا رہا ہوں۔ بڑھ رہا ہوں یعنے میرا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

ما تعتریني من خطوب ملمۃ الا نشر فتی وتعظم شانی

لغت۔ اعترا۔ پیش آمدن خطوب مشکلات۔ الما۔ نازل ہونا۔

حل۔ جو مصیبتیں مجھ پر نازل ہوتی ہیں میری بزرگی اور شان بڑھاتی ہیں کیونکہ میں ان کا متحمل ہوتا ہوں۔

فاذا نزلت زول عن متغطرط تخشی بوادرہ ولد الاقران

لغت تغطرط تکبر اور غضب بوآدر بادرہ کی جمع یعنی وہ فعل جو بغیر فکر اور غور کے صادر ہو۔ اقران قرن بالکسر کی جمع۔ وہ مخالفت جو درجہ میں مساوی ہو۔

حل۔ پس جب تو مجھ سے جدا ہوگا تو گویا ایسے مغرور اور خشمناک شخص سے جدا ہوگا۔ جس کی جلد بازیاں ہمسروں کے نزدیک خوف ناک ہیں۔ کم درجہ والوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ یعنی میں اپنے ارادے کا پکا اور بہادر ہوں۔

انی اذا اختفے الرجال وجدتنی کالشمس لا تخفی بکل مکان

حل۔ جب لوگ خوف وغیرہ کی وجہ سے چھپتے پھریں تو مجھے آفتاب کی طرح پائے گا جو کسی مکان میں نہیں چھپتا۔

الراقم مجدد السنہ مشرقیہ سید احمد حسن شوکت۔ میرٹھ

جزائے خیر

پہلا باب

آواز - (دردناک لہجے میں) میم صاحب! مس صاحب! خدا کے واسطے میری بات سنو -:

یہ دردناک آواز باورچیخانہ کے کٹہرے کے باہر سے آئی تھی اور سننے والی ایک پانزدہ سالہ مہ پارہ تھی جو جلدی جلدی کھانے کا سامان تیار کر رہی تھی - آواز کے سنتے ہی اُس نے کٹہرے کی جانب آنکھیں اُٹھائیں - دیکھا کہ ایک لم تڑنگا جوان سر سے پاؤں تک میلے کچیلے پوتڑے کپڑے پہنے ہوئے کھڑا ہے - صورت پر وحشت برس رہی ہے - چہرہ بھوکوں کے مارے تمتما سا نکل آیا ہے - آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے ہیں - اور جسم سوکھ کر ٹھنڈا ہو گیا ہے - خدا جانے لڑکی کے دل میں ایکا ایکی کیا خیال گزرا کہ کھڑی ہو گئی اور کچھ بولنا چاہا لیکن دل میں اس شوکھے سہمے شخص کو دیکھ کر ایسا دھڑکا بیٹھا کہ کچھ کہنا تو درکنار، اتنا بھی نہ ہو سکا کہ یہاں سے چلی جائے - بلکہ جہاں تھی وہیں کی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی - گویا تھم گئی تھی - حیرت اور خوف کے آثار تیور سے ظاہر ہو رہے تھے - اور اس عجیب شخص کیطرف برابر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی -

اس وقت شام ہو چلی تھی اور دوسرے دن تھا کرسمس ڈے (بڑا دن) لڑکی کو جس کا نام امیّن تھا دوسرے دن کے لئے بہت کچھ سامان تیار کرنا تھا - مذکورہ بالا

شخص وضع قطع سے فقیر معلوم ہوتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ بالخصوص لندن کے باشندے فقیروں کو دیکھ کر کانپ اٹھتے ہیں اور انکے دل میں ایسی نفرت کے خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ بیچارے فقیروں سے بات تک کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے آلین اس فقیر کو دیکھ کر کانپ اٹھی۔ اور اگر فقیر کے اور آلین کے درمیان کٹہرہ حائل نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ از دیاد خوف کی وجہ سے بیہوش ہو جاتی۔

جب فقیر نے آلین کو ایسا سہما ہوا پایا تو بولا "مس صاحب مجھ کو دیکھ کر ڈرو نہیں۔ میں بیچارا لاچار محتاج ہوں۔ میری وجہ سے تمہارا بال تک بیکا نہ ہوگا۔ میں کل تمام رات اور آج سارے دن باہر ہوا میں پڑا رہا جس کی وجہ سے میرا جوڑ جوڑ اینٹھ گیا ہے۔ آپ خدارا مجھے ایک پیالہ چاے کا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ نہیں تو میں بس اب گھڑی ساعت کا ہوں۔"

ان الفاظ میں ایک فوری اثر تھا جس نے آلین کے دل سے خوف وحشت اور اندیشہ دور کیا۔ اور اب اندیشے کی بجائے اس کے دل میں رحم کا دریا موجیں مارنے لگا۔ لڑکی کا چھوٹا سا دل اس خیال سے کڑھا کہ دنیا میں ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جو فاقے کرتے کرتے قریب مرگ ہے اور جس کے پاس ذرا کر سیدھی کرنے کے لئے بستر بھی نہیں ہے۔

فقیر نے پھر عاجزی سے کہا: "مس صاحب! از برائے خدا مجھے چاے کا پیالہ اور روٹی کا ایک ٹکڑا دو۔ میری آتما تمہیں لاکھوں دعائیں دیگی۔"

اب فقیر کٹہرے کے بالکل قریب آگیا اور اس کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز موثر تھی اور برابر لڑکی کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جو سوال فقیر نے کیا تھا اس کا پورا کرنا کسی غریب کے لئے بھی کوئی دشوار کام نہ تھا اور پھر یہ گھر تو خدا

کی عنایت سے بھرا پڑا تھا۔ جب ایلن نے اپنے سامنے ایکطرف دنیا کی نعمتیں الماری میں چنی ہوئی دیکھیں اور دوسری طرف بیچارے فقیر کو دیکھا جو روٹی کے سوکھے ٹکڑے تک کو ترس رہا ہے تو بے چینی سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور زخم آلودہ نظریں فقیر کی طرف اُٹھائیں۔

ایلن کوئی غریب نہ تھی جس میں "روٹی کا ٹکڑا" اور "چاے کا پیالہ" بھی فقیر کو دینے کی توفیق نہ ہوئی۔ وہ اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی تھی اور بنگلہ جس میں وہ رہتی تھی عجب شاندار تھا۔ اور خوردنی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کو اسباب کا علم تھا کہ چاے تیار ہے اور بچی کھچی روٹی بھی میز پر رکھی ہے۔ اس کو فقیر کی حالت پر ترس پر ترس آ رہا تھا۔ فقیر کا سوال بھی کچھ ایسا لمبا چوڑا نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اِس سوال کو پورا نہ کر سکی۔!!!

افسوس! غریب ایلن اِس گھر کی مالکہ نہ تھی اور اُس کو اتنا بھی اختیار نہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کو روٹی کا ٹکڑا دے سکتی۔ گھر پرایا تھا اور گھر کا سب سامان پرایا۔ در اصل مالکہ ایک بوڑھی عورت تھی جس کا نام مس گرائمز تھا۔ بیچاری ایلن صرف روٹی کپڑے اور برائے نام تنخواہ پر نوکر تھی۔ کام کچھ مقرر نہ تھا۔ مس گرائمز اِس سے جو کام اور جو خدمت بھی لینا چاہتی تھی۔ لیتی تھی۔ اِس کو چون و چرا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اور یہی بیچاری چونکہ مسکین تھی اور جواب دینا نہ چاہتی تھی اس لئے اکثر مس گرائمز کے غصے کے تیروں کا نشانہ بنتی تھی۔ غرض بیچاری صبح تڑکے تڑکے سے لے کر آدھی رات تک پلتی تھی اور کام کرتے کرتے تھک جاتی تھی لیکن پھر بھی مس گرائمز کی ناک ٹیڑھی ہی رہتی تھی۔

اب اگر یہ جا کر مس گرائمز سے کہتی کہ ایک فقیر تھکا ماندہ بھوکا پیاسا باہر سے حال کھڑا تمہارا روٹی کا ٹکڑا اور چاے کا پیالہ مانگ رہا ہے دیدوں یا نہ دوں؟" تو بس غضب ہی ہو جاتا۔ مس گرائمز فرطِ غضب سے جامہ سے باہر ہو جاتی اور ایسی کہنی ان کہنی

باتیں کہتی کہ اس کو اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا۔ اور اس سے بھی زیادہ اندیشہ آئلین کو اس بات کا تھا کہ مبادا مس گرائمز پولیس کو بلوا کر فقیر کو جیل خانہ بھجوائیں۔ اور پھر بیچارے فقیر کو اور بھی زیادہ مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ میں تو یہ کام کروں نیکی کے خیال سے وہاں اُلٹی آفتیں گلے پڑیں۔ اور پھر مجھ پر یہی مثل صادق آسکے۔ "نیکی برباد گناہ لازم"

جبکہ آئلین ان خیالات میں مستغرق تھی فقیر پھر درد انگیز لہجے میں بولا "میرا حلق خشک ہوگیا ہے۔ میں بھوکا پیاسا ہوں۔ مس صاحب! مجھے کچھ جلدی دو"

اب فقیر نے لڑکی کے شرمیلے چہرے کیطرف متجسسانہ نگاہ ڈالی۔ اور اس کے پیارے پیارے چہرے، سرخ ہونٹ، اور سیاہ چمکدار گھونگریالے بالوں کو دیکھ کر اپنے خیالات میں کچھ ایسا از خود رفتہ ہوا کہ ایک لمحے کے لئے اس کو اپنی بھوک پیاس کا کچھ بھی خیال نہ رہا۔

آئلین نے گہرا سانس بھرا اور اب اس نے بڑی جان جوکھوں کا کام کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس نے خیال کیا کہ مس گرائمز ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے کبھی نیچے نہیں اُترتی ہے۔ اس لئے اس کے نیچے آنے سے پہلے ہی اگر فقیر کھلا پلا کر روانہ کردیا جائے گا تو مس گرائمز کے فرشتے خان کو بھی خبر نہ ہوگی کہ میں نے کیا کیا۔ چنانچہ آخرکار وہ بول اٹھی: "میں تیرے لئے ابھی کچھ کھانے پینے کو لاتی ہوں۔ دیکھ! وہ جھاڑی وہی سامنے۔ اس میں چھپ کر بیٹھ جا۔ میں ابھی جو کچھ مجھ سے بن سکا لئے آتی ہوں"

فقیر: "مس صاحب! خدا تمہاری خیر رکھے"

اتنا کہہ کر فقیر جلدی سے جھاڑی میں جاکر چھپ رہا۔

. . . .

. . . .

آیلن نے ایک بڑے پیالے میں چاء بھری اور ایک طشتری میں روٹی اور مکھن رکھا اور چھپ کر چپکے سے یہ چیزیں لے کر باورچیخانے کے باہر چلی گئی۔ اس نے جھاڑی میں گھسکر فقیر کو جلدی سے اور ہانپتے ہوئے چاء، روٹی اور مکھن دے دیا اور یوں بولی:۔

ایلن "لے چاء پی اور خوب مزے سے روٹی مکھن کھا۔ جب کھا چکے تو طشتری اور پیالہ جھاڑی میں چھوڑ کر چلا جائیو۔ میں آکر لے جاؤنگی"۔

ایلن "کیا خبر مجھے کب فرصت ملے۔ اور میں کب آسکوں۔ کیا اتنی دیر میری انتظار کرے گا اور کہیں نہیں جائے گا؟"

دوسرا باب

"مس ایلن! تم کہاں گئی تھیں اور کیا کرنے گئی تھیں؟"

آیلن ابھی جھاڑی میں سے پوری نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ اپنے سامنے مس گرائمز کو کھڑا دیکھا۔ اور یہ مس گرائمز نے ہی سختی سے پوچھا تھا کہ "مس ایلن! تم کہاں گئی تھیں اور کیا کرنے گئی تھیں؟"

اپنی مالکہ کی آواز سنکر آیلن کی سٹی گم ہو گئی اور کچھ جواب بن نہ آیا۔ خوف کے مارے سر سے پاؤں تک بید مجنوں کیطرح تھرتھرا رہی تھی اور سوچتی جاتی تھی کہ ہیں! اس وقت مس گرائمز کیسے آنکلیں۔

مس گرائمز غصے کے مارے آگ بھولا بنی ہوئی تھی۔ جب اس نے ایلن کو خاموش دیکھا۔ تو اس کو اور بھی طیش آیا اور جھلا کر پھر پوچھا۔

گرائز: "شستی ہو۔ میں کیا بک رہی ہوں۔ بتاؤ۔ تم کہاں گئی تھیں؟"

ایلین نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور سر چکرایا۔ قریب تھا کہ وہ تیوراکر گر پڑتی لیکن جھاڑی کی ایک ٹہنی ہاتھ میں آگئی اور اس کو پکڑ کر سنبھلی۔ مس گرائز نے ایلین کو ایک طرف کو دھکیل دیا اور خود جھاڑی کے اندر گئی۔ دیکھا کہ ایک فقیر بیٹھا ہے اور سامنے طشتری میں روٹی مکھن اور چاے کا پیالہ رکھا ہے۔ فقیر نے ابھی کھانے کو چھوا تک نہ تھا۔ وہ چپکا بیٹھا تھا اور مس گرائز کا نزلہ جو کچھ ایلین پر اترا تھا سن رہا تھا۔

مس گرائز۔ (جھنجھلا کر) آہا! بہت خوب! آپ یہاں اور اس فقیر کی خاطر تواضع میں مصروف تھیں!

اب تو تم ایسی سخی ہو گئی ہو کہ حاتم کی قبر پر بھی لات مار دی۔ مس ایلین! تمہیں ذرا شرم نہیں آتی کہ تم میرا مال اسطرح لٹا رہی ہو کیا ایمانداری اسی کو کہتے ہیں؟ کیا دیانت داری کے یہی معنے ہیں؟ کیا اپنی مالکہ سے وفاداری کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ کیا میری مہربانیوں کا یہی بدل تھا؟ کیا تمہیں بچوں کیطرح پالنے کا آخری نتیجہ دیکھنا میری تقدیر میں تھا؟ افسوس! تم میرے لئے مار آستین ثابت ہوئیں۔ افسوس! تم انسانی انسانی جامے میں در اصل بھیڑیا ثابت ہوئیں۔ تمہاری یہ گوری چٹی صورت اور یہ شیطانی سیرت! حیف ہے حیف! بس اب تمہاری خیر اسی میں ہے کہ اپنا بوریا بدھنا باندھ کر یہاں سے اپنا منہ کالا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم ایسی غدار کو ایک لمحہ بھر بھی اپنے ہاں رکھوں۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ تمہاری ان بری عادتوں کا اثر بد میری اور خواصوں پر بھی پڑے گا۔ اس لئے یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔ تھوڑی دیر میں گیارہ بجے کی ریل جائے گی اس میں بیٹھ کر جہاں تمہارے سینگ سمائیں چلی جانا۔ اب میرے ہاں تمہارا کچھ کام نہیں۔ میں تم

جیسی وغیرہ دلیر لڑکیوں کو اپنے پاس رکھنے سے باز آئی۔

مس ایلین اس لعن طعن سے ندامت کے مارے زمین میں گڑھی جاتی تھی - فقیر بیچارا بھی یہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن اس پرمس گرائمز کا ایسا رعب چھایا کہ منہ سے آواز تک نہ نکلی - ایک دفعہ فقیر نے کچھ کہنا بھی چاہا تو مس گرائمز نے ڈپٹ کر کہا:۔

مس گرائمز (فقیر سے) یہاں سے ابھی اسی دم چلے جاؤ - میری کوٹھی کے احاطے میں تمہیں ناجائز طور پر اس طرح چلے آنے کا کونسا اختیار تھا - جاؤ ورنہ میں ابھی تم کو پولیس کے حوالہ کرتی ہوں "

یہ سنکر فقیر جھاڑی میں سے نکل کر ایسا بھاگا کہ سڑک پر پہنچ کر ہی دم لیا ۔

تیسرا باب

رات کے گیارہ بجے ہیں - ریل ایک مہیب گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہوئی - بیچاری ایلین اپنا مختصر سا اسباب اٹھا کر ایک درجے میں جا بیٹھی - اس کا چہرہ غم و رنج کی وجہ سے اتر گیا تھا - ہاتھ پاؤں میں جلن ہو رہی تھی - اور ہر چند اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے پڑتے تھے لیکن وہ اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ضبط کر رہی تھی - اس کے دل میں مختلف اصناف کے خیالات گزر رہے تھے اور وہ اپنے دل ہی دل میں یوں باتیں کر رہی تھی۔

ایلین ہے افسوس میں نے ہر چند مس گرائمز سے کہا کہ میرا یہ ارادہ تھا کہ تمہارا ناحق طور پر نقصان کرتی بلکہ میں نے یہ سوچا ہوا تھا کہ چونکہ میں نے فقیر کو تمہاری بغیر اجازت

کھانا کھلا دیا ہے اِس لئے تو آج آدھے پیٹ کھانا کھاؤ گی۔ اور اسطرح تمہارا معمول سے زیادہ خرچ کسی حالت میں نہ ہوگا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا مگر اس اللہ کی بندی نے میری ایک نہ مانی۔ بلکہ میری اِس بات پر ایک قہقہہ مارا اور بولی تو یہ بولی کہ لڑکی! کیا تو مجھے باتوں میں اڑانا چاہتی ہے۔ میں نے یہ چونڈا دھوپ میں سفید نہیں کیا ہے۔ تجھ جیسی چھتیسیاں ہزاروں میرے ناخونمیں بھری پڑی ہیں۔ آئی وہاں سے مجھے بھی فقرہ دینے۔ چل نکل میرے گھر سے" کس قدر افسوس کے قابل ہے ہماری یہ غلامانہ زندگی۔ ہم اپنے مالکوں کی نازبرداریاں کرتے کرتے مر جاتی ہیں۔ ہم اُنکی جا و بے جا سخت و سست باتیں سنتی ہیں۔ اُن کے طعن و تشنیع رات دن کلیجے کو چھلنی کرتے ہیں لیکن ہم چوں تک نہیں کرتیں۔ اس مثل کے موافق کہ " الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" ہم سے بھی آخر بھول چوک ہو ہی جاتی ہے اور کبھی نہ کبھی کام بگڑ ہی جاتا ہے تو بجائے اِس کے کہ ہمارے آقا چشم پوشی کریں اور سمجھیں کہ کام کرنے والے سے دس کام سدھریں گے تو ایک بگڑے گا بھی۔ وہ ہم پر لعن طعن کرتے ہیں۔ جرمانہ کرتے ہیں۔ سختیاں کرتے ہیں۔ مظالم روا رکھتے ہیں۔ سزائیں دیتے ہیں۔ کیا تو نگوڑی پانچ چھ روپلی تنخواہ کی حقیقت، اور اُس پر جرمانے بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ظلم ہے ظلم یا اللہ! تو ہم کو پرند بنا دیتا لیکن کسی کی لونڈی نہ بناتا۔ تو ہم کو چاہے موری کے کیڑے کی جون میں پیدا کر دیتا۔ لیکن یہ دن رات کی سختیاں اور بات بات میں نکتوڑے سہنے کے لئے کسی کی خادمہ ہرگز نہ بناتا۔ افسوس! ہم اپنے ظالم، بے رحم، ناخدا ترس آقاؤں کو کیونکر کہیں کہ تم ہزار بار ڈھال لگاڑ کرتے ہو۔ بعض اوقات بنے کام کو ایسا بگاڑتے ہو کہ ملیامیٹ کر دیتے ہو۔ اُس وقت کیا کبھی وہ بھی پشیمان ہوتے ہیں اور اپنے اوپر نفرین کرتے ہیں یا اپنے آپ کو کوئی سزا دیتے ہیں؟ جواب یہی دینا پڑے گا کہ "نہیں"! پھر بھلا سوچنے کی بات ہے کہ جب وہ بھی غلطی سے خالی نہیں اور دنیا کا کوئی شخص بھی غلطی سے خالی نہیں

تو اگر کبھی ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو وہ کس لئے آگ بگولا ہو جاتے ہیں ؟ میں نے ایک بیچارے مفلوک الحال فقیر پر ترس کھا کر کچھ کھانے کو دے دیا تو کونسا غضب کیا۔ اُن کی گرہ سے کیا جاتا تھا۔ میں اپنے حصے میں سے چاہے سو کو بانٹ کے کھاؤں کسی کا کیا اجارہ ہے۔ لیکن مس گرائمز کے دماغ میں حکومت کی بو ایسی سمائی ہے کہ نہ کچھ سنتی ہیں نہ سمجھتی ہیں بس غصے ہونے سے مطلب ہے۔ میں ہی وال ہوں کہ اُن کے ساتھ اتنے عرصے نبھایا۔ کھوٹی کھری سنی مگر کبھی جواب تک نہ دیا۔ اور کوئی اگر اُنکے پاس اتنے عرصے رہے تو ٹانگ تلے سے نکل جاؤں۔ اے خدا! تو دیکھتا ہے کہ میں نے فقیر کے ساتھ نیکی ہی کی تھی۔ کیا تیرے ہاں یہی انصاف ہے کہ نیکی کا بدلہ بدی دیا جائے میں یہ نہیں کہتی کہ تو مجھے نیکی کا بدلہ نیک دیتا۔ اور نہ میں نے نیکی اِس خیال سے کی تھی کہ مجھے اِس کی جزائے خیر ملے۔ کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ نیکی نیکی کی خاطر کرنی چاہئے دنیا میں کوئی نیک کام اِس خیال سے نہیں کرنا چاہئے کہ اگر ہم کسی کے ساتھ سلوک کرینگے تو ہمیں اسی دنیا میں یا مرنے کے بعد عیش و عشرت کے سامان ملینگے۔ بلکہ میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ ہر شخص کو نیکی کرنا اپنا فرض قرار دینا چاہئے۔ اور صرف باعتبار فرض کے نیکی کرنا چاہئے۔ مجھے نیکی کا بدلا نیک نہ ملے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن میں اِس بات کے لئے تیار نہیں ہوں کہ نیکی کے عوض بدی ملے۔ جیسا کہ مجھے ملا ہے۔ افسوس! صد افسوس!!

ایلین انہی خیالات میں مصروف تھی کہ گھڑیال نے صبح کے پانچ بجائے۔ اور ریل لندن کے اسٹیشن میں جا داخل ہوئی۔ یہ اسٹیشن پر اُتری اور لندن کے مختلف بازاروں میں سے گزر کر ایک جنگل میں پہنچی۔ یہاں چند نیچے نیچے مکان پیلی اینٹ کے بنے ہوئے تھے۔ اِن مکانوں کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا وہ اِس نے کرایہ پر لے لیا۔ اور اسباب زمین پر پٹخ کر ایک چارپائی پر منہ اوندھا کر پڑ رہی۔ اُس کے چہرے کی گلابی۔

رنگت اُڑ گئی تھی اور اب بالکل سفید دھویا ہوا کپڑا نکل آیا تھا۔ رخساروں پر سیاہ زلفیں
پڑی ہوئی تھیں جن کے مقابلے میں چہرہ اور بھی سفید معلوم ہوتا تھا۔ اب رہ رہ کر اُسکے
دل میں یہی خیال پیدا ہو رہا تھا کہ میں اپنی زندگی کیونکر بسر کرونگی؟ اُس کے بٹوے
میں فقط دو شلنگ تھے۔ لندن میں اُس کا کوئی مالدار رشتہ دار بھی نہ تھا۔ صرف ایک
بہن تھی جس کا خاوند پادری تھا۔ اُن کا کنبہ قبیلہ بڑا تھا۔ اور آمدنی قلیل تھی۔ اسلئے
اُنکا اپنا گزارہ بہ مشکل ہوتا تھا۔ پھر بھلا وہ مس ایلین کے اخراجات کے کفیل کیونکر ہو سکتے
تھے؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر دو شلنگ خرچ ہو گئے اور کوئی نوکری نہ ملی تو پھر میں کیا
کرونگی؟ یہ بڑا دن اور لوگوں کے لئے خوشی کا دن تھا لیکن اس غریب دوشیزہ کے
حق میں مصیبت کا دن تھا۔

اب سُنئے کہ ایلین اسی بیم و رجا کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ یکایک دروازے
کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ یہ سمجھی کہ شاید مالکۂ مکان گھر کا کرایہ پیشگی لینے کو آئی ہے۔
منہ بنائے ہوئے اُٹھی اور کواڑ کھولے۔ دیکھا کہ ایک دوشیزہ لڑکی سامنے کھڑی ہے۔
اس لڑکی کا چہرہ سانولا تھا اور صورت سے متانت ٹپکتی تھی۔ لڑکی نے ایلین سے
بے اختیار یہ کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو نیکی کا اجر بہت برا ملا۔ اور آپ کے
ساتھ بڑی بدسلوکی کی گئی"۔ یہ سنکر ایلین نے لڑکی کے چہرے کیطرف حیرت سے
دیکھا اور سوچنے لگی کہ یہ کون ہے؟ اُس نے یہ کیونکر جانا کہ میرے ساتھ بدسلوکی ہوئی ہے
اُس نے دل میں خیال کیا کہ شاید میں خواب دیکھ رہی ہوں کیونکہ کسی اور شخص کو اُسکی
مصیبت کا کچھ بھی حال معلوم نہ تھا اور نہ اب تک اُس نے کسی کو اپنی رام کہانی سنائی
تھی۔

ایلین کو اس طرح حیرت زدہ دیکھ کر لڑکی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور کہا:۔
لڑکی۔ تم شاید اِس بات سے متعجب ہوگی کہ مجھے تمہارا سارا حال کہاں سے معلوم

ہُوا؟ تم مہربانی کر کے میرے ساتھ میرے گھر تک چلو وہاں چل کر پہلے تھوڑی سی چاء پی لو پھر میں تمہیں بتاؤنگی کہ مجھے تمہاری نسبت کس سے خبر ملی تھی؟"

لڑکی کی سادگی اور مہربانی کا اثر ایلین کے دل پر ایسا ہوا کہ وہ اس کے ساتھ چلنے کو رضامند ہو گئی کچھ کم آدھ گھنٹے میں یہ دونو کوٹھی پر پہنچیں جو ظاہری شان وشوکت سے ایک امیر کا محل معلوم ہوتی تھی۔ دروازے سے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئیں۔ جہاں چاء پینے کی میز بچھی ہوئی تھی اور ایک دراز قامت شخص میز کے سرے پر کرسی بچھائے بیٹھا تھا۔ اس شخص کا جسم چھریرا تھا۔ چہرے سے سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے اور رنگت سانولی تھی۔ صورت شباہت میں لڑکی یعنی ایلین کی نئی سہیلی سے ملتا جلتا تھا۔ یہ شخص لڑکی کا حقیقی بھائی تھا اور یہی اس محل کا مالک تھا۔ اس امیر نے چاء کا پیالہ ایلین کو دے کر کہا:۔

امیر:۔ شاید یہ چاء ایسی اچھی نہ ہو جیسی کل شام کو تم نے مجھے پلائی تھی؟"

یہ سنکر ایلین اچھل پڑی اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ امیر اور امیر کی بہن پھر قہقہہ مار کر ہنسے۔

امیر:۔ اب تم سمجھیں کہ فقیر میں ہی تھا۔ اور فقیروں کی زندگی کے راز معلوم کرنے کے لئے میں نے فقیری بانا پہنا تھا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں یہ جانتا تھا کہ تم گیارہ بجے رات کے روانہ ہو گی۔ اسی گاڑی سے میں بھی روانہ ہوا تھا اور پھر تمہارے پیچھے پیچھے اس مکان تک گیا تھا جہاں تم نے قیام کیا ہے۔ یہاں واپس آکر میں نے اپنی پیاری بہن کو اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ تم کو اپنے ہمراہ لے آئے"۔

لڑکی ہمدردی سے:۔ اب تم اپنا اسباب یہاں منگوا لو اور یہیں ہنسی خوشی

ایلین نے اس سال بڑا دن ایسی خوشی سے گزارا کہ اس سے پہلے کبھی اس کو ایسی خوشی منانی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اور مایوسی کے تمام خیالات چشم زدن میں کافور ہو گئے امیر کی وجہ سے اس کو ایسے تزک و احتشام کے جلسوں اور رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا کہ جہاں اگر مس گرائمز چلی جاتیں تو بس دروازے سے ہی دھتکار دی جاتیں۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ ایلین کو نیکی کا بدلا ایسا ملے کہ دنیا کے تمام لوگوں کو پھر نیکی کرنے کا حوصلہ ہو۔ اس سے بھی زیادہ جزائے خیر یہ ملی کہ بارہ مہینے کے بعد پھر بڑا دن آیا اور ایلین کے لئے وہ بہت بڑا دن ہوا۔ کیونکہ اس دن اس کی شادی میزبان امیر کے ساتھ رچائی گئی۔ یہ امیر ایسا صاحب حشمت و جاہ تھا کہ شہر کی بہت سی امیر امیر گھرانے کی لڑکیاں اس سے بیاہے جانے کی خواہشمند تھیں۔ لیکن ایلین کا ایسا نصیبہ جیتا کہ سب کی سب ہاتھ ملتی رہ گئیں اور اب وہ جس مکان میں مہمان تھی اس کی مالکہ بن گئی۔ اور ایسے امیرانہ ٹھاٹھ سے رہنے لگی کہ مس گرائمز سے زیادہ مالدار عورتیں تو ہر وقت اس کے آگے پیچھے خدمت کے لئے کھڑی رہتی تھیں۔

ڈپٹی لال نگم بی۔ اے

کام دنیا میں بہت کرنا ہے	قبل مرنے کے ہمیں مرنا ہے
آئیے نزع کا ہنگام ہے اب	مشورہ آپ سے کچھ کرنا ہے
دل نے یہ کہکے کہیں چھوڑا ساتھ	ہم کو کچھ کام یہاں کرنا ہے
قتل کرنے میں تکلف نہ کرو	آخر اک روز ہمیں مرنا ہے
تجھ سے اک روز کرینگے نقشہ یہ	اپنی باتوں میں اثر بھرنا ہے
تمکو دکھلائینگے دل کی تصویر	جا بجا رنگ ابھی بھرنا ہے
روک لو گریۂ خونیں کو عزیز	دل کے ناسور ابھی بھرنا ہے

جانِ عالم کی شاعری

شاہی مشاعرے نہایت شان و شوکت اور دھوم دھام سے ہوتے تھے لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گل و فوارہ کی ہوتی تھی کمرے میں تمام سامان عیش تیار ہوتا تھا دریچیاں سبز سرخ کاشانی مخمل کی جن میں گز گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹکی ہوتی چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے جھاڑ جھابے کنول فانوس شام سے روشن ہو گئے پردوں میں بنت گوکھرو لچکا ٹنکا ہوا چاروں طرف قد آدم آئینہ بندی مشاعرے عام نہ ہوتے تھے مشاعرے میں ہمیشہ اہل دربار شریک ہوتے تھے اور کبھی خاص اعزا بادشاہ بھی مدعو ہوتے تھے۔

شام سے مرزا خورم بخت بہادر نواب یحییٰ علی خاں مرزا عظیم الشان نواب محمد تقی علی بہادر مرزا رفیع الشان بہادر نواب مجید الدولہ عظمت الدولہ مرزا سلیمان قدر بہادر عالی سطوت مرزا حیدر شکوہ پوری تشریف فرما ہوئے اور اپنے اپنے مراتب کے موافق دہنے بائیں بیٹھے بیچ میں مسند پر بادشاہ جلوہ افروز ہیں۔

خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری لچکہ گوکھرو کے ہار الائچیاں چکنی ڈلیاں عطر کے کنٹر رکھے ہوئے مخملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگا گئے۔ ملازمین اٹھالے گئے۔

اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا ہر ایک نے غزل پڑھی اور یہ پر لطف صحبت بارہ بجے شب تک ختم ہو گئی اہل دربار کا مشاعرہ ہر مہینے ہوا کرتا تھا اور یہ صحبت بہت ہی پاکیزہ اور پر لطف ہوتی تھی۔ گرمی کے دن ہیں شام سے لال بارہ دری کی چھت پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے قناتیں گھیری جاتی ہیں پھولوں کے گلدستے سنگھیروں پر رکھے جاتے ہیں تکلف

فرش بچھایا جاتا ہے۔ قناعتوں پر سلمے کے ہار پھیلے ہوئے ہیں اہل دربار اپنے اپنے قرینے سے مؤدب بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ مدار الدولہ علی نقی خاں بہادر وزیر یہ کون ہیں؟ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں برق۔ یہ کون ہیں؟ آفتاب الدولہ خلق یہ کون ہیں؟ تدبیر الدولہ دبیر الملک منشی مظفر علیخاں بہادر جنگ اسیر۔ یہ کون ہیں معقول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا احمد علیخاں ثابت جنگ قبول اسیطرح تمام درباری تشریف لائے اور اپنی اپنی جگہ پر فروکش ہوئے اتنے میں حضور جانعالم برآمد ہوئے تمام اراکین سلطنت سروقد کھڑے ہوئے اور بسم اللہ بسم اللہ کی صدا چہار طرف سے آنے لگی حضور مسند زرنگار پر باجاہ وجلال جلوہ افروز ہوئے مشاعرہ دہنی طرف سے شروع ہوا اور مختصر غزلیں پڑھی گئیں علےقدر مراتب ہر ایک کی تعریف ہوئی سب کے بعد حضور نے اپنا کلام پڑھا اور مشاعرہ برخاست ہوا یہ تو سال اور امرا شہر کے بہت سے مشاعرے ہوتے تھے مگر حضور کبھی کسی مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے فتح الدولہ برق نے اور منشی اسیر نے بادشاہ کی اکثر غزلوں پر مصرعے لگائے ہیں جو مشہور عام ہیں یوں تو بادشاہ کا کلام بہت ہے مگر اس وقت ہمارے سامنے کلیات مبارک ہے۔

حمد باریتعالے

تری الفت میں ہر سلطاں کو رتبہ ہے گدائیکا ۔۔۔ سوا تیرے کسے زیبندہ ہے دعوے خدائی کا

لگی ہو چوٹ جسکو عشق کی باتوں میں اچھا ہو ۔۔۔ زباں نے خاصہ پیدا کرلیا ہے مسیحائی کا

ولہ

پابند دل ہوا جو تمہارے خیال کا ۔۔۔ ہر دم ہے پیش چشم تصور جمال کا

ولہ

ہر عاشق دل سوختہ دیوانہ ہے اسکا ۔۔۔ وہ شمع تجلی ہے یہ پروانہ ہے اس کا

ولہ

بخش دیگا نامۂ اعمال کو ربِّ کریم دستِ عصیاں میں جو تو اپنا لکھا ئے جائیگا

عارض کی صفت

عارضِ صاف ترا رشکِ قمر دیکھ لیا جان سی آگئی جب ایک نظر دیکھ لیا
جو شب کو کوٹھے پہ وہ چاند بے نقاب آیا چھپا ہلالِ فلک اسقدر حجاب آیا

ولہ

بیاضِ رخ سے آئینہ کی قلعی کھل گئی بالکل سوادِ زلف پر دھوکا ہوا ہے مجکو سنبل کا
آنکھیں سرِ نرگس ہیں رخسار رخِ گل ہیں چھوٹا ہے ہونٹوں کو یہ سیبِ ذقن تیرا
رخ اپنا ہم کو دکھلایا تو ہوتا ذرا سورج کو شرمایا تو ہوتا
گالوں پہ جو مسّی یار کے بالا نہیں رہتا دن کو کبھی مہتاب پہ ہالا نہیں رہتا

ولہ

اے آفتابِ حسن ترا آفتابہ ہے سورج کو منہ دھلانے کا لوٹا بنا دیا

زیور کی تعریف

کان کی بالی سے دل چھید کر ہوا ہے خار دار ناک کا تنکا ہماری آنکھ میں کھٹکا کیا

عشق و محبت

الفت نے تری ہمکو تو رکھا نہ کہیں کا دریا کا نہ جنگل کا سما کا نہ زمیں کا

ولہ

مری زبان سے پوچھو مزا محبت کا یہ خوب جانتی ہے ذائقہ محبت کا
نصیب فتح ہوا ہو نہ مجھے شکستِ اختر خدا بچائے ہوا سامنا محبت کا

ولہ

دلِ گویا کو ترے عشق نے خاموش کیا یاد غیروں کی ہوئی مجکو فراموش کیا

محبت کا بندہ بنا لیجئے گا
مرا دل بھی نامِ خدا لیجئے گا
ابھی امتحانِ محبت نہ کیجے
کبھی تیغ سے آزما لیجئے گا

ولہ

میرا پتلا بنا دے لے خدا الفت کی مٹی کا بتو نسے تا نہ رہجا کوئی پھر حوصلہ جی کا

دل کی حالت

عجیب کوچہ ہے اپنے جی کا کہ پاؤں ٹکتا نہیں خوشی کا
پتا نہیں اس کی دل لگی کا یہ دل بھی معشوق ہے کسی کا

ولہ

بلاؤ دل جو بگاڑا بنائے گا پھر کیا؟ اُجاڑتا ہے رعیت بسائیگا پھر کیا؟

ولہ

اتنی چاہت سے بھی دل بے سر و ساماں ہوگا راحتِ کم کے سبب رنج فراواں ہوگا

ولہ

دل ہدف ہوگیا ہے تیر کے سبحان اللہ کیا کماندار تھا وہ اور نشانہ کیا تھا

ولہ

آنسو بہے رخسار پر دل نے مجھے رسوا کیا

دنیا کی ہوس

ہوس بڑھتی ہے اتنی جسقدر یہ عمر گھٹتی ہے ضعیفی کہہ رہی ہے کوئی کمسن ہو تو میں آؤں

ولہ

ولہ

گئی بہار نہ کر الفتِ زن و فرزند خزاں چمن میں ہوئی موسمِ خضاب آیا

ولہ

طالعوں نے پست کی آخر بلندی حرص کی دفن ہمراہ خزانہ آپ بھی قارون ہوا

فلک کی شکایت

ارمان دل میں رہ گئے بوس و کنار کے کیا چرخ نے بٹھا دیا مجھکو اُبھار کے

متفرق

اندھیرا بزم میں تھا تو جو انجمن میں نہ تھا چمن اُداس تھا اے گل جو تو چمن میں نہ تھا
ابھی لگاتے تھے مہندی جو تم گلستاں میں تمہارا پاؤں سے سر دل میں تھا لگن میں نہ تھا
غرور کا جو کیا اہتمام اختر پر کلام کبر زباں پر نہ تھا دہن میں نہ تھا

ولہ

آخر اُس بے مہر نے ناحق وفا کا دھیان ہے تو نے یہ کیسا خیالِ خام اے ناداں کیا

ولہ

نہ کیوں مرغِ بلبلِ شیراز مرقد میں پھڑک جائے جہاں قائل ہے اے اختر تمہاری خوش بیانی کا

ولہ

مجھی کو واعظا پند و نصیحت ذرا اُس کو بھی سمجھایا تو ہوتا

ولہ

کچھ لطفِ خوشی ہے نہ مجھے خوف الم کا حسرت ہے نہ راحت کی نہ ڈر کا ہے ستم کا
حیران ہوں کیا ان دونوں میں تمیز کروں ہستی کی تمنا ہے نہ کچھ خوف عدم کا

ولہ

زور سے غیر نے آکر در جاناں مارا ۔۔۔ دیو نے منہ پہ مرے تختِ سلیماں مارا

ان نگاہوں کے لئے مسا بہادر ڈھونڈھو ۔۔۔ دل کو مارا تو کوئی رستم دستاں مارا

ولہ

ہمارے سامنے جب شوخ مرلقا آیا ۔۔۔ گلے لگا لیں یہی دل میں بارہا آیا

ولہ

حیف ہے شہر خموشاں کا نہ کچھ حال کھلا ۔۔۔ نہ وہ صورت نہ وہ سیرت نہ وہ احوال کھلا

ولہ

در آیا جو سینے میں پھر غم نہ نکلا ۔۔۔ جو سمجھو تو مجنوں سے میں کم نہ نکلا

جسنے تجھے پیدا کیا ۔۔۔ اُسنے مجھے شیدا کیا

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی

کلامِ اقبال

ذیل کے اشعار آبدار کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے پچھلے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے اپنی دلگداز سریلی آواز میں پڑھ کر حاضرین کے دلوں کو گرمایا۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں ۔۔۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی ۔۔۔ مرے جرمِ خانہ سیاہ کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں ۔۔۔ نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

کوئی آج سلم خستہ جاں کو یہ جا کے پیرِ ایام دے ۔۔۔ جو وطن ہے دشمنِ آبرو تو اماں ہے ملکِ حجاز میں

تجھے کیا سنائیے ہمنشیں اجل اہے موت میں جو مزا ملا ۔۔۔ نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمرِ دراز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

ایک اور آفتابِ علم غروب ہو گیا

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ۳- مئی کی شام کو ہندوستان کے نامی گرامی فاضلِ اجل و عالم متبحر عالیجناب شمس العلماء ڈاکٹر حافظ مولوی نذیر احمد خاں صاحب دہلوی - ایل ایل - ڈی (ایڈنبرا) ڈی - او - ایل (پنجاب) چند روز کی علالت کے بعد یکایک عالم جاودانی کو سدھار گئے اور خویش و اقارب کے علاوہ سینکڑوں دوستوں اور ہزاروں مداحوں اور قدردانوں کو داغ مفارقت دے گئے - ابھی شمس العلما مولوی ذکاءاللہ صاحب و شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی موت کا غم تازہ ہی تھا - کہ مولنا نذیر احمد خاں صاحب کی رحلت کا غم اس پر مستزاد ہوا -

مولنائے مرحوم اُن چند گنتی کے بزرگوں سے تھے جو اس دور آخری میں خاک پاک دہلی سے پیدا ہوئے - ملک کے لئے موجب فخر بنے - اور اپنی شہرت کے ساتھ دہلی کی مٹتی ہوئی شہرت کو بھی تازہ کر گئے - آپ کا سن ولادت غالباً ۱۸۳۱ء ہے - مبداء فیاض سے آپ کو عقل سلیم و فہم مستقیم کے علاوہ غیر معمولی ذہانت عطا ہوئی تھی - چنانچہ اوائل عمر سے لے کر آخری عمر تک آپ نے مشاغل علمی میں زندگی بسر کی - علوم شرقیہ پر عبور کامل حاصل کیا - ادیبوں کی صفِ اولین میں جگہ پائی - اور زبان اردو کو جو انہیں اساتذہ دہلی سے میراث میں ملی تھی - درمیانی مراحل ترقی سے گزار - نصف النہار پر پہنچایا - اور عرش الکمال پر بٹھایا - آپ اردو پر فخر کرتے تھے - اور وہ آپ پر فخر کرے گی یہ امر کہ آپ جیسے بزرگوں ہی کی طفیل اب اردو زندہ اور کامل اور فصیح زبان کہلاتی ہے اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں -

مولٰنا کی تصانیف زبانِ اردو کا بہترین سرمایۂ ناز کہلانے کی مستحق ہیں۔ سبحان اللہ! کتابیں ہیں یا سلاست، نفاست اور فصاحت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ مختصراً یوں کہئے کہ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ اور قبولیت کا یہ عالم ہے کہ ملک کے کسی حصہ میں چلے جاؤ۔ اردو دان پبلک انہیں دلچسپی سے پڑھتی ہے۔ آنکھوں سے لگاتی ہے اور دل پر بٹھاتی ہے۔

ہندوستان پر ہی کیا منحصر ہے۔ آسمانِ شہرت کے اس آفتاب کی روشنی یورپ تک پہنچی ہے۔ توبۃ النصوح اور مرآۃ العروس جیسی نادر اور گرانمایہ کتابوں کا انگریزی، فرانسیسی اور جرمن میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور وہاں بعض یونیورسٹیوں اور محکموں نے انہیں اپنے امتحانوں میں داخل کیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مولٰنا کی بہترین تصنیف قرآنِ مجید کا با محاورہ اور سلیس اردو ترجمہ ہے جو قبولیت عام کا سہرا حاصل کر چکا ہے۔ اور جسکا بہترین صلہ انہیں درگاہِ ایزدی سے ہی مل سکتا ہے۔

مولٰنا سرکارِ انگلشیہ اور دولتِ آصفیہ میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ محکوموں سے خوش خلقی اور شریف النفسی کے باعث شکر گذاری کا خراج لیا۔ حاکموں میں حسن کارگزاری سے نام پایا۔ لوگوں میں اخلاق کی بدولت ہر دلعزیزی حاصل کی۔ پنشن پانے کے بعد آپ نے اپنا تمام وقت خدمتِ قوم اور یادِ الٰہی کے لئے وقف کر دیا۔ جب سر سید مرحوم نے خدمتِ قوم کا بیڑا اٹھایا۔ کوتاہ اندیش لوگوں نے انکی مخالفت شروع کی۔ لعن و تشنیع کے طومار باندھ دئے۔ تکفیر کے فتووں کے فتوے جمع کر دئے۔ اس وقت نذیر احمد خاں ان چند نیک نفس روشن ضمیر بزرگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے اس برق و بادِ فساد کے طوفان میں انکی رفاقت اور ہمراہی سے منہ نہیں موڑا۔

عدیم المثال ادیب ہونے کے علاوہ مولٰنا مرحوم اعلیٰ درجہ کے فصیح البیان مقرر اور طلیق اللسان سپیکر تھے۔ علیگڈھ کالج کی تحریک اور دیگر امورِ دینی و دنیاوی کے

لسلہ میں جو لکچر آپ نے مختلف حصص ملک میں دئے ہیں۔ وہ ادب اردو میں مستقل حیثیت
لمے اور لکچراری کا اعلےٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جن خوش نصیب لوگوں کو انجمن حمایت
سلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں مولٰنا کے لکچر سننے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں
سطرح وہ شیر عرصۂ فصاحت اور ہژبر میدان بلاغت کہ دم کے دلوں کو شکار کرتا۔ اپنا
لہ عظمت بٹھاتا۔ اور اپنی قابلیت کا لوہا منواتا تھا۔

مگر

آہ! نذیر احمد خاں! آج تو ہم میں موجود نہیں۔ مگر تیری تصویر ہماری آنکھوں میں ہے
ر تیری یاد ہمارے دل میں۔ تو مرا نہیں۔ تو زندہ ہے۔ بیشک تو ہماری ظاہری آنکھ سے
پوشیدہ ہے مگر چشم دل برابر تجھے دیکھ رہی ہے۔ آج تو بظاہر چپ ہے مگر تیری دردبھری
صدائیں ہمارے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ تیری کتابوں میں۔ تیرے لکچروں میں۔ تیرے
شعروں میں تیرے دل کی تصویر جھلک رہی ہے۔ اگرچہ تیرے جیتے جی ملک نے تیری
یہ کم قدر نہیں کی ہے۔ مگر عنقریب ایک زمانہ آنے والا ہے جب ہندوستان اپنے اہل کمال
ی صحیح طور سے قدردانی کرنی سیکھ جائے گا۔ اس وقت جب ارباب کمال کی یادگاریں
ایم ہونگی۔ تو ادب اردو کی صدارت کی کرسی پر بٹھایا جائیگا اور آنے والے اہل کمال تیرے
حضور میں مجرا بجالائینگے۔

مگر جا! عمر بھر تو بقائے قوم وزبان کے لئے جدوجہد کرتا رہا ہے تو تھک گیا ہے۔ جا! اور خوش ہوجا
خدا تجھے اپنے جوار رحمت میں جگہ دیگا۔ اور اس سے بڑھ کر تیرے لئے کوئی جگہ زیادہ قابل
تمنا نہیں ہوسکتی۔

(غلام محمد طور۔ ایم اے)

معاونین مخزن سے اطلاعاً گزارش ہے کہ ہم رسالہ کے بعض نقائص کو جنکی بابت ہمیں خود
شکایت ہے بشبانہ روز محنت اور عرقریزی سے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی

حیثیت سے اِس وقت ہمیں سخت خسارہ ہو رہا ہے۔ تاہم حتے الامکان ہم اِسے بہتر بنانے کی فکر میں ہیں اور ہمیں امید ہے کہ انشااللہ آئندہ دو تین ماہ کے اندر اندر ہی ہم اِسے سابقہ عروج پر پہنچا سکینگے۔ مگر یہ سب باتیں ہمارے معاونین قلمی و مالی کی دستگیری پر منحصر ہیں۔ ہم اپنا فرض بوجہ احسن پورا کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں حضرات معاونین کو بھی لازم ہے کہ اِس خوشنما اور پُر آب و تاب گلدستہ اردو کو جسکے نمونے پر بیسیوں گلدستے بنے۔ بگڑ گئے۔ اور بعض ابھی تک تر و تازہ ہیں۔ آبِ سیم و زر سے سیراب کرنے میں بخل سے کام نہ لیں۔

ہماری رائے ناقص میں معزز معاونین کی شان سے بعید ہے کہ ذرا سے نقص پر خواہ وہ لکھائی چھپائی کے ہی متعلق کیوں نہو۔ جھٹ بلا دریغ وی۔ پی واپس کرنے سے ہمیں مالی خسارہ کا متحمل اور ملک اور زبان کو مخزن جیسے شباب رسیدہ علمی رسالہ کی خدمت سے محروم کرنا شروع کریں۔ امید کہ آئندہ ہمارے کرمفرما سے زیادہ فراخدلی اور بلند حوصلگی۔ اور وسیع النظری سے کام لیکر کارپردازان کارخانہ کو مشکوری کا موقعہ بخشینگے۔

اِسی ضمن میں یہ درخواست بھی بے جا نہ ہوگی کہ حضرات معاونین جنکا چندہ اخیر ماہ مئی تک ختم ہو چکا ہے۔ نہایت خوشی سے وی۔ پی۔ وصول فرماکر ہمارا دل بڑھائیں۔ تاہم جن بزرگوں کو آئندہ رسالہ کی خریداری منظور نہو۔ ایک پیسہ کا اطلاعی کارڈ بھیج کر اپنے اِس ارادہ سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ انکاری وی۔ پی۔ وصول کرنے سے کارخانہ کو خواہ مخواہ مالی نقصان کا منہ دیکھنا نہ پڑے۔

نیاز مند۔ مینیجر

تصویر۔ اس ماہ میں ہز ہائنس گائیکوار بڑودہ کی تصویر ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہے۔ ہز ہائنس ہندوستان کے والیانِ ریاست میں نہایت ممتاز رتبہ رکھتے ہیں۔ آپ خود گریجویٹ ہیں۔ اور مغربی تہذیب و تمدن سے بخوبی واقف ہونیکی وجہ سے تعلیم کے نہایت سرگرم حامی ہیں۔ چنانچہ آپنے اپنی ریاست میں اشاعت تعلیم کا جو انتظام کیا ہوا ہے دوسری دیسی ریاستوں کیلئے قابل تقلید ہے۔ اور ملکداری اور سیاسات میں بھی ہز ہائنس کو اعلے درجہ کا ادراک ہے جسکا ثبوت آپ بارہا اپنے انگریزی مضامین کے ذریعہ جو ہندوستان ریویو اور ایسٹ اینڈ ویسٹ ریویو وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے ہیں

پیغامِ سروش

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے-بیرسٹرایٹ لا نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پچھلے سالانہ جلسہ میں جو دلپذیر نظم "شمع اور شاعر" کے عنوان سے پڑھی تھی۔ اس کے آخری تین بند جنکا عنوان خود ہمارے معجز بیان شاعر نے "پیغام سروش" قائم کیا تھا۔ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں ان اشعارِ آبدار میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اسلام اور مسلمانوں کے لئے جس امید افزا مستقبل کا اندازہ لگایا ہے وہ بافہم اور دوربین مسلمانوں کے لئے فردوسِ نظر سے کم نہیں (محمود)

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا!
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے!
راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا؛
ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں بھی کبھی
قیس تو صحرا بھی تو لیلا بھی تو محمل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا!
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ ساماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگئ داماں بھی ہے
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملینگے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
یعنی گل کی ہمنفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیمانِ سجود
ہر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہونگے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اقبال

مذہب کا اعلان

منتشر ذرات کو یک جاں بنا سکتا ہوں میں
دوری و تجدد و تنافر کو مٹا سکتا ہوں میں

وہ مسیحا ہوں کہ اعجازِ نفس سے یک بہ یک
قم باذنی کہہ کے مُردوں کو جلا سکتا ہوں میں

ہوں وہ اسرافیل اپنے صُور کی آواز سے
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتا ہوں میں

دیوتا وہ ہوں کہ گامِ یمنیت فرجام سے
وادیٔ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہوں میں

ہوں دکانِ راہِ دوراں میں وہ پیرِ مے فروش
ہوش کا بیہوش کو دارو پلا سکتا ہوں میں

بادیہ میں وارستگی کے ہوں وہ خضرِ طریق
بھولے بھٹکوں کو رہِ منزل دکھا سکتا ہوں میں

ہوں جہازِ عافیت وہ دہر کے طوفان میں
ڈوبتوں کو سیلِ آفت سے بچا سکتا ہوں میں

ماہرِ جادو ہوں وہ جادو سرائے دہر میں
سامری کو سحر برسوں تک سکھا سکتا ہوں میں

چرخِ ظلمتگاہِ عالم پر ہوں وہ مہرِ منیر
چار دانگِ دہر کی ظلمت گنوا سکتا ہوں میں

شاطرِ شطرنجِ دنیا مات ہیں آگے مرے
نرد بازانِ زمانہ کو ہرا سکتا ہوں میں

موم ہو جاتے ہیں سنگیں دل مری تقریر سے
جوہرِ آتش نوائی وہ دکھا سکتا ہوں میں

ماجرائے درد چھیڑتا ہوں جسدم بزم میں
چشمِ اعدا سے بھی جوئے خوں بہا سکتا ہوں میں

دیدۂ ظاہر نگر میں گو ہوں مردِ کس مپرس
انگلیوں پر زار و قیصر کو نچا سکتا ہوں میں

کشمکش گاہِ جہاں کے راز مجھکو یاد ہیں
کامیابی بھی ہزیمت بھی دلا سکتا ہوں میں

پیل پیکر پہلوانوں کی صفوں کے سامنے
کاروانِ مور کو میداں میں لا سکتا ہوں میں

وہ جہیر الصوت خالد ہوں کہ دنیائے جہاں
نعرۂ اللہ اکبر سے ہلا سکتا ہوں میں

کربلائے عرصۂ دوراں میں ہوں مثلِ حسینؑ
سر کٹا سکتا ہوں میں جاں کو لٹا سکتا ہوں میں

گوش میں وہ حقانیت کے نغمۂ تہذیب کو
ڈال کے ہستی کی پستی کو ملا سکتا ہوں میں

ڈھونڈتی پھرتی ہے ناحق حسن کو چشمِ طلب
یوسفستاں ذرہ ذرہ کو بنا سکتا ہوں میں

نوٹ۔ یہ نظم بزم اردو لاہور کے ایک جلسہ میں بصدارت شیخ عبد القادر صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا پڑھی گئی۔

مطربِ ایام سے مضرابِ جنبش مانگ کر　　سازِ قومیت کے تاروں کو بجا سکتا ہوں میں
گیسوئے شانِ ربوبیت میں شانہ کش ہوں میں　　رنگِ رخسارِ محبوبیت پہ لا سکتا ہوں میں
روضۂ رضواں کے طالب جو ہوں طوبے کا درخت　　شانِ رنگینیِ جنت کی دکھا سکتا ہوں میں
جب حمیت کی رگوں میں میری آجاتا ہے خوں　　بت گرا سکتا ہوں میں کعبہ بنا سکتا ہوں میں
چاند ہوں بحرِ جہاں میں مجھ سے مد و جزر ہے　　بحر پیماؤں کو نیرنگی دکھا سکتا ہوں میں
آج گو بازار میں جگ کے ہوں جنسِ ناروا　　پر متاعِ دو جہاں قیمت میں پا سکتا ہوں میں
گاہ جلالی شان میری گاہ جمالی شان ہے　　دل ڈرا سکتا ہوں میں ڈھارس بندھا سکتا ہوں میں

میں ازل سے تا ابد اکلیل دارِ دہر ہوں
حکمرانِ اورنگ و گیسو و دارِ دہر ہوں

غلام محمد طور - ایم اے فورمن کرسچن
کالج لاہور

نوحہ ڈاکٹر نذیر احمد خانصاحب مرحوم

تو اگرچہ بزمِ حیات میں شب و روز محوِ خروش ہے
پہ شکستہ تارِ نفس ہوا تو یہ سازِ سازِ خموش ہے

دیئے جا رہا ہے بھرے بھرے کہ و مہ کو جامِ مئے فنا
سرِ رہ لٹا رہا غم کے خم وہ قضا کا بادہ فروش ہے

وہ ہمارا بلبلِ علم و فن۔ رہا جس سے گرمِ نوا چمن

ہوئی جس سے رونقِ انجمن - وہ لحد میں آج خموش ہے
وہ تھا جس کا آئنہ رقم - یہ جو ہے گہرِ قلم
ہوا شبلِ حرفِ بیاضِ غم - وہ کفن سے آئنہ پوش ہے

نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے - نہ وہ اب گلوں کے ہیں قہقہے
تجھے دہلی آج یہ کیا ہوا - نہ وہ جوش ہے نہ خروش ہے
تری شمعِ غم ہے رات بھر - نہ تو جھوم جھوم کے کھینچ سر
تری اس ذرا سی حیات پر - ترا شعلہ برق خروش ہے

نہ رہا مکاں میں مکیں اگر تو مکاں ہوا بھی تو کیا ہوا
جو چھپا میں چشمِ جہاں نہیں تو جہاں ہوا بھی تو کیا ہوا

کبھی خفتگانِ عدم کہو - لبِ گور سے کوئی راز بھی
جو ہوئی ہے صبحِ کفن عیاں تو ہے کیوں یہ خوابِ دراز بھی
یہاں رو رہے ہیں بسانِ عشق - متاعِ حسن بھی زیرِ پا
کہ مثالِ تارِ ربابِ غم - تڑپا ہے زلفِ دراز بھی
دیا پھونک مرگ نے یک قلم - یہ جہاں کے برگِ تمیز کو
کہ ہیں ایک بسترِ خاک پر - یہیں غزنوی بھی ایاز بھی
جو بلائیں تجھ کو - تو خوش بخوش تو لحد میں سر بسجود ہو
تو ادائے فرض سمجھ اسے - یہ قضا بھی ہے یہ نماز بھی

یہ قطعہ [illegible] لاہور میں اس ماتمی جلسہ میں پڑھا گیا - جو شمس العلماء ڈاکٹر حافظ نذیر احمد خاں صاحب دہلوی مرحوم کی یاد میں [illegible]

ہے سرشت میں تری اے جہاں! وہ مزے کا درد چھپا ہوا
کہ ہوا سپہ ہے کوئی سوز کی تبھی دل کو بھاتا ہے ساز بھی
چمن جہاں میں سکڑوں تو بسانِ بوئے گلاب رہ
جو ہو مضطرب بھی تو نغمہ ریز۔ بشکلِ تارِ رباب رہ

نہ سمجھ حدیقۂ دہر کو کہ فقط یہی ہے چمن تیرا
تو ہے بلبلِ چمنِ قدم ہے پرے عدم سے وطن تیرا
تو ہما ہے اور یہ جہاں قفس۔ تو کہاں۔ کہاں کے یہ خار و خس
ہو بری ز سلسلۂ ہوس۔ کہ سبکروی ہے چلن تیرا
یہ ہے کسوتِ سفرِ عدم۔ کہ ہے رخت بادیۂ قدم
کہ ہے جامہ سفرِ حرم۔ یہ دو چار گز کا کفن تیرا
نہ ہو موج چیں بجبیں بہت۔ تجھے فرصت اسکی نہیں بہت
ہے کنارِ بحر قریں بہت سنہ وہاں ہے گا سخن تیرا
ہوا اے دل آج تو لب کشا کسی خوش نوا کے فراق میں
تو اٹھا کے گوش میں رکھ لیا ہے اثر نے دُرِ سخن تیرا

خواجہ دل محمد ایم اے ایم آر ایس اے (لنڈن)

داغ مرحوم کی گل افشانیاں

(آموں کی تعریف میں)

نواب فصیح الملک داغ مرحوم نے جو حیدرآباد دکن میں اعلےٰ پیمانہ کی نظمیں تصنیف فرمائی ہیں ان میں سے بہت سی اب تک شائع نہیں ہوئیں جن کا شائع ہونا ضروریات سے ہے۔ یہ جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں۔ ہم بہت کوشش کر رہے ہیں کہ ان نظموں کو حاصل کر کے مخزن میں شائع کریں۔ بالفعل آموں کی تعریف میں جو اشعار ہمارے فصیح الملک مرحوم نے ارقام فرمائے ہیں وہ درج کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ غالبِ خلد آشیان نے آموں کی تعریف میں عمدہ مضامین کے دریا بہا دئے ہیں جس کو دیکھ کر شعرا کان پکڑتے ہیں لیکن فصیح الملک مرحوم کی اس نظم نے بھی سخندانوں اور شعرا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ سبحان اللہ! کیا عمدہ مضامین اور کیسے پیارے پیارے لفظوں کا استعمال فرمایا ہے جس کو پڑھ کر بے تامل منہ کا ذہن میں آموں کی شیرینی کا ذائقہ سے لگ جاتا ہے:-

---

شاہ نے دیں آم بھری کشتیاں — بحرِ عطا کیا ہی ہوا موجزن
کشتیوں میں آم جو ہیں رنگ رنگ — داغ کا گھر آج ہے رشکِ چمن
سرخ میں ہے لالہ رخوں کی بہار — سبز میں ہے سبز خطوں کی پھبن
زرد میں ہے رنگِ گلِ زعفراں — کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن
آم کے منہ پر ہے سیاہی کہ ہے — مردمکِ چشمِ بتِ سیمتن۔
انفس و مرغوب و لذیذ ثمر — ذائقہ میں غیرتِ شہدِ عدن
ایسے کہاں پریوں کے پر سبز سبز — ایسے کہاں حوروں کے سیب ذقن

طوطا پری لال۔ دیا دل پسند
کہتے ہیں نامی اسے اہل دکن

آم یہ ہے جام زمرد کی شکل
لال دیا صورت لعل یمن

سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ
منہ پہ گر ان کے ہے مشک ختن

گر کبھی ان آموں کا رس چوس لیں
ہونٹ ہی چباتا کریں شیریں ذقن

انبۂ شیریں جو اسے ہو نصیب
نام بھی شیریں کا نہ لے کوہکن

یہ بھی تو ہیں جنت دنیا کے نام
ان کا ہی مصلح ہے بہشتی لمن

ایسے رسیلے ہیں وہ نازک ہیں پوست
جیسے کہ ہوں دلبر نازک بدن

سیکڑوں قسمیں بھی میوے کی ہیں
پھر ہے یہ افراط کہ لاکھوں ہیں من

واقعی ان آموں کی تعریف میں
کم ہے جہاں تک کہیں اہل سخن

قاش ہے اس کی جو اپنی زباں
قند کا کوزہ بنے اپنا دہن

دیکھئے شیرینیٔ گفتار پھر
نطق بھی چکھے دم عرض سخن

نام تو ہے گرچہ یہ معنی نہ ہوں
شرکت اسمی سے ہے شیریں دہن

مجکو یہ مصرعہ بہت آیا پسند
انبۂ احمد نباتۂ حسن

پھولے پھلے شاہ کا باغ مراد
اور ثمریاب ہوں اہل زمن

فیض رساں داغ کو یارب رہے
خسرو محبوب نظام دکن

داغ مرحوم

ایک گمنام شاعر

حضرت امیر مینائی لکھنوی مرحوم ومغفور صرف استاد ہی نہ تھے بلکہ استادگر بھی تھے ۔ آپ کے فیض سخن سے بہتیرے استاد بن گئے جنکو ایک دنیا نے تسلیم کر لیا ہے ۔ جناب جلیل اور جناب ریاض کی شاعری تو آفتاب ہو کر چمک رہی ہے ۔ لیکن حضرت امیر کے باکمال تلامذہ میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اب تک اپنی شہرت پر چادر گمنامی ڈالے ہوئے ہیں اور استغنا کی وجہ سے اپنے وجود شاعری کو بھی دنیا سے چھپائے ہوئے ہیں ۔ منشی امتیاز احمد خاں صاحب راز رامپوری بھی انہیں میں سے ہیں ۔ آپ حضرت امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں برسوں اپنے استاد کے ساتھ رہے ہیں اور خاص طور پر فیض تلمذ حاصل کیا ہے مگر شاید تخلص کا آپ پر ایسا اثر پڑا ہے کہ آپ کی شاعری راز سربستہ ہو کر رہ گئی ہے ۔ اپنے کلام کیطرف سے ایسے بے پروا ہیں کہ ایک شعر بھی شاید آپ کے پاس لکھا ہوا نہ ملے ۔ ہم کو اتفاق سے آپ کی ایک بیاض بیس پچیس برس پہلے کی لکھی ہوئی مل گئی ہے اس میں کچھ غزلیں کمل کچھ ناتمام چند متفرق اشعار درج ہیں تھوڑا سا کلام ہدیہ ناظرین کرتا ہوں ۔ کلام کی خوبی ۔ بندش کی چستی الفاظ کی نشست آپ خود ملاحظہ کرلیں گے ۔ (حامد حسن قادری)

لپٹے تھے ایک روز کسی کی کمر سے ہم
اب تک لپٹے ہوئے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

کرینگے ایک روز حسینوں کے دل میں گھر
یہ چال سیکھ لینگے انہیں کی نظر سے ہم

آگے ہے دل میں سیر ہو ملکِ عدم کی اب
پوچھینگے راہ ایک دن انکی کمر سے ہم

اب دب گئے ہیں ضعف میں بارِ نگاہ سے
کٹ کٹ گئے ہیں جنبشِ تیغِ نظر سے ہم

مدت ہوئی کہ سینے میں وہ آفتیں نہیں
کیا دل پہ گذری پوچھیں تو اپنے جگر سے ہم

تیور ہنوں اُداس چرایا ہے دل اگر — پہچان لیں کہیں نہ تمہاری نظر سے ہم
اے موت! وقت نزع نہ آنے میں دیر کر — کرتے ہیں انتظار ترا عمر بھر سے ہم
وہ چھپ کے غیر سے کبھی آئیں تو خواب میں — رکھیں چھپا چھپا کے خود اپنی نظر سے ہم
جلوہ دکھا کے یار نے بے ہوش کر دیا — دھو بیٹھے ہاتھ آج پھر اپنی خبر سے ہم
گھٹ گھٹ گیا ہے وصل کی حسرت سے شوقِ دید — بڑھ بڑھ گئے ہیں ورا میں اپنی نظر سے ہم
دل دیجئے داغِ عشق کلیجے پہ لے لیا — کیا لیگئے تھے لائے ہیں کیا اُنکے گھر سے ہم
آ کر شبِ وصال اجل کیا بنائے گی — چھپ جائینگے لپٹ کے تمہاری کمر سے ہم
دل صاف عشق پاک ہے آئینہ کی طرح — اب آنکھ دیکھتے ہیں اُنہیں کی نظر سے ہم
حسرت نہ تھے رقیب کے دل کی گرہ نہ تھے — حیراں ہیں کیوں نکالے گئے اُنکے گھر سے ہم
دو دن کی زندگی یہیں پڑ کر گزار دیں — گز بھر زمین لینگے ترے رہگذر سے ہم
گیسو نہ تھا جو سر پہ چڑھایا رقیب کو — آنسو نہ تھے جو گر گئے اُنکی نظر سے ہم

وہ وہ سنائی ہیں کہ بہت ہی کرے گا یاد
اے رازؔ آج خوب ہی دشمن پہ برسے ہم

دیگر

بتوں کے راز کو افشا نہ کرنا — خموشی تو زباں پیدا نہ کرنا
نقاب اُلٹی جو تو نے اُڑ گئے ہوش — ہوا پردہ ترا پروا نہ کرنا
قیامت ہے بہت نزدیک ظالم — کسی سے وعدۂ فردا نہ کرنا
بلا سے خاک میں ملجائے عاشق — تم اپنا دل ذرا میلا نہ کرنا
رلا کر مجھکو وہ بیدرد بولا — ہنسی کی بات کا شکوا نہ کرنا
سکھاتی ہے نہیں آنکھوں کی شوخی — کسی کی آنکھ سے پردا نہ کرنا
وہ منت سے ترا محشر میں کہنا — ترے صدقے مجھے رسوا نہ کرنا

قیامت ہی قیامت ڈھا رہا ہے قیامت میں ترا پردہ نہ کرنا

محبت راز کی تم دل میں رکھنا

کبھی اس راز کو افشا نہ کرنا

ودیگر

ستم میں بھی تو پہلو اُنکی زینت کے نکلتے ہیں ہمارے خونِ شدہ دل کو حسیں تلووں سے ملتے ہیں

وہ منہ پھیرے ہوئے ہو پیچ بیچ میرے ساتھ چلتے ہیں مری صورت سے نفرت ہے مرے سائے سے جلتے ہیں

سہارے سے کسی کے ناتواں رستے میں چلتے ہیں عصا تھامے مژہ کا آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں

پڑی پھر دستِ نازک پر مصیبت کنگھی چوٹی کی وہ کیا پچھتاتے ہیں مہندی لگا کر ہاتھ ملتے ہیں

شگافِ سینہ سوراخِ جگر چاکِ دلِ عاشق محبت کی گلی سے سیکڑوں رستے نکلتے ہیں

وہ بولے کیا ہی جا کر وصل کی شب جب ذرا چھیڑا الٰہی ٹوٹ جائیں ہاتھ ظالم کیسے چلتے ہیں

تمہاری مانگ کے عاشق ہیں شیخ و برہمن دونوں یہ وہ رستہ ہے جس میں دو دشمن مل کے چلتے ہیں

حنا کا رنگ چمکاتے ہیں پردے میں [illegible] کے ڈبو کر ہاتھ میرے خون میں وہ ہاتھ ملتے ہیں

ہوا دیدہ میں پائے نظر کی ٹھوکریں کھائیں بڑے بے آبرو ہو کر مرے آنسو نکلتے ہیں

پسینہ آ گیا اس بت کو جب آغوش میں کھینچا ہماری گرمجوشی دیکھ کر پتھر پگھلتے ہیں

یہ کس بدمست کی ہے بو جو آئی کون آتا ہے کہ اُچھل کر نکلی شیشے سے مے جام چلتے ہیں

کھٹک آج آنسوؤں کی دے رہی ہے یہ خبر مجھ کو چبھے تھے دل میں جو کانٹے وہ آنکھوں سے نکلتے ہیں

اثرِ عشقِ مژہ کا آنکھ بھی بے چین کرتا ہے ہمارے دل کو جب وہ دیکھتے ہیں آنکھیں ملتے ہیں

نکالی راہ شانے نے ہنسی جب زلف چہرے سے چمک کر مانگ بولی ناز سے اب ہم نکلتے ہیں

نظر دوڑا رہے ہیں جستجوئے یار میں ہر سو ہمارے پاؤں تھکتے ہیں تو ہم آنکھوں سے چلتے ہیں

زباں ہے خشک اے ساقی پلا دے بادۂ گلگوں ہمارے حلق کے کانٹے اسی پانی میں گلتے ہیں

کبھی ہے ناز کی شوخی کبھی ہے حسن کی خوبی مرے تڑپانے کو وہ سیکڑوں نقشے بدلتے ہیں

مرے ماتم نے تو میں ڈھونڈوں سا بہانہ آنے کا — غضب ہے کیسے کیسے نازنیں جوبن ڈھلے ہیں
کوئی حسرت نہیں نکلی کوئی ارمان نہیں نکلا — محبت میں حسینوں کی فقط آنسو نکلتے ہیں
ادھر گردن ہمیں ہاں ہیں ادھر قبضہ ہے جوبن پر — تمہارا مار ہے کیا شوخ دونوں ہاتھ چلتے ہیں
ٹپک پڑتے ہیں آنسو وصل کی شب تیرے ہونٹوں سے — جہاں کھا کے مسی منہ پہ نہ کب سنبھلتے ہیں

میں اس الفت کے صدقے ہوں میں اس نفرت کے قرباں ہوں
جگہ ہے ناز کی دل میں گر صورت سے جلتے ہیں

مرغ تسبیح خوانِ من خاموش

ہم نے قمری عجیب پالی ہے — عاشقِ حسنِ لایزالی ہے
کیا ہی نازوں سے اسکو پالا ہے — قفسِ نقرئی میں ڈالا ہے
قمریاں یوں تو دیکھی بھالی ہیں — اس کی باتیں مگر نرالی ہیں
جب میں پنجرے کے پاس جاتا ہوں — پیار سے ہاتھ پر بٹھاتا ہوں
گود میں لے کے پیار کرتا ہوں — جان اُس پر نثار کرتا ہوں
گیت توحید کا سناتی ہے — راہِ حق کیطرف بُلاتی ہے
پیاری پیاری وہ نور کی گردن — جسپہ قربان حور کی گردن
وہ گلا خوشنما صراحی دار — چاہتا ہوں کہ کروں بیچ کے پیار
لال لال اُسکی نرگسِ گلفام — یا بھرا ہے شرابِ سرخ کا جام
اُس پہ طرّہ ہے سرخیِ منقار — گل سمجھ کے نہ کرے بلبل پیار
رنگِ منقار رغوانِ عیسر — یا دھڑی پان کی ہے ہونٹوں پر
یا کوئی ناخنِ حنائی ہے ٭ — ہائے کیا سرخ چونچ پائی ہے

پاؤں بھی سرخ۔ رنگ بستہ ہے
دل تمنا کا اسی سے پستا ہے

کبھی سرکشِ گلِ چمن کی طرح
سرنگوں ہے کبھی دُلہن کی طرح

زیب و زینت سے اسکو ان بن ہے
سادگی میں ہزار جوبن ہے

جسم نقرہ صفت تمام سپید
صاف برّاق رنگ قابلِ دید

ہے صدا اس کی مونسِ دلِ زار
ہے تصدق ہزار صوتِ ہزار

ہائے۔ وہ اس کی سست کُن آواز
گویا اب سماع ہو گیا ا ز

زلفِ شب تا کمر جب آتی ہے
جاں اندھیرے سے ہول کھاتی ہے

خانۂ چشمِ تنگ کے نظر
واپس آتی ہے کانپتی تھر تھر

اک اداسی چھائی ہوتی ہے
خلقِ غفلت کی نیند سوتی ہے

میری قمری مگر نہیں سوتی
رائگاں عمر وہ نہیں کھوتی۔

بس ہے حق سرّہ منہ سے کام اسے
ورد اللہ کا ہے نام اسے

لب پہ ہر دم ترانۂ توحید
کبھی تسبیح ہے کبھی تحمید

ضربِ نامِ خدا لگاتی ہے
دل تو ننھا سا اور یہ چھاتی ہے

شور کرتی ہے غل مچاتی ہے
چپ کبھی تھک کے بیٹھ جاتی ہے

مضطرب ہو کے پھر پکارتی ہے
چونچ کھٹ کھٹ زمیں پہ مارتی ہے

نعرۂ ہو سے دل ہلاتی ہے
کہہ کے حق سرّہٗ جگاتی ہے

نہیں کھلتی مگر مری آنکھیں
نیند میں ہیں بھری ہوئی آنکھیں

وہ پکارے۔ یہاں نہیں کچھ غم
گویا کھائی ہے جاگنے کی قسم

اسکی چیخوں کا کچھ خیال نہیں
وقت جاتا ہے۔ کچھ ملال نہیں

بستر نرم پہ ہوں پنبہ بگوش
فکر دنیا ہے کچھ نہ دین کا ہوش

پاؤں پھیلائے میں تو سوتا ہوں — عمر خود رفتگی میں کھوتا ہوں
طاعتِ حق کا کچھ خیال نہیں — اے اندیشۂ مآل نہیں

اوفتادم بخوابِ خوش بیہوش!
مُرغِ تسبیح خوانِ من خاموش!

(ابو الاعظم سید محمد حسین امجد از حیدرآباد)

ٹوٹا ہوا دل

شوقِ وصال و خواہشِ الفت نہیں رہی — امیدِ لذتِ غمِ فرقت نہیں رہی
اب دلپسند منظرِ صحرا نہیں رہا — گلگشتِ باغِ دہر کی حسرت نہیں رہی
تسکیں فزا بہارِ گلستاں کہاں ہے اب — وجہِ ملال وادیِ غربت نہیں رہی
وہ شوق وہ امنگ کہاں ہے مزاج میں — فکرِ حصولِ حشمت و عزت نہیں رہی
تحریر میں ہے لطف نہ تقریر میں مزا — سچ پوچھئے تو میری وہ حالت نہیں رہی
جاتی رہی معاصر اداں کی چھیڑ چھاڑ — وہ گرمیِ سرشکِ ندامت نہیں رہی
افسانۂ ملال بنی داستانِ دل — اب قابلِ بیاں یہ حکایت نہیں رہی
مدت ہوئی کہ قیدِ غمِ لازوال ہوں — اب دل میں جائے عیش و مسرت نہیں رہی
میں آشنائے درد ہوں حسرت نصیب ہوں — عیشِ جہاں سے مجھ کو محبت نہیں رہی
تلخ ہے اب مزا شراب کباب میں — دنیا کی نعمتوں سے وہ رغبت نہیں رہی
اچھا ہوا کہ سر میں وہ سودا نہیں رہا — اچھا ہوا جگر میں وہ حدت نہیں رہی
ناکامیوں نے لوٹ لیا لطفِ نازِ یار — دیوانۂ تیاز طبیعت نہیں رہی

جوشِ جنونِ عشق کا دریا اُتر گیا — وہ انتظارِ وصل کی آفت نہیں رہی
خوں گشتۂ ملالِ دلِ ناکام ہوں — پروائے رستخیز قیامت نہیں رہی

اِس انقلاب دہر نے دل ہی بدل دیا
یعنی زمین میں وہ زہانت نہیں رہی

(ابو ظفر - زمین از منگیسر)

تازہ غزلیں

ہم اپنے دوست مسٹر محمد حامد علیخاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کے نہایت ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں مندرجہ ذیل غزل اشاعت کے لئے عنایت فرمائی ہے۔ آپ آج کل نواح سورت (علاقہ بمبئی) میں مقیم ہیں آپ کی صحت ایک عرصے سے اچھی نہیں رہتی مگر باایں ہمہ علمی مشاغل جاری ہیں۔ خدا انہیں جلد بخیریت لکھنؤ میں واپس لائے اور زبان اردو ہمیشہ ان کی خدمات سے مستفید ہوتی رہے۔

اسی کا عکس ہے یہ بھی بہار آئی جو گلشن میں — گریباں سے لگی تھی آگ وہ صحرا کے دامن میں
ہمیشہ خشک ہی دیکھا جنہیں صحرا کے دامن میں — وہی کانٹے اُلجھ کر رنگ لائے میرے دامن میں
ہمیں اس باغِ عالم میں بھلا درکار ہی کیا ہے — بہت ہیں چار تنکے گھر کو صحرا میں کہ گلشن میں
ہمارے آشیانے سے بہارِ باغِ عالم ہے — وہ دو تنکے ہیں جلنے لگی ہے آگ گلشن میں
نہ کی سیرِ چمن ہم نے نہ کوئی پھول ہی توڑا — چلے ایسے ہی گلشن سے کہ جیسے آئے گلشن میں
خزاں ہی ہم نے دیکھی باغباں جب کھُل گئیں آنکھیں — کریں گے یاد کیا ہم بھی کبھی آئے تھے گلشن میں

میرے عیبوں کو کہتا ہے بڑا احسان کرتا ہے — ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی ہے یہ دشمن میں

مصیبت میں نہ کام آئے یہی دونوں برابر ہیں — سمجھ میں کچھ نہ آیا فرق کیا ہے دوست دشمن میں

عجب نیرنگ زمانہ ہے عجب بہروپ بازی ہیں — بظاہر فرق اب کچھ بھی نہیں ہے دوست دشمن میں

ہزاروں ہی لٹائے اور پھر بے فائدہ تو نے — نہ چھوڑے گلچیں ہمارے نام کے دو پھول گلشن میں

ارے زاہد خدا سے ڈر مذمت اور اس منہ سے — صفت وہ کون ہے تجھ میں نہیں ہے جو برہمن میں

ترے قسمت عمل کی نیکیاں کام آگئیں اپنے — ملی ہے راحتِ آغوشِ مادر ہم کو مدفن میں

جو کوئی غور سے دیکھے تو کثرت عینِ وحدت ہے — نظر آتا ہے خوشہ میں وہی جو کچھ ہے خرمن میں

خزاں ہے باغباں اک ہو کا عالم ہے نہیں جب سے — ہمارے آشیاں کے چار تنکے تیرے گلشن میں

کراہت ہے نہ جائے دو نظر کے ساتھ مرتا ہوں — مگر نازک سا اک رشتہ محبت کا ہے گردن میں

اٹھو حامد تمہیں کچھ ہوش بھی ہے کیا یہ عالم ہے — گریباں دھجیاں کرتے ہو تم صحرا کے دامن میں

تعلق باغ سے جب تک تھا حامد پریشاں تھے
اکیلے چین سے بیٹھے ہیں اب صحرا کے دامن میں

محمد حامد علیخاں بیرسٹر ایٹ لاء سورت

کیوں رخ ادھر ہے پشت ادھر آفتاب کی — حیرت سے ڈر گیا دلِ پر التہاب کی

بے چین کر رہی ہیں امنگیں شباب کی — کیا ضیق میں ہے جان اب اُنکے حجاب کی

ہمت نہ ہو سکی کبھی اک قطرہ آب کی — میخانے خالی رکھی کٹوری حباب کی

کچھ مدح لکھ رہا ہوں رخِ بے نقاب کی — کیوں جستجو نہ ہو ورقِ آفتاب کی

ذوقِ کرم نے دی نہ مجھے ترغیبِ معصیت — مجبور ہو کے چھوڑ دیں راہیں ثواب کی

دن بھر میں سارے جھگڑے بکھیڑے تمام تھے — پہلے سے کتنی دھوم تھی روزِ حساب کی

ساقی اگر یہی تیری دریا دلی رہی — ڈوبے گی ایک روز یہ کشتی شراب کی

جنت میں کوئی مجھ سا بلا نوش چاہیئے | سنتا ہوں میں کہ بہتی ہے ندی شراب کی

تکتے ہیں آپ کو لب جو میرے سامنے | جی چاہتا ہے پھوڑ دوں آنکھیں حباب کی

اُن اگلی صحبتوں کا جو ذکر آ گیا کبھی | بولے کہ جانے بھی دو یہ باتیں ہیں خواب کی

میں نے تمہیں کو سارے حسینوں میں چن لیا | لوں گا تمہیں سے داد بھی اس انتخاب کی

دل سے جگر تک آئی ہیں سینے کو توڑ کر | برچھی سے کم نہیں ہیں نگاہیں عتاب کی

جب روٹھ کے چلے ہو تو اُس وقت پھر کے تم | بے چینی دیکھتے دلِ حسرت مآب کی

قاتل سے ہائے پیاس ہماری نہ بجھ سکی | ہے آبِ تیغ تیز میں حالت سراب کی

تاروں کی بھیڑ ہے ترے کشتہ کی قبر پر | چادر چڑھا رہا ہے فلک ماہتاب کی

آثارِ خط میں مصحفِ رخسارِ یار پر | تفسیر ہونے والی ہے اب اس کتاب کی

لڑ کر کے دکھائے کوئی قدرداں بھی ہو | قسمت میری ہے منتظر اُنکے شباب کی

لائے ہو بہرِ فاتحہ ساتھ اپنے غیر کو | تم نے تو میری قبر کی مٹی خراب کی

اُٹھے دعا کو ہاتھ تو حالی العجل ہوئی | مسجد کے سامنے گری بوتل شراب کی

نکلا جو دم تو حرف نکلنے کے نام پر | حسرت تڑپ گئی دلِ ناکامیاب کی

تم تو ہنر کی آنکھوں میں دل میں رگوں میں ہو
صورت یہ ہے تو اُس سے ضرورت حجاب کی؟

(رہبر غازیپوری)

آشنا جب ترے نام سے لب ہوتا ہے | رات کا آخری حصہ وہ غضب ہوتا ہے

ہاتھ پر دل میں پئے نذر لئے سب ہو جو | بے نیازی میں عجب حسنِ طلب ہوتا ہے

مہربانی بھی رلاتی ہے لبِ جاناں | آپ کا لطف بھی گریہ کا سبب ہوتا ہے

تم بتاں کو جو راضی نہ کیا کچھ نہ کیا | بات کرنے کا بھی کہتے ہیں کہ ڈھب ہوتا ہے

آنکھ کھلجائے اگر دیکھ لیں سونے والے — وہ دل آویز سماں آخرِ شب ہوتا ہے

مہر و مہ میں بھی نرا اک جلوہ گری ہے لیکن — دل کے کھچنے کا کوئی اور سبب ہوتا ہے

بے نیازی کا ہے الزام جو چپ رہتا ہوں — اور کہتا ہوں جو کچھ ترکِ ادب ہوتا ہے

وہ زباں دے تو چکے ہیں مگر ایفا کا خیال — دیکھنا یہ ہے کہاں اور یہ کب ہوتا ہے

ہر بگولے نے کیا تربتِ مجنوں کا طواف — ادب آموزِ محبت کا ادب ہوتا ہے

یوں سمجھ لیجئے ہر کام کی علت ہے ضرور — کچھ نہ کچھ شکر و شکایت کا سبب ہوتا ہے

میری غزلوں کی ہوئی قدر مرے بعد حفیظ
کوئی ہر شعر پہ اب دادِ طلب ہوتا ہے

(حفیظ جونپوری)

لی تم نے مری جان اگر کم سخنی سے — زندہ بھی تو کر دو کبھی شیریں دہنی سے

عاشق ہوں غرض کچھ نہیں دنیائے دنی سے — کیا مانگوں بجز تیرے میں تجھ ایسے غنی سے

شاید نظرِ چشمِ محبت بھی گراں ہے — مرجھائے چلے جاتے ہو نازک بدنی سے

مجھ کو نہ کہیں پھونک دے یہ برقِ تبسم — کوندا اٹھتی ہے بجلی سی تری خندہ زنی سے

تم قتل کرو پھر سببِ قتل کی پرسش — محشر میں ہو آئے مجھی گردن زدنی سے

شکوہ مجھے کرنا ہی نہ تھا دردِ جگر کا — زخموں کو لگے چھیڑنے برچھی کی انی سے

جاتا ہے سوئے خلد بھی بھیس بدل کر — اچھی کوئی پوشاک نہیں ہے کفنی سے

ہے سخت خمار آج وہ شے چاہئے مجھ کو — بے چین نہ ہو جائے جو اعضا شکنی سے

حاصل نہ ہوا وصل تو ہوتا ہے وصال اب — جھگڑا ہی چکاتا ہوں میں ہیرے کی کنی سے

کیا پوچھتے ہو مجھ کو ٹھکانا نہیں معلوم — بے نام و نشاں ہوں میں غریب الوطنی سے

اب تو میری فریاد خدا بھی نہیں سنتا — مشکل ہے کہ جیتے کوئی قسمت کے دھنی سے

دو لاکھ حسیں ایسے زمانہ میں پڑے ہیں　　تم چھوٹے سماتے نہیں کل پر ہستی سے
او ترچھی نگاہوں سے مجھے دیکھنے والے!　　چھلنی ہے کلیجہ تیری ناوک فگنی سے
ہونٹوں کو ترے سنگ محقر سے ملانا　　لعلوں کی ہے تشبیہ عقیقِ یمنی سے

اے قیس کوئی بات بنائے نہیں بنتی
مجبور ہوں کمبخت دلِ ناشدنی سے

(مولانا قیس آروی - بہار)

خاک میں مل کر جوانی جائے گی　　بے نشاں ہو کر نشانی جائے گی
آتے آتے آئے گی ہم میں سکت　　جاتے جاتے ناتوانی جائے گی
ہنس کے ذکرِ غیر پر کہنے لگے　　کب یہ تیری بدگمانی جائے گی
ہم تصور میں رہیں گے کوچہ گرد　　خاک اب گلیوں کی چھانی جائے گی
ہاتھ ملنے کو بڑھاپا آئے گا　　بے وفا بن کر جوانی جائے گی
تیغِ قاتل آ رہی ہے تشنہ کام　　پی کے بس دو گھونٹ پانی جائیگی
قبر وہ ظلمت کدہ ہے جس جگہ　　بجھ کے شمعِ زندگانی جائے گی
چھپ کے یوں جائینگے وہ دشمن کے گھر　　آگے آگے بدگمانی جائے گی
مجھ سے ہو جاؤ گے خود ہی بے حجاب　　سب تمہاری لن ترانی جائے گی
اپنی قسمت آپ ہے روٹھی ہوئی　　کیا ہماری بات مانی جائے گی
سب چلینگے لیکے آہونکے نشان　　ساتھ اپنے بے نشانی جائے گی
درد اٹھتا ہے اٹھانے کے لئے　　اب ہماری ناتوانی جائے گی
قدرداں سب اٹھتے جاتے ہیں کمال　　ہائے کب ناقدردانی جائے گی

(کمال لکھنوی ثم رامپوری)

وہ موت چاہئے کہ فنا کو خبر نہ ہو
وہ زندگی ملے جو بقا کو خبر نہ ہو

یوں خون کیجئے کہ حنا کو خبر نہ ہو
دل یوں چرائیے کہ ادا کو خبر نہ ہو

اوسکے ہے ضبط ای دل پُر درد و رنج غیر
یوں آہ کر کہ آہِ رسا کو خبر نہ ہو

ہستی کے کارواں سے نکل کر بقا کی سیر
پر اسطرح کہ بانگِ درا کو خبر نہ ہو

ہاں ہاں کہیں ہزار ونکے دل خون سے بھر نہ جائیں
یوں زلف کھولئے کہ ہوا کو خبر نہ ہو

گم ہو رہیں وجود میں الا کہ اسطرح
پہلے ہی جزوِ اعظمِ لا کو خبر نہ ہو

جو آرہی پہ کان لگائے ہوئے ہیں عشق
دم توڑتے ہیں یوں کہ قضا کو خبر نہ ہو

خواجہ غلام غوث عشق بغدادی حیدرآباد

ہو محو جو خوبیِ مطلق کا اُسے وہمِ فنا و بقا نہ رہا
بس طاریِ رفعتِ آدم کو ۔ کوئی خدشہ موت و بلا نہ رہا

ہُوا پاک جو آپ صفاتِ بشر سے دامن جو حرص و ہوا نہ رہا
آتے حشر میں خوفِ سزا نہ رہا تو حضور میں شوقِ جزا نہ رہا

میرے پہلو میں اک دل تھا نہ رہا یہ سحر میں خیالِ خدا نہ رہا
ترے عشق میں آبت ہو شربا کبھو کسکو کہیں کہ کیا کیا میں لیا گیا

تیرے نحچۂ قدرتِ کامل سے یہ اکوئی بھی ہوش بجا نہ رہا
تیری نالشِ مہرِ شہادت سے صحیفۂ اشک بہا نہ رہا

بس ڈوبا میں بحرِ محن میں جگر جو چھپا یا تو پہلو سے کر گئے
ہری آنکھوں میں آنسو رہا نہ اگر ترے ہاتھوں پہ رنگِ حنا نہ رہا

کئے تب کہ نالہ داد کرے اُٹھے خاک سے اور فریاد کرے
کوئی چاہ میں تیری خاک کرے جو تو ڈھونڈھا میں ڈھونڈھا نہ رہا

بلبل پہ ہر دن گاجار ریگا کیا غم ہے گلِ گلزاری کا
دور آئیگا بادِ بہاریگا نہ رہیگا برا جو بھلا نہ رہا

مت بار ہو خارِ جدائی کا کہ سینے پہ بارِ جدا ٹیکا
کیا ڈھونڈتا ہے ہرجائی کا ترے پہلو میں جو رہا نہ رہا

ہوئی تیری سے ایسی ہی کوئی خطا کہ کسی سے تو ایسا خفا نہ رہا
اک بوسہ پہ اتنا غرور بھلا کہ کسی کا شباب سدا نہ رہا

ڈاکٹر غلام علی ہمیری اسسٹنٹ سرجن لاہور

طبِ یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب [illegible]
انجام دی ہیں ان کا معتدبہ حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطرافِ ہند میں اس کام کیلئے سب کی [illegible]
انہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں ہیں تو
انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں جناب حاذق الملک احساسِ فرض کے ساتھ دل میں اس فن کی
ترقی کے ارمان رکھتے اور جفاکشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی اس عظیم الشان خدمت میں
صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ انکے احساسِ فرض کا ثبوت اور انکی مستقل [illegible]
کا ثمرہ ہے گو اس کی ظاہری حیثیت ایک تجارتی حیثیت ہے۔ لیکن اگر حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے
تو یہ ایک تجارتی کام نہیں۔ طب یونانی کی بقا کا سامان ہے۔ شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا
ہے۔ اس لئے جس غرض سے قایم ہوا ہے۔ اس کے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی
نہیں رہا۔ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکی طرز ساخت میں تہذیب و ترقی
دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام
طور پر اطبا برتتے ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ اعلےٰ نسخے جو صرف روسا و امرا کو میسر آتے تھے بالکل اصلی اجزا
سے دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں۔ اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ
طبیہ و زنانہ شفاخانہ کو دی جاتی ہے۔ نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے [illegible]
[illegible] کی خاص خاص دوائیں بھی اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں صحت و تندرستی ایک بڑی [illegible]
[illegible] اس مدعا کا [illegible]۔ اس لئے تمام [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

The Late Justice M. G. Ranade.

Chitrashala, Poona.

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

(حضرت اقبال)

قدرت نے انسان کو جس قدر قوتیں عطا کی ہیں اگرچہ وہ بذاتہٖ اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اپنی اپنی حیثیت اور مقدار کے مطابق خصوصیت رکھتی ہیں اور ہر قوت دوسری قوت کے مقابلہ میں ممتاز ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پایا جائے گا کہ ایک قوت دوسری قوت سے کسی نہ کسی حد تک ایک نسبت رکھتی ہے یہ کیفیت ہر قوت ظاہری اور باطنی میں پائی جاتی ہے ظاہری قوتیں ظاہری قوتوں سے بھی نسبت رکھتی ہیں اور باطنی قوتوں سے بھی یہی حال باطنی قوتوں کا ہے۔

قوت بینائی یا قوت بصارت اگرچہ بذاتہٖ ایک کیفیت اور ایک تصرف رکھتی ہے اور دوسری قوتیں اس کے کام اور تصرفات میں کوئی حصہ نہیں رکھتیں اور

بصارت کا اُن پر انحصار ہے لیکن پھر بھی بصارت اور قدرت بینائی کو دوسری قوتوں اور دوسرے اعضا سے ایک نسبت حاصل ہے اور اُس نسبت کی وجہ سے وہ متاثر ہوتی ہے یا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

اگر معدہ میں فتور اور دماغ میں قصور ہو تو آنکھوں اور آنکھوں کی بینائی پر ضرور ہی تنزل آ گرے گا اور بصارت کسی حد تک ماؤف ہو گی اسیطرح قوت شامہ اور قوت سامعہ وغیرہ کی کیفیت ہے یہ سب قوتیں ایک ہی رشتہ میں پروئی گئی ہیں ایک کے فتور سے دوسری میں فتور آنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اگر واہمہ میں فتور ہو تو اُس کا اثر کچھ نہ کچھ متفکرہ پر بھی پڑے گا مدبرہ اور خیالیہ بھی متاثر ہو گی چاہے ان قوتوں کو جداگانہ کیفیتیں کہو اور چاہے جداگانہ عمل اور جداگانہ حالتیں دونوں صورتوں میں اُنکے درمیان ایک نسبت پائی جاتی ہے۔ ایسی نسبت ہمیشہ موثر اور دخیل نہیں ہوتی کبھی کبھی عمل پذیر ہوتی ہے۔

بعض قوتیں ایسی ہیں کہ

وہ دوسری قوتوں کے مقابلہ میں بطور ایک نگران۔ موئید پاسبان کے کام کرتی ہیں اگرچہ اصلی قوتوں کی عملی رفتار سبک اور وسیع یا وقیع ہوتی ہے لیکن پاسبان قوتوں کی ہستی اور موجودگی اُنکے واسطے ضروری سمجھی گئی ہے یا سمجھی جاتی ہے قدرت نے انسان کو دل۔ ضمیر۔ قلب جیسی بے بہا نعمت جو عطا کی ہے اگرچہ وہ بذاتہ بھی ایک طاقت اور ایک وسعت رکھتی ہے اور اُسے بہت کچھ حاصل ہے لیکن اُسکی پاسبانی اور تائید اجتہاد کے واسطے عقل بھی کام کرتی ہے اور ایسی خدمات بجا لاتی ہے کہ جو اپنی ضرورت کے اعتبار سے نہایت قیمتی ہیں قوت ارادہ بذاتہ ایک تو دور رویا خود عامل طاقت ہے اور اُس میں بہت کچھ زور پایا جاتا ہے لیکن باایں ہمہ حالات عقل اُسکی نگران یا پاسبان ہے اور باوجود ارادہ کی وسعت اور مضبوطی کے عقل بہت

کچھ مقابلہ کرتی ہے۔

ہر شخص کچھ نہ کچھ عقل اور ارادہ رکھتا ہے اور اسی طرح ہر شخص دل ضمیر قلب بھی رکھتا ہے اگرچہ ان قوتوں کی کیفیتوں اور مقدار میں فرق ہو لیکن انکے ہونے میں کوئی شک شبہ نہیں ہے اگر ایک حکیم تعلیم یافتہ کو یہ قوتیں حاصل ہیں تو ایک جاہل کو بھی حاصل ہیں اگر ایک مہذب یہ چیزیں رکھتا ہے تو ایک وحشی بھی رکھتا ہے اگر ایک بچہ کے قالب میں انکا تہیہ کیا گیا ہے تو ایک جوان اور پیر کے جسم میں بھی یہ سامان رکھا گیا ہے۔

اگر دل کے ساتھ قوت عقل کی پاسبانی نہ ہو اور اگر قوت ارادہ کے مقابلہ میں عقل کا وجود نہ ہو تو انسانی کاروبار اور اجتہادات میں عموماً وہ خوب صورتی وہ کمال اور وہ خصال اجتہاد نہ پائے جاتے جو اب پائے جاتے ہیں قوت ارادہ بہت دفعہ زور میں آکر ان مراحل اور ان منازل پر لے جانے کی کوشش کرتی ہے جو دائرہ انسانیت اور احاطۂ تمدنی (سوشل) یا مرکز روحانیت سے کہیں دور ہوتے ہیں لیکن عقل ایسے اجتہادات کا زور سے مقابلہ کرتی ہے اور ارادہ کو باز رکھتی ہے اسی طرح اگرچہ دل قدرتاً ایک بصیرت رکھتا ہے لیکن بعض وقت اس کا اجتہاد عقلی امداد کا محتاج ہوتا ہے۔

قوتوں کی یہ اثباتی صورت یا انکا اثباتی پہلو ہے اس کے مقابلہ میں دوسری منفی صورت بھی ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ بعض وقت بعض قوتوں کی پاسبانی اور نگرانی یا امداد اور موجودگی کی ضرورت نہیں رہتی اور قوتہائے زیر پاسبانی کو کچھ عرصے کے لئے آزادی دیجاتی ہے تاکہ اس آزادی سے وہ متمتع ہو کر انسانی زندگی کے نشو و نما کا باعث ہوں اور ایک دوسرے طریق پر انسان ان سے فائدہ اٹھائے۔

دل کے اجتہادی شعبوں کی اصلاح اور امداد کے واسطے عقل کی پاسبانی لازمی ہے اور عقل ہمیشہ سلطان قلب کے دائرہ دولت پر خلوص کے ساتھ کھڑی رہتی ہے اور ہر وقت خدمات کے پیش کرنے میں جرأت اور تقدم دکھاتی ہے لیکن ضروری ہے کہ

بعض اوقات دل عقل کی پاسبانی سے آزاد بھی ہو اور ایسی آزادی سے وہ کیفیتیں۔ وہ چیزیں۔ اور وہ منافع حاصل کرے جو عقل کی موجودگی میں بمشکل حاصل ہو سکتے ہیں یا ہو ہی نہیں سکتے یا جنہیں عقل پسند نہیں کرتی یا ایسی کیفیتیں عقلی جذبات کے کسی حد تک منافی اور خلاف ہیں۔

انسانی زندگی کے دو شعبے یا دو پہلو ہیں۔

(الف) شعبۂ فراست

(ب) شعبۂ وحشت

بعض انسانی قوتوں کا دونوں شعبوں سے واسطہ اور تعلق ہے اور بعض کا صرف ایک ہی شعبہ سے۔ قوت عقلیہ کا واسطہ اور وابستگی شعبۂ فراست سے رہتا ہے شعبۂ وحشت سے وہ کوئی وابستگی نہیں رکھتی۔ دل اور ارادہ کا واسطہ دونوں شعبوں سے رہتا ہے۔ عقل دل اور ارادہ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوتی ہے جب شعبۂ فراست کی نوبت آتی ہے جب شعبۂ وحشت سے واسطہ یا سابقہ پڑتا ہے تو عقل و فراست کنارہ کر جاتی ہے اس وقت دل اور ارادہ کی قوتیں آزاد ہو کر متصرف ہوتی ہیں اور وہی تمیز انکی رہبر اور پیش رو بنتی ہے جو خود انکی ذات میں موجود ہوتی ہے۔

انسان کے طریق عمل اور مراحل زندگی سے یہ ثابت ہے کہ وہ ایک ہی شعبہ کے ماتحت زندگی خوش اسلوبی سے بسر نہیں کر سکتا۔ اسے دونوں شعبوں سے کام لینا پڑتا ہے اور دونوں شعبے اس کی زندگی کے مرکز اور راہ نما ہیں اگر شعبہ فراست ہی سے ساری عمر انسان کا تعلق اور وابستگی رہے تو یقیناً وہ ان فوائد اور مقاصد سے محروم رہے گا۔ جو شعبہ وحشت سے وابستہ ہیں اور اگر ہمیشہ شعبہ وحشت میں ہی منہمک رہے تو ان منافع سے دور جا پڑے گا جو شعبہ فراست کی بدولت حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگر انسان زندگی کے تمام حصوں میں شعبہ فراست ہی سے وابستہ رہے تو اس کی زندگی خود اس کے حق میں اور نیز اس کے ابنائے جنس کے حق میں۔ تمدن کے حق میں۔ معاشرت کے حق میں۔ معاد کے حق میں ایک بے مصرف اور بیہودہ زندگی ثابت ہوگی گو وہ فراست سے بھرپور رہے گا اور اس کے دل و دماغ میں عقل کا مصالحہ کثرت سے جاگزین ہوگا۔ لیکن جو سرور۔ جو فرحت۔ جو حظ۔ اور جو معادی منافع شعبۂ وحشت سے حاصل ہو سکتے ہیں وہ شعبۂ فراست سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

جب تک کہ عقل کی پاسبانی یا عقل کی نگرانی سے بعض انسانی قوتیں آزاد نہ ہوں ؎

خبر از حال من نمے گیرد
تامرا بے خبر نہ گرداند

انسان طبعاً سرور اور فرحت کا طالب یا خواہاں ہے اور بغیر اس کے اس کی زندگی کے اکثر حصے بے سود رہتے ہیں۔ سرور اور فرحت کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ کوئی مشاہداتی سرور ہے اور کوئی معانقیہ۔ کوئی عملی ہے کوئی نظری کوئی لمسی ہے کوئی بیہقی - کوئی حقیقی ہے کوئی عارضی یا لازمی۔ بعض سرور اور بعض فرحتیں شعبۂ فراست سے بھی وابستگی رکھ کر حاصل ہوتی ہیں لیکن بعض بجز اس کے حاصل نہیں ہوتیں کہ شعبۂ فراست سے قطع تعلق کر کے صرف شعبۂ وحشت سے ہی چندے واسطہ رکھا جائے۔

منازل دنیوی اور مقاصد تمدنی سے گریز فراست کے خلاف ہے فراست ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ انسان انہیں بکھیڑوں میں مدت العمر سرگردان رہے لیکن کبھی کبھی انسان بہ اثر شعبہ وحشت اسباب کا بھی خواہاں ہوتا ہے کہ ان دماغ سوزیوں اور ان بکھیڑوں سے رہائی بھی پائے اور یہ خوشی بھی حاصل کرے۔

شعر

دلا بہ یادِ دہانش چہ غنچہ مے پیچی؟
ترا کہ گفت کہ برخویش کار تنگ بگیر؟

عورت اور مرد کے تعلقات اور وابستگیوں میں جو انسان کی خوشیوں اور مقاصد کا ایک اعلےٰ ذریعہ میں بہت کچھ ایسے طریق عمل پائے جاتے ہیں کہ جو شعبۂ فراست سے کسی قدر دور ہیں اور فراست جن کا تعاقب غیر موزوں سمجھتی ہے یا یہ کہ انکے بعض حصّوں میں فراست کو کوئی دخل نہیں ہوتا وحشت ہی وحشت ہوتی ہے۔

یا ایسی کیفیتیں ہوتی ہیں کہ

جن کی تاویل وحشت کے اصول پر کی جاتی ہے اگرچہ بعض وقت بعض ایسی وحشتوں کا نتیجہ اور اثر شعبۂ فراست کے مطابق ہوتا یا نکلتا ہے لیکن اگر ان کا شروع اور خاتمہ دیکھا جائے تو وہ سراسر وحشت کا ایک واضح خاکہ ہوتا ہے ایسی وحشت یا ایسا خاکہ جسے انسان باوجود خود عاقل ہونے کے بھی شمع فراست کی روشنی میں ایک وحشت ہی سمجھتا ہے اور باوجود ایسا سمجھنے کے مارے شرم یا حجاب کے انکی تاویل فراست آمیز کرنے کی جرأت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُن کا راز افشا نہ ہوا ور اگر کبھی ہو تو فراست اُن کا پہلو لئے ہوئے ہو۔

ہیچ گفتن نتوانم ز دہان و کمرش
خبر از عالم اسرار نہ دارم چہ کنم؟

محبت کی لَے میں انسان جو کچھ کرتا یا کر بیٹھتا ہے اُس کا اکثر حصہ بعض وقت فراست سے بعید اور متانت سے بالا ہوتا ہے فراست مزاحم اور مانع ہوتی ہے لیکن شعبۂ وحشت کی سینہ زوری اور کشمکش فراست کا مقابلہ کرتی اور اُسے زک دیتی ہے گو بعد میں کسی وقت انسان ایسے ظلمانی جذبات سے پشیمان ہوتا اور توبہ کرتا ہے۔ لیکن شروع شروع میں اُن سے باز رہنا زندگی کی خوشیوں کی کمی سمجھی جاتی ہے۔ اور

ایسے ہی جذبات پر زور دیا جاتا ہے۔ ؎

بہ گلشن وصفِ رویت کردم و گل را خجل کردم
حدیثے گفتم از موئے تو سنبل را خجل کردم

گو بعض حرکات اور بعض امور ایسے جذبات کے تابع محض وحشت ہی نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ کچھ فراست بھی پائی جاتی ہے لیکن انکا اکثر حصہ وحشت سے وابستہ ہوتا ہے اور اسی وحشت پر انسان کی خوشی اور فرحت کا بہت کچھ مدار ہوتا ہے اور وہ آگے چل کر کسی دوسرے پہلو میں تمدن اور دنیا کے واسطے مفید ثابت ہوتی ہے۔

بیوی اور خاوند کے تعلقات میں دنیا اور تمدن کی تمام عمدگیاں اور خوبیاں پائی جاتی ہیں اور انسانی معاشرت کا یہ ایک بڑا جزو اور اہم حصہ ہے لیکن اگر اس اہم حصہ کے ان اجزا کا مطالعہ کیا جائے جو اپنی تہ میں وحشت اور کثافت رکھتے ہیں تو کہنا پڑے گا کہ

وہ اجزائے کثیفہ فراست سے ایک فاصلہ پر ہیں یا یہ کہ ان میں فراست کا نام و نشان ہی نہیں پایا جاتا اور دونو فریق ایسے اجزا سے عقلی پیرایہ میں مجتنب رہنا بعض وقت مناسب خیال کرتے ہیں اور بعض اوقات ان کے دل و دماغ میں ایک قسم کی شرم آمیز کدگدی سی ہو کر انہیں ناگفتنہ بہ حرکات پر محترزانہ توجہ دلاتی ہے۔

پانچ چیزیں یا پانچ کیفیتیں ایسی ہیں جو انسان کی فراست و بینش پر پردہ ڈالتی ہیں یا فراست اور بینش انکی موجودگی میں تھوڑی دیر کے واسطے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

(الف) عورت

(ب) بچہ۔

(ج) آئینہ

(د) خوبصورتی۔

(ہ) جدت

عورت کی صحبت۔ عورت کی قربت۔ عورت کی خواہش۔ عورت کی چاہت۔ عورت کی نسبت۔ عورت کی عداوت۔ عورت کی کاوش میں کچھ نہ کچھ یا کسی نہ کسی وقت وحشت کا سماں ہوتا ہے فراست اور عقلمندی دور سے تماشا دیکھتی ہے لیکن ان جذبات پر غالب نہیں آسکتی اور جب غالب آتی ہے تو یہ جذبات باقی نہیں رہتے۔

بچہ کے سامنے یا بچہ کے ساتھ ہونے سے عقل و فراست تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ جاتی ہے دانا سے دانا ماں باپ بچہ کے ساتھ ایسی حرکات کرتے ہیں جو عقل و فراست سے دور ہوتی ہیں۔ گویا بچہ کے ساتھ بچہ ہی ہو جاتے ہیں اور ان حرکات و جذبات میں ایک حد تک وحشت کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

آئینہ کے سامنے بھی انسان کے دل و دماغ میں ایک قسم کی وحشت طاری ہونے لگتی ہے گو اس کا پیمانہ بہت بڑا نہ ہو گر کچھ نہ کچھ ہوتی ضرور ہے۔

وہ لوگ جو ہمیشہ اس وعظ کرنے کے عادی ہوتے ہیں کہ اترانا انسان کی ذلیل ترین صفات سے ہے وہ بھی آئینہ کو دیکھ کر کسی نہ کسی حد تک ایسی حرکات کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جن کا مفہوم اترانا ہی ہو سکتا ہے۔

خوبصورتی بھی بعض حالات میں عقل و فراست کی دشمن ہے چاہے یہ خوبصورتی جسمانی ہو چاہے روحانی۔ چاہے مجسم ہو اور چاہے خیالی۔ چاہے مادی ہو۔ چاہے سمادی۔ خوبصورت شئے۔ خوبصورت صنعت۔ خوبصورت حرفت۔ خوبصورت سماں۔ خوبصورت انسان۔ خوبصورت حیوان کے دیکھنے سے انسان کے دل و دماغ میں ایک قسم کا جوش پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنے جذبات میں ایک ایسا تموج پاتا ہے جو اسے کسی حد تک فراست سے دور لے جاتا ہے طبیعت للچاتی ہے اور دل و دماغ بے انداز امنگوں سے بھر جاتے ہیں اور

ایسی حرکات یا ایسے جذبات سے انسان اپنے دل میں ایک قسم کا سرور اور خوشی پاتا ہے۔

سب سے اخیر پر جدت ہے جدت بھی ایک حد تک وحشت کا سماں لاتی اور وحشت کا تماشا دکھاتی ہے کوئی چاہے روز راگ سنے لیکن جب کبھی موسیقی میں کوئی شخص جدت طراز ہوتا ہے تو انسان پر کسی اور ہی حیثیت سے اثر ہوتا ہے ؂

عشق پیدا کرد آں لیلیٰ نسب
بید مجنوں گشت سر و قامتش

بانسری کی آواز سنکر بعض انسانوں کے دل اور دماغ پر جو کچھ گزرتی ہے وہ وحشت اور تذبذب کا ایک زندہ نمونہ ہوتا ہے دوسرے انسان خیال کرتے ہیں کہ ہر ایسا شخص اُن حالات میں کیفیت فراست اور مادہ بینش سے کسی حد تک خالی ہے اور اُس پر وحشت حکمران ہے۔

انسان چاہتا ہے کہ ایسے اوقاتِ وحشت میں دل کی کہانی سنائے اور دوسروں کو بھی اپنے ذوق و شوق میں ملائے لیکن ایسا کر نہیں سکتا۔ خود ہی مزے لیتا اور خود ہی وحشی بنتا اور اپنا تماشا خود دیکھتا ہے ؂

کس چو من حسرت کش آں لعل شکر بار نیست
زہر دارم در دہان و زہرۂ اظہار نیست

بعض وقت انسان بے تکلف مجلسوں محفلوں کلب گھروں میں جاکر بھی ایک حد تک فراست سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کا ایک حصہ اُس سرور۔ اُس حظ۔ اور اُس فرحت میں گزارنا چاہتا ہے جو اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ وحشت اور آزادی بھی رکھتی ہو۔

یہ ایک ایسی دھن ہے کہ اس سے بہت ہی تھوڑے انسان خالی ہونگے اور

باوجود اس کے کہ یہ ایک وحشت نا ساماں کہا جاتا ہے پھر بھی اُس کی ضرورت ہے۔ کسی تفریح کی محفل میں جا کر دیکھو کہ فراست ایسے مجمع میں کس خاموشی سے دُور دراز فاصلہ پر کھڑی ہے اور کس متانت سے اُن دلوں کا تماشا کر رہی ہے جن کی وہ قدرتاً پاسبان ہے اور دل جیسی طاقت تفریحات کی لے میں کس خوشی سے وحشت کا خیر مقدم کر رہی ہے ؎

از پئے آں بت برہمن گشتہ ام
آدمی را عشق کافر مے کند

عنوان میں جو شعر درج کیا گیا ہے یہ اس تمام بحث کا گویا خلاصہ ہے یہ شعر حضرت اقبال سیالکوٹی ثم لاہوری کی نازک خیالیوں کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے حضرت اقبال نے اس شعر میں جس متانت جس عمدگی جس ہمت اور جس خوبی سے مضمون زیر بحث کو دکھایا اور ثابت کیا ہے الحق وہ انہیں کا حصہ ہے۔

آپ پہلے مصرع میں فرماتے ہیں۔

ضروری ہے کہ پاسبان عقل دل کے پاس رہے اور دلی اجتہادات میں اس کا رہبر اور مددگار ثابت ہو کیونکہ قدرت نے عقل و فراست کی نوکری لگا رکھی ہے ایسی پاسبانی اور ایسی نگرانی بُری نہیں۔ اس میں تمدنی معادی اور معاشرتی منافع متصور ہیں لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔

کیونکہ زندگی کی اصلی خوشی اور اصلی نشو و نما کبھی کبھی تنہا چھوڑ دینے سے ہی حاصل ہوتے ہیں لازمی ہے کہ طائر دل قفس عقل میں قید اور بند رہے مگر آزادی کے لطف اُٹھانے کے واسطے وحشت اور خودروی بھی ضروری ہے اور یہ آزادی سوائے اس کے حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کا لطف جبھی اُٹھایا جا سکتا ہے کہ کبھی حضرت دل مصاحبِ فراست سے الگ بھی گزاریں۔

عقل و فراست اجتہادی رنگ میں ایک نکتہ چین مصاحب ہے اور نکتہ چینی کی زندگی میں فرحت و خوشی اور آزادی کا ہونا معلوم۔

عقل و فراست کی پابندیوں سے اگرچہ انسانی دل بہت کچھ نیک اور مفید اجتہادات کرتے اور کامیاب ہوتے ہیں لیکن جب حضرت دل بقول حضرت اقبال مدظلہ تنہا چھوڑ دیے جاتے ہیں تو اُس حالت میں اُنکی کیفیت جس خوبصورتی اور حسن آزادی سے جلوہ افروز ہوتی ہے اُس کا مقابلہ عقل و فراست کیا کر سکتی ہے گو وہ ایک قسم کی دیوانگی ہی کہی جائے لیکن ایسی دیوانگی پر ہزاروں فرزانگیاں بھی قربان ہیں۔

بڑے بڑے حکیموں اور بڑے بڑے فلاسفروں نے بھی اخیر پر حضرت اقبال کے مشورہ پر عمل کیا اور فرزانگی سے جان چھڑا کر دیوانگی تلاش کی ہے ؎

در مزاجم جسم رگ سودائے ہست

زاں مژہ نیشترے مے خواہم

ڈاکٹر اقبال کی اس قصوری کا ثبوت جو انھوں نے اپنے شعر میں قایم کی ہے ہر دل۔ ہر دماغ۔ ہر ضمیر اور ہر شخص دے رہا ہے اور ہر شخص کی زندگی اس کی گواہ ہے اور عملی رنگ میں اس کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور کوئی شخص اس سے انکار اور اعتراض نہیں کر سکتا۔

یہ قصوری تمدن کی بنیاد، انسانیت کی جڑھ، آدمیت کی بنیاد اور آزادی کی جان ہے۔

معاشرت اور معاد دونوں کا اس سے اپنے اپنے وقت پر واسطہ پڑتا ہے اور ہر شعبہ اپنے اپنے رنگ میں اس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مرزا صائب نے بھی اپنے رنگ میں زندگی کے متعلق ایک شعر کہا ہے لیکن حضرت اقبال کے شعر میں جس خوبی سے یہ نکتہ حل کیا گیا ہے وہ کچھ اور ہی

لطف رکھتا ہے۔

ہم حضرت مرزا صاحب کے شعر پر یہ بحث ختم کرتے ہیں۔ ؎

عمر عزیز قابلِ سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

سلطان احمد از بہاولپور

غزل

(از جناب مولانا مولوی اصغر علی روحی ایم۔ او۔ ایل۔ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

در سینہ ز مژگانِ تو صد خار شکستہ
در چشمِ تو خواب دل بیمار شکستہ

در گنبدِ مینائے فلک شور بپا کرد
ہر شیشہ کہ در خانۂ خمار شکستہ

بازارِ بتاں یکسرہ بشکست بہ ناگاہ
یارم چو کلاہ گوشہ ز دستار شکستہ

بکشود مرا ایں ہیچ ز صد دانۂ تسبیح
صد کفر ز یک رشتۂ زنار شکستہ

از وعدۂ دیدار تو خورسند نیم زانکہ
پیمانِ تو آں است کہ صد بار شکستہ

تا باد ز کوئے تو خرامید بہ صحرا
رنگے بہ رُخ تختۂ گلزار شکستہ

دیر است کہ دو راز تو مرا پائے دویدن
در راہِ تو از گرمیٔ رفتار شکستہ

عذرِ نفس بندہ اے شیخ با اگر پائے تو لغزید
خم ہا بدرِ خانۂ مے خوار شکستہ

در کنجِ قفس نیست چو من مرغِ گرفتار
دل خستہ و پر بستہ و منقار شکستہ

فریاد کہ ز دو مہر بہ جستجانہ دل باز
چوں شیشہ نا بسرِ بازار شکستہ

روحی نشد از رشتۂ تقدیر گرہ وا
صد ناخنِ تدبیر دریں کار شکستہ

نظامِ شمسی

(سلسلہ کے لئے دیکھو مخزن بابت ماہ نومبر ۱۹۱۱ء)

آفتاب و ماہتاب

حضرات! میں "نظام شمسی" کے متعلق اس سے پہلے ذکر شروع کرکے آفتاب کی نسبت چند باتیں عرض کر چکا ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا اور علمائے طبقات الارض کی سند پر بتلایا تھا کہ کیونکر ہم اپنی آگ اور کوئلوں کی حرارت کے لئے آفتاب ہی کے رہین منت ہیں۔ کیونکر ہماری اشیائے خوردنی و نوشیدنی بغیر آفتاب کے ہمیں نہ مل سکتی تھیں۔ انسان کے کاروبار تجارت۔ ہواؤں کا چلنا۔ جہازوں کا آنا جانا۔ کہاں تک آفتاب ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ آفتاب ہم سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے قریب فاصلے پر ہے اور علمائے یورپ نے اس فاصلہ کو کیونکر معلوم کیا۔ اور یہ کہ اسکا حجم اسقدر ہے کہ تین لاکھ کرۂ زمین جتنے کُرّے ملا کر کسی آسمانی ترازو میں ایک طرف رکھے جائیں اور آفتاب کا کرہ دوسری طرف۔ تو آفتاب ہی کا پلہ بھاری رہے گا۔ آج میں آفتاب کے متعلق چند باتیں اور عرض کرونگا۔ ماہتاب اور دیگر نجوم کے بارے میں بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

روز و شب

لیل و نہار کا معمہ وہ پہلا عقدۂ لاینحل تھا جو مبصران سماوی کو سب سے اول حل کرنا

پڑا۔ ایک قرص زرین کا دامن افق سے اُبھرنا اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے منازل آسمان کو طے کرکے نصف النہار تک پہنچنا اور پھر مغرب کی طرف ڈھلکر اس جگہ غائب ہوجانا جو جائے صدور سے بُعد المشرقین پر واقع ہے پھر رات بھر غائب رہ کر صبح کو از سر نو مشرق کی طرف سے نکلنا اور اسی نصف دائرہ کو پورا کرنا انسانی عقل کے لئے عجیب معما تھا پرانے لوگوں نے اس معما کو حل کرنے کی علیٰ قدر عقولہم کوشش کی لیکن چونکہ وہ زمین کو چپٹا سمجھتے تھے اور اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کے گرداگرد سمندر ہے وہ جن نتائج پر پہنچے آج کل بہت لطف انگیز معلوم ہوں گے ساحل سمندر پر کھڑے ہوکر انہیں سورج سمندر ہی سے نکلتا اور سمندر ہی میں ڈوبتا معلوم دیتا تھا۔ لہذا وہ یہی سمجھنے لگے کہ شام کو واقعی سورج سمندر کے پانی ہی میں غوطہ لگاتا ہے۔ بعض ذکی الحس تو اس بڑے جلتے ہوئے گولے کے پانی میں پڑکر بجھنے کی سنسناہٹ کو بھی سننے اور محسوس کرنے لگے۔ مگر یہاں ایک مشکل آپڑی۔ اگر سورج واقعی ہر شام کو سمندر میں گرکر بجھ جاتا ہے تو کیونکر لاکھوں میل مشرق کیطرف دس بارہ گھنٹوں کے بعد ہی پھر صبح کے وقت برآمد ہوجاتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ ہر روز سورج برآمد ہوتا ہے شام کے وقت وہ سمندر میں غرقاب ہوکر بجھ جاتا ہے اور تمام رات آسمانی دیوتا ایک نیا سورج گھڑتے رہتے ہیں تاکہ دوسرے روز پھر صبح کو دن نکل سکے۔ لیکن اس میں تو بہت اسراف معلوم ہوتا ہے۔ اتنا بڑا سونے کا گولہ ہر روز بنایا جائے اور شام کے وقت ضائع کر دیا جاوے۔ یہ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لہذا زیادہ کفایت سے کام لینے کا خیال پیدا ہوا اور یہ قرار پایا کہ اس معما کو اور طرح پر حل کیا جاوے۔ پس خیال کیا گیا کہ ولقن (Vulcan) کا جو نہایت عظیم الشان دیوتا اور زہرہ کا شوہر مانا جاتا تھا اس معاملہ میں ہاتھ ضرور ہے اس کے پاس ایک بڑی کشتی موجود رہتی ہے جسے وہ شام کے وقت مغرب کو لیجاتا ہے اور گرتے ہوئے سورج کو اس میں سنبھال لیتا ہے تمام رات وہ اس اپنے زریں

مسافر کو بٹھائے شمال کیطرف کے سمندروں میں سے لے جاتا ہے - عین وقت صبح مشرق میں پہنچکر اس زرین گولے کو اس زور سے اچھالتا ہے کہ دن بھر کے چکر کے بعد شام کے وقت مغرب میں پہنچتا ہے - جہاں زہرہ کا شوہر بھی اپنی کشتی سمیت اُسے لینے کے لئے موجود ہوتا ہے - شمالی اونچے پہاڑوں پر رات کے وقت سرخ سرخ سی روشنی اسی سورج سے پڑتی ہے جبکہ یہ ولقن کی کشتی میں مشرق کی طرف بوقت شب جایا کرتا ہے - غرض یہ تھے خیال قدما کے - آپ ان خیالات پر مذاق اُڑائیں - چاہے ہنسیں - انہوں نے اپنی طرف سے اس معما کے حل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - گو سارا بوجھ بیچارے ولقن پر ڈال دیا گیا لیکن اُنکا کیا بگڑتا تھا - قدرت کے کارندے انسان کے خادم سمجھے جاتے ہیں کیا عجب اگر دیوتا کا یہی فرض ہو کہ ڈوبتے ہوئے سورج کو بچا کر مشرق میں پہنچائے وہاں سے اُسے اُچھال کر خود مغرب کو بھاگے تاکہ شام کے وقت اُسے پھر سنبھال کر پھر وہی دور جاری رکھے - اس حل میں بھی کئی مشکلات تھیں - ناخداؤں نے اِنسے بیان کیا کہ ہم تمام سمندروں میں پھرے - مہینوں پانی ہی میں رہے - شمال مشرق - اور مغرب سب طرف گئے مگر ولقن کی کشتی زرین اور اُس کا مددگار اور مذہب ہمیں رات کے وقت کسی سمندر میں آتا جاتا نظر نہ آیا - اور کہ سمندر اس قدر وسیع ہے کہ اُسکا محیط دریافت کرنا محال ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اگر ایک طرف کو ہی جاتے رہیں تو کچھ مدت کے بعد جہاں سے چلے تھے ہم وہیں آ پہنچتے ہیں - ان باتوں سے خیال پیدا ہوا کہ بیچاری زہرہ کے شوہر پر جو فرضی بوجھ لاد دیا گیا ہے اُس سے اسے سبکدوش کرنا چاہئے - زمین کے متعلق یہ رائے قایم ہوئی کہ یہ ایک گردی شکل کی ہوگی - کیونکہ یہ کرہ کی خاصیت ہے کہ اگر اُس کے ایک نقطہ سے چلیں اور ایک ہی طرف کو چلتے رہیں تو آخر کار اُسی پہلے ہی نقطہ پر پہنچ جائینگے - جب زمین کو کرہ مان لیا تو دن اور رات کا معما بھی قریباً حل ہوتا معلوم ہوا - سورج دن کے وقت تو ہمارے سامنے نمودار رہتا ہے لیکن سر شام ہی سے نکلے

حصے کے سامنے چکر لگانا شروع کرتا ہے اور پھر صبح کے وقت ہمیں دکھائی دیتا ہے۔
اسی طرح وہ ستارے جو بوقت شام ہمیں مشرق کیطرف افق سے قریب نظر آتے ہیں۔
صبح کے وقت مغرب میں ڈوبتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اسی سے قدما نے خیال کیا
کہ آسمان جس میں یہ ستارے اور سورج جڑے ہوئے ہیں ہماری زمین کے گرد
چکر لگاتے ہیں۔ اسی کو شعرا نے گردش چرخ کہن سے تعبیر کیا اور اس فلک پیر کو
تمام اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا نشانہ بنالیا۔ ملاحظہ ہو ؎

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے ہمیں انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

مگر ایک ایسا سورج جو زمین سے تین لاکھ گنا ہے اور وہ ستارے جو لاکھوں کروڑوں
کی تعداد میں ہیں اور جن کے حجم انفرادی طور پر خود سورج سے کئی لاکھ گنا ہیں کیا سب
کے سب ہماری زمین کیخاطر اسقدر تکلیف گوارا کر رہے ہیں کہ اسکے گرد چکر لگائیں۔ کیا ہم نہیں دیکھتے
کہ ریل گاڑی میں سوار ہو کر ہم جا رہے ہوتے ہیں تو تمام گرد و پیش کی چیزیں متحرک معلوم ہوتی ہیں۔ اگر غور سے
دیکھئے تو قریب کے درخت زیادہ تیزی سے اور دور کے درخت ذرا کم تیزی سے بھاگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اگر
کچھ عرصہ کیلئے اسی نظارہ کو دیکھتے رہئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگل کے رہنے والے کسی
ناچ میں مصروف ہیں اور ایک حلقہ باندھے ادھر سے ادھر چکر لگا رہے ہیں۔ مگر اے
ظاہر بیں! ذرا گاڑی کو رکنے دے اور پھر دیکھ کہ یہ ناچ کیا ہوا؟

اصل معاملہ برعکس ہے تیرا اپنا پاؤں چکر میں ہے اور تو سارے جہان کو چکر میں ڈال
رہا ہے۔ کیا ہمارا بھی معاملہ ایسا ہی نہیں؟ کیا خود ہماری زمین ہی تو نہیں گھوم رہی کہ ہم
آسمان کو چکر دے رہے ہیں؟ ہاں یہی حال ہے۔ ہم خود گھوم رہے ہیں اور سطح زمین کا
چپہ چپہ سورج کے سامنے آتا ہے اور روشن ہو جاتا ہے اور پھر آدھے وقت کے لئے
سورج سے دور ہو کر اندھیرے میں چلا جاتا ہے۔ یہی دن اور یہی رات ہے۔

اس پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر وقت کہیں نہ کہیں سورج نکلتا ہوا اور کسی دوسری جگہ غروب ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے بیشک ایسا ہی ہے۔ اس وقت یہاں شام کے ۶ بجکر چند منٹ ہوئے ہیں۔ نیویارک واقعہ امریکہ میں اس وقت صبح کے ۵ بجے ہیں اور سورج تھوڑے ہی عرصے میں نکلنے والا ہے۔ اگر ایک گیند کو آپ کسی لیمپ کے سامنے رکھیں تو اسکا نصف حصہ روشن ہوگا اور نصف پر اندھیرا ہوگا۔ اگر اس کرّے کو آپ گھمائیں تو ہر ایک حصہ باری باری روشن ہو کر پھر اندھیرے میں آتا رہے گا بس یہی حال زمین کا ہے۔

رات کے وقت آسمان کے جواہرات یعنی نجوم فلکیہ کیطرف دیکھئے اِس بے ترتیبی میں بھی کیا بہار دکھاتے ہیں ذرا ان کو گن تو جائیے۔ آپ کہینگے۔ واہ! تارے گننے والے تو مجنوں ہوتے ہیں یا عاشقان شب بیدار جنکی ہجر کی راتیں تارے گن گن کر بھی گزرنے میں نہیں آتیں۔ یہ تو ایسا ہی مشکل کام ہے جیسے صحرائے افریقہ کی ریت کے ذرات کا گننا۔ کیا سہل سا کام بتایا!

بیشک کام تو مشکل ہے مگر آپ نے ان ستاروں کو ریت کے ذروں سے کیوں تشبیہ دی؟ کیا آپ کو علم نہیں کہ انکے حجم کس قدر ہیں؟

سنئے۔ انمیں سے چھوٹے سے چھوٹا ستارا بھی اس قدر عظیم ہے کہ آپ کا آفتاب اس کے مقابلہ میں ایسا ہی ہے جیسا آفتاب کے سامنے ذرہ۔ اللہ اکبر! آپ تو شاید سمجھے بیٹھے تھے کہ اجرام فلکی میں سب سے بڑا جرم سورج ہی ہے۔ مگر نہیں معمولی سے معمولی ستارہ بھی کئی دنیائیں خود میں لئے کسی دوسرے نظام کا رکن ہے۔ ہاں آپ سے اسقدر فاصلۂ بعیدہ پر واقع ہے کہ اگر آپ کا سورج اُس فاصلہ پر چلا جائے تو اُس کی آہن گداز گرمی اور دھوپ اور چمک اور حرارت آپ کو ایسی ہی معلوم ہو جیسے جگنو کی چمک اور بس۔ بلکہ ممکن ہے کہ سورج آپ کو بالکل نظر تک نہ آئے۔ ہاں ہماری

ریاضی میں اس تعداد کو ظاہر کرنے کے لئے اعداد بھی نہیں ہیں جس تعداد میں یہ کروی اجرام جو کائنات الجو کی کشتیاں ہیں آپ کے سامنے دن رات تیر رہی ہیں۔ آپ کہیں گے کہ دن کے وقت تو سورج کے سوائے ہمیں کوئی اور جرم فلک نظر نہیں آتا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے آپ سورج سے اس قدر قریب ہیں کہ اسکی روشنی سے آپ اور ستاروں کو دن کے وقت نہیں دیکھ سکتے مگر یہ موجود ہیں اور اگر پوری طاقت کی دوربین سے آپ دیکھیں تو دن کو بھی تارے نظر آتے ہیں اور موجود ہوتے ہیں۔ کوئلہ کی کان کے اندر سے اگر آسمان کیطرف دیکھا جائے تو تارے نظر آئینگے۔ اور نہیں تو اگر کسی کارخانے کی چمنی ہی کے اندر جو خاصی اونچی ہو آپ کھڑے ہوں اگر اتفاق سے کارخانہ کا کام بند ہو تو اس میں ہی سے آپ آسمان کیطرف دیکھیں آپ کو دن کے وقت ستارے نظر آئینگے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چمنی کی وجہ سے سورج کی شعاعیں سیدھی آپ کی آنکھ پر نہیں پڑسکتیں اور ستاروں کی ہلکی روشنی بھی آپ کی آنکھ پر اثر ڈال سکتی ہے اور آپ ان ستاروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے اور کوئی بہت بڑا اہم جرم نہیں اگر سورج مع زمین و نظام شمسی سب غائب ہو جائیں تو دنیا کے لئے بعینہٖ ایسا ہے جیسا کسی ایک حقیر سے ستارے کا تاروں بھرے آسمان سے گم ہو جانا۔

دانایان فرنگ کہ رصد گاہوں میں دن رات دوربینوں کے ذریعہ آفتاب اور دیگر اجرام کی سیر کرتے اور انکے حالات مشاہدہ کرتے رہتے ہیں سورج کے متعلق عجیب واقعات کا اظہار کرتے ہیں۔ عام طور سے تو یہی خیال کر لیا جاتا ہے کہ سورج گول ٹکیا نہیں تو کرہ ہی سہی۔ لیکن یہ کرہ ٹھوس کرہ ہے اور ایسے مادے سے بنا ہے جو حرارت اور روشنی کا منبع ہے مگر اصل حقیقت یوں ہے کہ گو ہم اس امر کا اعتراف نہ کریں۔ کہ سورج سیال مادے سے بنا ہوا ہے یا کم از کم اس کی سطح جو دوربین سے نظر آتی ہے وہ ٹھوس نہیں۔ کسی اچھی دوربین میں سورج کی سطح پر کئی سیاہ داغ نظر آتے ہیں جو

ایک جگہ قائم نہیں رہتے بلکہ ہر داغ بارہ تیرہ دن نظر آتا ہے اور پھر بارہ تیرہ دن کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال دیا گیا ہے کہ کرہ آفتاب بھی زمین کیطرح گھوم رہا ہے اور ہماری زمین تو چوبیس گھنٹہ میں ایک دفعہ گھوم جاتی ہے لیکن سورج بالکل از کم اس کی سطح ۲۶ دن میں اپنے قطر کے گرد چکر لگا لیتی ہے۔ اس لئے نصف وقت کے لئے ہم کو یہ داغ نظر آتے ہیں اور نصف وقت کے لئے ہم سے دوسری طرف چلے جاتے ہیں۔ یہ داغ کیا ہیں۔ یہ وہ مہیب ناک شگاف ہیں جن کے اندر آتش کی وہ خوفناک صورت نظر آتی ہے جو اس کی حد درجہ حرارت کے وقت ہو جاتی ہے یعنی جبکہ اسکا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ ہماری زمین پر اس درجہ کی گرم اور بھسم کر دینے والی آگ اور حرارت کہیں بھی موجود نہیں۔ اگر آگ کی حرارت تیز کی جائے تو جلنے والی چیز پہلے سرخ رنگ پھر سفید رنگ کی ہو جائے گی اور آخری درجہ ہے کہ سیاہ ہو کر بھسم ہو جائے۔ سورج کی سطح ایک جیسی صاف نہیں بلکہ سیاہ دھندلے سے دھبے تمام سطح پر پائے جاتے ہیں یہ گویا حد درجہ کے تپے ہوئے مادے کے اجزاء بادل کی صورت میں سورج کی سطح پر ایسے ہی پھر رہے ہیں جیسے ہماری زمین پر اجزائے آب کے ابر پھرا کرتے ہیں۔ یہ بڑے شگاف جن کا پہلے ابھی ذکر کیا ہے تعداد اور مقدار میں گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں ۱۸۲۶ء سے ایک نجومی نے انہیں رجسٹر میں درج کرنا شروع کیا جس سے پتا چلتا ہے کہ قریباً گیارہ سال اور پانچ ماہ کے عرصہ میں یہ داغ بالکل اگلی حالت پر آ جاتے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ ان سورج کے دھبوں کو ہماری زمین کے سنگ مقناطیس سے ایک عجیب تعلق ہے۔ مقناطیس کی سوئی ہمیشہ خاص شمال کیطرف نہیں ہوتی بلکہ ٹھیک شمال سے ایک چھوٹا سا زاویہ بنائے رکھتی ہے جو ہمیشہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور حیرانی کا مقام ہے کہ اس کا پورا حساب رکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ اس زاویہ کے گھٹنے بڑھنے کا بھی دور انہیں گیارہ سال اور چند ماہ میں پورا ہوتا ہے جن میں سورج کے ان دھبوں کا دور ختم

ہوتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ سورج کی سطح پر بعض اوقات یک لخت ایسے تیز مادے کے فوارے نکل آیا کرتے ہیں جن کی رفتار بعض دفعہ دو لاکھ میل فی گھنٹہ کے حساب سے ہوتی ہے اور ایسے وقتوں میں ہماری دنیا پر "مقناطیسی طوفان" آجایا کرتے ہیں جنکی وجہ سے مقناطیسی سوئی بھنور میں پڑجاتی ہے اور اُس کا رخ ایک طرف نہیں رہتا خدا معلوم مقناطیس کو سورج کے ان بڑے شگافوں کے ساتھ کیا اور کیسا تعلق ہے آخر سنگِ مقناطیس بھی کیا نازک طبع اور دُھن کا پکا واقع ہؤا ہے اس نے جس سے لو لگائی ہے اس کی ہر حرکت سے متاثر ہوتا ہے اور اگرچہ آفتاب اوج فلک پر چمکنے والا اور یہ صرف سطح زمین پر تڑپنے والا ہے مگر کچھ ایسے دل ملے ہیں کہ اللہ اللہ!

رات کے وقت جو ستارے آپ کے سامنے نظر آتے ہیں اگر ان نورانی چیزوں کو آپ دیکھا کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ وہی ستارے نہیں نظر آیا کرتے بلکہ جو ستارے آپ کو آج رات نظر آئینگے چھ ماہ کے بعد اُن کی جگہ بالکل اور ہی ستارے ہونگے۔ یہ واقعہ قدما کو بخوبی معلوم تھا اور یہی مراد انکی بروج اثنا عشرہ سے تھی آپ اگر بوقت شب آسمان کو دیکھیں تو ماہ بہ ماہ حمل۔ ثور۔ جوزا۔ سرطان۔ اسد۔ سنبلہ۔ میزان۔ عقرب۔ قوس۔ جدی۔ دلو۔ حوت اپنی اپنی باری جگہ لیتے رہتے ہیں۔

اس صورت حال کی وجہ زمین کی سالانہ گردش ہے جو وہ سورج کے گرد کرتی ہے رات کو زمین کے سامنے صرف نصف حصہ سماوی موجود ہوتا ہے پورے سال میں جب کہ زمین ایک چکر سورج کے گرد لگا لیتی ہے تمام حصص سماوی رات کو باری باری نظر آسکتے ہیں لہٰذا ان بروج وغیرہ کا پورا دور ایک سال میں ختم ہو جاتا ہے۔

آئیے آپ کو ایک ایسی سرزمین میں لے چلیں جہاں کے دن رات آپ کے دن رات سے مختلف ہیں یعنی آپ کو قطب شمالی کی سیر کرائیں۔ رات کا وقت ہے۔ غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ ایسی سردی [illegible] دیکھنے میں نہیں آئی۔ سخت

اندھیرا ہے۔ اچھا نماز تو پڑھ لیں۔ بسم اللہ مگر مغرب کدھر ہے؟ انتظار کیجئے سورج نکلیگا تو شرق و غرب معلوم ہو جائے گا۔ لیجئے سورج ہی نکلنے سے رہا۔ الٰہی کیا ہو گیا؟ کب تک تارے گنیں؟ خدا خدا کر کے ذرا ذرا افق پر روشنی ہونے لگی۔ یہ عجب صبح ہے اس کا اُجالا تو پھیلتا ہی نہیں بلکہ افق کے ساتھ ساتھ چکر لگانے گیا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں پہلا چکر لگا لیجے اب اُجالا تھوڑا سا زیادہ ہوا پھر وہی چکر غرض کئی دن یہی کیفیت رہتی ہے آج تو یہ روشنی ذرا ذرا سرخ ہونے لگی ہے ہاں آج قرص آفتاب کا کنارا ابھرا۔ یہی مشرق ہے۔ مگر نہیں سورج تو افق کے ساتھ چکر لگانے لگا۔ الحمد اللہ تمام افق ہی مشرق ہے۔ ذرا اونچا ہوا مگر وہ چکر برابر جاری ہے۔ پوری ٹکیا نظر آنے لگی مگر وہ اور اونچا ہوا غرض تین مہینے (کہاں کے مہینے؟ لاہور کے نہیں ایک ایک چکر سورج کا گنتے جائیے۔ تین چکر دن کا مہینہ فرض کر لیجئے) یا الٰہی کیا اب یہ غروب ہونے میں نہ آئے گا؟ لیجئے آج تو نیچا ہوتا ہوا نظر آیا ہے مگر چکر وہی ہے اور نیچا ہوا؟ بھئی نماز کدھر پڑھیں؟ جدھر مرضی ہو سجدہ کر لیجے **اینما تولوا فثم وجہ اللہ** یہاں تو ہر طرف جنوب ہی جنوب ہے۔ مشرق و مغرب تو ہے نہیں۔ اب تو سورج افق کے پاس آنے لگ گیا آپ تیار ہو جائیے چھ مہینے کی رات آئی یہاں سے بھاگنا ہی بھلا۔ ۹ ماہ کی سردی اور اندھیرا کون جھیلے؟ کوئی یوروپین تو قطب شمالی پہ جب پہنچے گا دیکھا جائے گا ہم تو ہو بھی آئے لیکن خدا کا شکر ہے زندہ بچ گئے

خواجہ دل محمد ایم۔اے۔ ایم۔آر۔اے
ایس (لنڈن)

رباعی

کُنجِ عزلت میں یادِ ما در آئی — دم ٹوٹ گیا آہ جو لب پر آئی
اُس غنچہ کی صورت چمنستان میں رہے — کھلنے بھی نہ پائے کہ خزاں آئی

نارنگی کے پانچ بیجوں کی سرگذشت

ذیل کا واقعہ اواخر ستمبر ۱۸۸۷ء میں ظہور پذیر ہوا۔

یوں تو سال کے اس حصے میں باد و باران کے طوفان آیا ہی کرتے تھے۔ مگر اس سال اُن کی شدت غیر معمولی تھی۔ دن بھر ہوا نے شور قیامت بپا رکھا۔ اور مینہ کی بوچھاڑ کھڑکیوں کے شیشوں پر ہوتی رہی۔ حتے کہ لنڈن جیسے شہر کی سکونت کے باوجود ہم روزمرہ کے کاروبار سے ہٹ کر کچھ وقت تہذیب انسانی پر حملہ کرنے والی طبعی قوتوں پر غور کرنے لگے۔ جنہیں ہم ان وحشی درندوں سے مثال دے سکتے ہیں جو اپنے جنگلوں کی سلاخوں میں تھوتھنیاں ڈال ڈال کر غیض و غضب کی حالت میں تماشہ بینوں پر دھاڑتے رہتے ہیں۔ جوں جوں غروب آفتاب کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔ طوفان کا شور اور تندی بڑھتی جاتی تھی۔ اور ہوا دودکش میں بچوں کی طرح روتی اور سسکیاں بھرتی معلوم دیتی تھی۔ شرلوک ہولمز۔ آتشدان کے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اور اپنے دل ہی دل میں اپنے تفتیش کردہ جرائم کی فہرست بنا رہا تھا۔ میں دوسری طرف بیٹھا ہوا بحری کہانیوں کی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور اس میں ایسا محو تھا۔ کہ طوفان کے شور و غل کو قصے کا مضمون اور مینہ کی بوچھاڑ کو امواج بحر کی تلاطم خیزی کی علت تصور کر رہا تھا۔

میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھ کر کہا یہ تو گھنٹی کی آواز ہے۔ اسوقت کون ملنے کو آیا ہے؟ شاید آپ کا کوئی دوست ہو۔

شرلوک ہولمز۔ آپ کے سوا میرا کوئی دوست نہیں۔ میں عملاً لوگوں سے

بہت کم ملتا ہوں۔

میں۔ تو کوئی مقدمے والا ہوگا۔

شرلوک ہولمز۔ یہ بات ہے۔ تو کوئی سنگین مقدمہ ہے۔ ورنہ بارش میں اتنی رات گئے کسی کو کیا مصیبت پڑی تھی کہ یہاں آتا۔ لیکن ممکن ہے مالکہ مکان کا کوئی دوست اُسے ملنے آیا ہو۔

شرلوک ہولمز کا قیاس غلط تھا۔ کیونکہ ہمارے دروازے کے سامنے سے قدموں کی آہٹ آئی۔ اور کسی نے دروازے پر آکر دستک دی۔ شرلوک ہولمز نے اپنے لمبے بازو سے لمپ کو اپنی طرف سے ہٹا کر اس کرسی کی طرف پھیر دیا۔ جو نووارد جنٹلمین کے لئے خالی تھی۔

شرلوک ہولمز۔ تشریف لائیے

نووارد ایک نوجوان آدمی تھا زیادہ سے زیادہ کوئی بائیس سال کی عمر ہوگی۔ وضع قطع سے صفائی ٹپکتی تھی۔ لباس عمدہ تھا۔ اطوار سے مذاق کی شستگی اور نفاست ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی چھتری سے پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں اور اُس کے لمبے چمکدار باران کوٹ سے جو پانی سے شرابور تھا۔ موسم کی حالت مترشح ہو رہی تھی لمپ کی تیز روشنی میں اُسنے متفکرانہ انداز سے ادھر اُدھر دیکھا۔ میں نے دیکھا۔ کہ اسکا چہرہ زرد اور اُس کی آنکھیں بہت فکرمند تھیں۔

نووارد۔ ایک سنہری چشمہ آنکھوں پر چڑھا کر) میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں۔ کہ میںنے آپ کی صحبت میں خلل نہیں ڈالا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں طوفان کی بعض علامتوں کو آپ کے نفیس کمرے میں اپنے ہمراہ لے آیا ہوں۔

ہولمز۔ آپ اپنا چھاتہ اور اوورکوٹ مجھے دیجئے۔ یہ اس کھونٹی پر لٹکتے رہینگے اور دم بھر میں خشک ہو جائیں گے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ جنوب مغرب سے تشریف لائے

ہیں۔

نو وارد۔ جی ہاں میں ھورشم سے آرہا ہوں۔

ہولمز۔ یہ مٹی اور کھریا کا مرکب جو آپ کے بوٹ کی نوک پر لگا ہوا ہے۔ اسی سے معلوم ہو رہا تھا۔

نو وارد۔ مجھے آپ سے ایک امر میں استصواب کرنا ہے۔

ہولمز۔ یہ تو آسان بات ہے۔

نو وارد۔ اور مدد بھی لینی ہے۔

ہولمز۔ البتہ یہ ہمیشہ آسان نہیں

نو وارد۔ مسٹر ہولمز! میں آپ کی شہرت سن چکا ہوں۔ مجھے میجر پنڈرگاسٹ نے بتایا کہ آپ ہی نے اس کی جان بچائی تھی۔

ہولمز۔ بیشک۔ اس پر ایک جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔

نو وارد۔ وہ کہتا تھا کہ آپ ہر مشکل کو حل کر سکتے ہیں۔

ہولمز۔ یہ مبالغہ ہے۔

نو وارد۔ وہ کہتا تھا کہ آپ کو ہار کبھی نہیں ہوئی۔

ہولمز۔ میں چار دفعہ ہارا ہوں تین دفعہ تو مردوں سے اور ایک دفعہ ایک عورت سے۔

نو وارد۔ لیکن یہ تعداد آپ کی کامیابیوں کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔

ہولمز۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔ میں عموماً کامیاب ہوتا رہا ہوں۔

نو وارد۔ خدا کرے میرے قضیے میں بھی آپ کو کامیابی ہو۔

ہولمز۔ آپ مہربانی سے اپنی کرسی آگ کے پاس کرلیں اور صورتِ حال سنائیں۔

نو وارد - یہ کوئی معمولی واردات نہیں ہے۔

ہولمز - میرے پاس معمولی وارداتیں نہیں آتیں۔

نو وارد - تاہم میرا خیال ہے کہ جو واقعات میرے گھرانے میں پیش آئے اُن سے زیادہ پُر اسرار اور لاینحل واقعات کا سلسلہ آپ نے اِس سے قبل اپنی ساری عمر میں نہ سنا ہوگا۔

ہولمز - آپ کے بیان سے میری دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ آپ براہ کرم شروع سے لے کر آخر تک تمام ضروری ضروری واقعات بیان کر دیں۔ پھر جن تفصیلی باتوں کی مجھے ضرورت ہوگی۔ وہ میں آپ سے خود پوچھ لونگا۔

نوجوان نے اپنی کرسی آگ کے پاس کھینچ لی۔ اور اپنے گیلے پاؤں آگ کیطرف بڑھا دئے۔

نو وارد - میرا نام جون اوپنشا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ میرے ذاتی معاملات کو اِس خوفناک واقعہ سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ میرے بزرگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس لئے میں ابتدا سے شروع کرتا ہوں۔

میرے دادا کے دو بیٹے تھے۔ میرا چچا الیاس اور میرا باپ یوعث۔ میرے والد کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ جب بائیسکل ایجاد ہوئے تو انہوں نے کارخانہ کی توسیع کر لی اور ان مشینوں کے لئے ربڑ کا پہیہ ایجاد کر کے اُس کے بنانے کا اجارہ حاصل کر لیا۔ اس میں اُن کو اِس قدر کامیابی ہوئی۔ کہ انہوں نے کارخانہ بیچ دیا۔ اور مزے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

چچا الیاس جوانی میں امریکہ چلے گئے۔ اور فلوریڈا میں آباد کارین کر جا بسے۔ وہ بھی وہاں خوش حالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ جب وہاں لڑائی چھڑی تو وہ فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اور کرنیل کے رتبہ تک ترقی کر گئے۔ لڑائی ختم ہوئی تو فلوریڈا میں واپس

چلے آئے۔ سنہ ۱۸۶۹ء یا سنہ ۱۸۷۰ء میں یورپ کو لوٹ آئے۔ اور ہورشم کے قریب ایک چھوٹی سی جاگیر خرید لی۔ انہوں نے امریکہ میں دولت بہت کمائی تھی۔ چونکہ اُن کو حبشیوں سے نفرت تھی اور سلطنت جمہوری نے حبشیوں کو آزادی عطا کر دی تھی۔ اس لئے چچا بیزار ہو کر امریکہ سے واپس چلے آئے۔ وہ نہایت عجیب آدمی تھے۔ تیز مزاج۔ زود رنج غصے میں مغلظات بکنے والے۔ اور تنہائی پسند۔ ہورشم میں جتنی دیر رہے۔ شاید ہی کبھی شہر میں قدم رکھا ہو گا۔ انکے گھر کے گرداگرد ایک باغ اور دو تین کھیت تھے۔ انہی میں وہ کبھی کبھی ورزش کر لیا کرتے تھے۔ لیکن بعض اوقات ہفتوں اپنے کمروں سے باہر نہ نکلتے۔ اُن کو برانڈی اور تمباکو پینے کا بہت شوق تھا لیکن لوگوں سے میل جول قطعی نہ رکھتے تھے۔ اور کسی سے دوستانہ نہ تھا۔ انتہا یہ کہ اپنے بھائی سے بھی نہ ملتے تھے۔ اُن کو میری بھی پرواہ نہ تھی لیکن جب انہوں نے مجھے پہلی دفعہ دیکھا۔ تو میری عمر بارہ سال کے قریب تھی۔ کچھ اتفاق کی بات ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگے۔ سنہ ۱۸۷۸ء کا ذکر ہے۔ اس وقت اُن کو انگلینڈ میں آئے ہوئے آٹھ نو سال ہو گئے تھے۔ انہوں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے انہی کے ساتھ رہنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ میں انکے ساتھ رہنے لگا اور وہ مجھ پر ہر طرح سے شفقت فرمانے لگے۔ چنانچہ جب وہ بدمست نہ ہوتے تو میرے ساتھ نرد کھیلا کرتے۔ انہوں نے نوکروں اور تجارت پیشہ لوگوں کے ساتھ لین دین بھی میرے ہی متعلق کر دیا۔ غرض میری عمر سولہ برس سے متجاوز نہ تھی۔ جبکہ مجھے انکے گھر میں اندر اور باہر سب طرح کا اختیار حاصل ہو گیا۔ چابیاں میرے ہی پاس رہتی تھیں۔ جہاں چاہتا جاتا اور جو چاہتا کرتا تھا بشرطیکہ اس سے اُنکی خلوت میں خلل واقع نہ ہوتا۔ البتہ ایک استثنائی صورت بھی تھی۔ مکان کی آخری منزل پر اسباب کا ایک گودام تھا۔ جو ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ اور جس میں وہ مجھے یا کسی اور کو جانے نہ دیتے تھے۔ میں نے وفور حیرت سے بارہا

دروزوں میں سے اندر جھانکا۔ لیکن بجز ٹرنکوں اور بقچوں کے جو ایسے کمروں میں رکھے جاتے ہیں۔ اور کوئی چیز کبھی نظر نہ پڑی۔

ایک دن (یہ مارچ ۱۸۸۳ء کا ذکر ہے) میں نے چچا کی رکابی کے پاس ایک خط پڑا دیکھا۔ جس پر انگلستان کی مہر نہ تھی۔ انکے پاس خط کا آنا ایک غیر معمولی بات تھی اسلئے کہ سودے سلف کی قیمت وہ ہمیشہ نقد ادا کر دیا کرتے تھے۔ اور دوست اُن کا کوئی تھا ہی نہیں۔ خط اٹھا کر وہ کہنے لگے "یہ ہندوستان سے آیا ہے۔ اور اِس پر پانڈی چری کے ڈاکخانہ کی مہر ہے۔ یہ بھیجا کس نے ہے"؟ انہوں نے جلدی سے خط کھولا۔ تو اُس میں سے نارنگی کے سوکھے ہوئے پانچ بیج اُن کی رکابی میں گرے۔ میں یہ دیکھ کر ہنسنے لگا۔ لیکن جونہی میری نظر اُنکے چہرے پر پڑی۔ میری ہنسی جاتی رہی۔ اُن کا لب لٹک گیا۔ آنکھیں اُبھر آئیں۔ جلد کا رنگ پوٹین کا سا ہو گیا۔ اور وہ لفافے کی طرف جو انہوں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اور چیخکر کہا۔ ک۔ ک۔ ک

خدایا تیری پناہ۔ میری شامت اعمال آخر مجھ پر پڑی۔"

میںنے کہا "کیا بات ہے چچا صاحب؟"

اُنہوں نے کہا "موت" اور میز سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میرا دل ڈر کے مارے دھڑکنے لگا۔ میں نے لفافہ اُٹھایا۔ تو دیکھا کہ جہاں گوند لگی ہوئی ہے۔ اُس سے ذرا اوپر حرف ک سرخی سے تین بار لکھا ہے۔ خط میں بجز پانچ سوکھے بیجوں کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ چچا پر اس قدر خوف کس بات سے طاری ہو گیا۔ میں بھی کھانے کی میز سے اُٹھا اور زینے پر چڑھنے لگا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ اوپر سے آ رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ایک زنگ آلود چابی ہے۔ جو یقیناً اُوپر والے گودام کی تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیتل کا بکس ہے۔ جو شکل سے نقدی کا

صندوقچہ معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے قسم کھا کر کہا "وہ کرلیں جو کچھ کرسکتے ہیں۔ میں بھی اُن کو کامیاب نہ ہونے دونگا۔ مریم کو کہدو کہ میرے کمرے میں آگ جلائے۔ اور فوراً دھیم وکیل کو بلوا بھیجو"۔

میں نے اُنکے حکم کی تعمیل کی۔ جب وکیل آگیا۔ تو مجھے کمرے میں بلایا گیا۔ آگ روشن تھی۔ اور آتشدان میں کچھ جلے ہوئے کاغذ پڑے تھے۔ اور پیتل کا بکس پاس ہی کھلا رکھا تھا۔ میری نگاہ بکس پر پڑی۔ تو میں نے دیکھا کہ بکس پر وہی حروف کُ اُسی طرح تین دفعہ لکھا ہوا تھا جیسے صبح والے لفافے پر۔

چچا نے مجھ سے کہا۔ جون! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے وصیت نامے کے گواہ بنو۔ میں اپنی تمام جائداد اُس کے نفع اور نقصان سمیت تمہارے باپ کے نام چھوڑتا ہوں۔ اُن سے بالآخر یہ تمہیں ملے گی۔ اگر تم اِس سے اُن کے ساتھ منتفع ہوسکو۔ تو فبہا نہیں تو اِسے اپنے بڑے سے بڑے دشمن کے حوالے کردینا۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں تمہیں ایسی چیز دے رہا ہوں۔ جو خالی از خدشہ نہیں لیکن مجھے معلوم نہیں۔ کہ کیا واقعات ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔ مہربانی سے جہاں مسٹر فورڈھم بتلاتے ہیں دستخط کردو"۔

میں نے اُنکی ہدائت کے مطابق دستخط کردئے۔ اور وکیل وصیت نامہ ساتھ ہی لیگیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس عجیب واقعہ نے مجھپر کیسا گہرا اثر ڈالا ہوگا۔ میں نے اسپر غور کیا اور اُس کو ذہن میں اُلٹا پلٹتا رہا۔ مگر اسکا سر پیر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اِس واقعہ سے جو خوف میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں اُس کو دور نہ کرسکا۔ لیکن وقت گذرنے پر اُس کا اثر کم ہوتا گیا۔ ہفتوں تک ہماری زندگی کے معمولی حالات بدستور قائم رہے۔ مگر میرے چچے کی حالت متغیر ہونے لگی۔ وہ شراب زیادہ پینے لگے اور لوگوں سے میل جول رکھنے سے انہیں بیش از پیش نفرت ہوگئی۔ اکثر اوقات وہ اپنے کمرے کو اندر سے مقفل کرلیتے۔ اور چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ البتہ گاہے گاہے

وہ اپنی بدمستی کے جوش میں پستول ہاتھ میں لے کر گھر سے نکل بھاگتے اور باغ میں اچھل اچھل کر کود کود کر یہ کہتے۔ کہ میں کسی آدمی کے بیچھے سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ اور یہ ناممکن ہے۔ کہ آدمی یا شیطان مجکو بھیڑوں کی طرح باڑے میں بند کر رکھے۔ لیکن جونہی یہ جوش و خروش فرو ہو جاتا۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگتے اور کمرے میں آ گھستے اور دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا کر تالا لگا لیتے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ دراصل انکے سویدائے قلب پر خوف مسلط ہے۔ اور وہ زیادہ دیر تک اپنے تئیں خطرے میں نہیں رکھ سکتے۔ ایسے موقعوں پر سردی کے دنوں میں بھی اسکا چہرہ پسینے سے اس طرح تر ہو جاتا۔ گویا ابھی منہ دھو کر اٹھے ہیں۔

اب میں بات کو بھی ختم کروں۔ آپ تو اکتا گئے ہونگے۔ مختصر یہ کہ ایک رات کو اسیطرح بدمستی کے جوش میں باہر گئے۔ اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ ہم لوگ انکی تلاش میں نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ باغ کے ایک چھوٹے سے ڈبرے کے پاس جسپر کائی جمی تھی۔ اوندھے منہ پڑے ہوئے ہیں۔ انکے جسم پر کسی طرح کا کوئی نشان نہ تھا۔ چونکہ پانی صرف دو ہی فٹ گہرا تھا۔ اس لئے پنچایت نے انکی شعور غیر مستقیم طبعی کی بنا پر خودکشی کا فتوے دیا۔ لیکن چونکہ میں جانتا تھا۔ کہ وہ موت کے نام تک سے بھاگتے تھے۔ مجھے باور نہ آیا کہ انھوں نے خودکشی کا ارتکاب کیا ہوگا۔ بات گئی گذری ہوئی اور میرے والد جائداد پر قابض ہو گئے۔ ۱۴ ہزار پونڈ جو چچا کے نام پر بنک میں جمع تھے۔ وہ بھی انھی کو ملے۔

ہولمز۔ ذرا ٹھیرئے۔ بیشک آپ کا بیان منجملہ ان نہایت عجیب واقعات کے ہے جو میں نے آج تک سنے ہیں۔ آپ کے چچا کو خط کونسی تاریخ ملا تھا اور انکی مفروضہ خودکشی کس تاریخ کو عمل میں آئی تھی۔

جون اوپنشا۔ ۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء کو خط ملا اور انکی موت ۷ ہفتے بعد ۲ مئی کی شب کو

واقعہ ہوئی۔

ہولمز۔ آپ کا شکریہ۔ اب آگے چلئے۔

جون او پنشا۔ جب میرے والد نے ہورشم کی جائداد پر قبضہ کیا۔ تو میری درخواست پر بالائی منزل کے گودام کو جو ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ نہایت غور سے دیکھا بھالا۔ پیتل کا بکس وہاں موجود تھا۔ گو اُس میں جو کاغذ تھے۔ وہ تلف کئے جا چکے تھے۔ ڈھکنے کے اندر کی جانب ایک کاغذ کی چٹ پر ک ک ک لکھا ہوا تھا۔ اور اُس کے نیچے یہ الفاظ لکھے تھے "خطوط۔ یادداشتیں۔ رسیدیں۔ اور ایک رجسٹر" میں سمجھتا ہوں کہ کرنیل اوپنشا نے جن کاغذات کو تلف کیا تھا۔ وہ یہی تھے جو اس چٹ سے ظاہر ہوتے تھے۔ اور کوئی قابل ذکر بات اس کمرے کے متعلق نہ تھی۔ کمرے میں چند متفرق کاغذات اور نوٹ بکیں بھی ملیں۔

ان سے معلوم ہوتا تھا کہ چچا کی زندگی امریکہ میں کس طرح گذرتی رہی۔ بعض نوزمانہ جنگ کے متعلق تھے۔ اُن سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے فرض کو اچھی طرح سے ادا کرتے رہتے تھے اور لوگ ان کو بہادر اور جری تصور کرتے تھے۔ کچھ کاغذات جنوبی اضلاع کے انتظام جدید سے تعلق رکھتے تھے۔ اور انہیں سیاسی معاملات کا ذکر تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ چچا نے اُن سیاسی لوگوں کی مخالفت میں جو شمالی اضلاع سے بھیجے جاتے تھے۔ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ غرض ۱۸۸۴ء کے آغاز میں میرے والد ہورشم میں آکر رہنے لگے۔ جنوری ۱۸۸۵ء تک سب کام درست رہا۔ نوروز کے چوتھے دن جب کہ ہم کھانے کی میز پر بیٹھے ناشتا کھا رہے تھے۔ میرے والد نے حیرت سے چیخ ماری۔ ایک کھلا ہوا نیا لفافہ اُنکے ایک ہاتھ میں تھا۔ اور دوسرے ہاتھ کی کھلی ہتھیلی پر نارنگی کے پانچ سوکھے ہوئے بیج رکھے تھے۔ میں جب چچا کے متعلق اسی قسم کا واقعہ والد کو سنایا کرتا تھا۔ تو وہ ہنس کر کہا کرتے تھے کہ یہ چڑیا چڑے کی کہانی تم نے کہاں سے سنی ہے لیکن اب جب کہ وہی واردات اُن کو

پیش آئی- تو بہت حیران اور خوف زدہ نظر آنے لگے-
والد صاحب (لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے) جون! اس کا مطلب کیا ہے؟
میں دھک رہ گیا- میں نے کہا ابا جان یہ تو وہی ک ک ک ہے-
انہوں نے لفافے کے اندر کی جانب کو دیکھا اور کہا" ہاں" یہ وہی حروف ہیں- لیکن یہ اوپر کیا لکھا ہے؟
میں نے ان کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا- لفافے پر لکھا تھا" کاغذات دھوپ گھڑی پر رکھ دو"
والد صاحب- کون سے کاغذات؟ کون سی دھوپ گھڑی؟
میں- وہ دھوپ گھڑی جو باغ میں ہے- اور کوئی نہیں ہو سکتی- لیکن کاغذات تو وہی ہیں جو تلف کئے جا چکے ہیں-
والد صاحب (حوصلے سے) ہش! ہم ایک مہذب ملک میں رہ کر ایسی بیہودہ باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے- یہ چیز آئی کہاں سے ہے؟
میں (لفافہ کی مہر دیکھ کر) ڈنڈی سے
والد صاحب- یہ کوئی نامعقول مسخرا ہے- بھلا مجھے دھوپ گھڑیوں اور کاغذوں سے کیا واسطہ؟
میں ایسی لغویت کی کوئی پروا نہیں کرتا؟
میں- ہمیں پولیس میں اطلاع کر دینی چاہئے-
والد صاحب- تاکہ ہمارا مضحکہ اڑایا جائے؟ ہرگز نہیں-
میں- اچھا تو مجھے اجازت دیجئے- میں اطلاع کر دیتا ہوں
والد صاحب- نہیں نہیں- میں تمہیں منع کرتا ہوں- میں نہیں چاہتا کہ ایسی بیہودہ بات مشہور ہو-

خط کے وصول ہونے کے چار دن بعد والد نے اپنے ایک پُرانے دوست کی ملاقات کے لئے گئے۔ یہ امر میرے لئے باعثِ مسرت تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا۔ کہ گھر سے باہر رہنے میں اُن کو کوئی اندیشہ نہیں لیکن میری غلطی تھی۔ اُنکے جانے کے دوسرے دن مجھے ایک تار ملا جس میں والد صاحب کے دوست نے مجھے فوراً آنے کو کہا تھا۔ کیونکہ والد صاحب کھڑیا کے ایک غار میں جو اس نواح میں بکثرت پائے جاتے ہیں گر گئے تھے۔ جس سے اُن کی کھوپری چور چور ہو گئی تھی۔ اور وہ بالکل بے ہوش تھے میں بسرعت تمام وہاں پہنچا۔ لیکن وہ ہوش میں نہ آئے۔ اور اسی حالت میں اُنکا انتقال ہو گیا۔ وہ غروب آفتاب کے وقت باہر سے آ رہے تھے۔ اور چونکہ اس نواح سے واقف تھے۔ اور غار پر کوئی کٹہرا لگا ہوا نہ تھا۔ اس لئے جیوری نے فیصلہ کیا کہ موت اتفاقی تھی۔ اُنکی موت کے متعلق ہر ایک واقعہ پر میں نے غور کیا۔ کسی بات سے قتل کے خیال کی تائید نہ ہوتی تھی۔ کوئی علامت انکے جسم پر نہ تھی۔ کوئی نشاناتِ قدم موجود نہ تھے۔ مال کا کوئی نقصان نہ ہوا تھا۔ سڑکوں پر کسی کو کوئی اجنبی آدمی نہ دکھائی دیا۔ تاہم میرا دل مطمئن نہ تھا۔ اور مجھے قریباً یقین تھا کہ کوئی مکروہ سازش اُنکی جان لینے کے لئے کی گئی ہے۔

جنوری ۱۸۸۵ء میں والد کی موت واقع ہوئی۔ اور ۲ سال ۸ ماہ اس کو ہوئے ہیں میں اس عرصے میں ہورشم میں آرام سے رہا ہوں۔ مجھے امید ہونے لگی تھی۔ کہ یہ لعنت ہمارے گھر سے اُٹھ گئی ہے اور پچھلی پشت پر ختم ہو گئی۔ لیکن یہ امید قبل از وقت تھی کل وہی وار جو والد پر ہوا تھا مجھ پر بھی ہوا۔

نوجوان نے اپنی صدری کی جیب سے ایک مڑا تڑا لفافہ نکالا اور میز پر اس میں سے نارنگی کے پانچ چھوٹے چھوٹے سوکھے ہوئے بیج نکال کر ڈالے۔ اور کہا "یہ وہ لفافہ ہے اس پر لنڈن کی مُہر ہے۔ شہر کے شرقی حصے سے خط روانہ ہوا ہے۔ والد صاحب کو جو لفافہ

آیا تھا۔ اس پر بھی بعینہٖ صرف ک ک ک" اور یہی عبارت کا غذات دھوپ گھڑی پر رکھ دو"
لکھی ہوئی تھی

ہولمز۔ تو آپ نے کیا کیا؟

اوپنشا۔ کچھ نہیں

ہولمز۔ کچھ نہیں؟

اوپنشا نے اپنا چہرہ اپنے پتلے سفید ہاتھوں پر رکھ لیا اور کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں بالکل مایوس ہوں۔ میری حالت اُس خرگوش کی سی ہے۔ جو اپنی طرف سانپ کو آتا ہوا دیکھتا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا میں کسی جفاکیش اور طاقتور بھوت کے قبضۂ قدرت میں ہوں۔ جس سے کوئی پیش بینی یا کوئی احتیاط مجکو بچا نہیں سکتی۔"

ہولمز۔ اجی حضرت آپ کو حوصلے سے کام لینا چاہئے۔ ورنہ آپ کی جان کی خیر نہیں۔ یہ مایوسی کا وقت نہیں ہے۔ بجز ہمت کے آپ کا بچنا محال ہے۔

جون اوپنشا۔ میں پولیس کو اطلاع دے چکا ہوں۔

ہولمز۔ پھر

جون اوپنشا۔ وہ میری بات سنکر ہنس دیئے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ انسپکٹر پولیس کی رائے میں یہ چٹھیاں تمام تمسخر کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ اور میرے عزیزوں کی موت جیوری کی رائے کے مطابق اتفاقی حوادث سے وقوع میں آئی ہے۔ اور اُس کو چٹھیوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہولمز نے غصے سے مٹھی بند کر کے بازو کو زور سے حرکت دی۔ اور کہا یہ عجیب سادہ لوحی ہے۔

جون اوپنشا "تاہم پولیس نے ایک سپاہی میرے ساتھ کر دیا۔ جو میرے گھر پر متعین کر دیا گیا ہے۔

ہولمز۔ وہ آج رات آپ کے ساتھ آیا ہے؟

جون اوپنشا۔ نہیں اس کو گھر پر رہنے کا حکم ملا تھا۔

ہولمز نے پھر غصے سے مٹھی بند کی اور بازو کو زور سے جھٹکایا۔ اور کہا۔ تو آپ میرے پاس کیوں آئے؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ فوراً کیوں نہ آئے۔

جون اوپنشا۔ مجھے علم نہ تھا۔ یہ تو آج میجر پرنڈرگاسٹ سے میں نے اپنی مصیبت کا تذکرہ کیا۔ تو اس نے مجھے مشورہ دیا۔ کہ میں آپ سے ملوں۔

ہولمز۔ خط کو آئے ہوئے دو دن ہو چکے ہیں۔ ہمیں چاہئے تھا کہ اس سے قبل ضروری کارروائی کر چکے ہوتے۔ جو واقعات آپ نے بیان کئے ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی تفصیلی بات جس سے سراغ چلانے میں کچھ مدد ملے۔ آپ کو معلوم ہے؟

جون اوپنشا۔ (ایک اور بات ہے (اس نے اپنی کوٹ کی ایک جیب ٹٹول کر ایک نیلا سا کاغذ جس کا رنگ اب مات پڑ چکا تھا۔ نکالا اور میز پر کھول کر رکھ دیا) مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ جس دن چچا نے کاغذ جلائے تھے۔ اس دن میں نے دیکھا تھا کہ کاغذوں کے نا سوختہ کونے اس کاغذ کے رنگ کے تھے۔ یہ ورق انکے کمرے کے فرش پر میں نے پڑا پایا۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ انکے کاغذات میں سے یہ ورق اڑ کر الگ جا پڑا۔ اور جلنے سے محفوظ رہا۔ اس میں بیجوں کا تو البتہ ذکر پایا جاتا ہے۔ لیکن اور کسی طرح یہ مفید مطلب نہیں ہو سکتا میرے خیال میں یہ کسی پرائیویٹ روزنامچہ کا ورق ہے۔ خط بلاشبہ چچے کا ہے صفحہ کے اوپر لکھا تھا" مارچ ۱۸۶۹ء" اور نیچے ذیل کی معمادار عبارتیں درج تھیں۔

"۴ مارچ۔ ہڈسن آیا۔ وہی پرانا پلیٹ فارم۔

۷ مارچ۔ بیج مک کالی۔ پیرا مور اور جان سوین پر رکھے گئے۔

۹ مارچ۔ جان سوین کا فیصلہ ہوا۔

۱۲۔ مارچ۔ پیرا مور سے ملاقات ہوئی سب طرح سے خیریت ہے"

ہولمز نے کاغذ تہ کر کے جان اوپنشا کو واپس دے دیا اور کہا "آپ کا شکریہ ہے۔ مہربانی سے ایک لمحہ ضائع نہ کیجئے۔ اب تو اتنا وقت بھی نہیں ہے۔ کہ آپ کے بتائے ہوئے واقعات پر بحث کی جا سکے۔ آپ فوراً گھر کو لوٹ جائیں اور جو کچھ میں کہتا ہوں۔ وہ کریں۔"

اوپنشا۔ وہ کیا؟

ہولمز۔ جو کاغذ آپ نے مجھے دکھایا ہے۔ اس کو پیتل کے اس بکس میں رکھ دیں جس کا آپ ذکر کر رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ایک کاغذ پر لکھ دیں۔ کہ باقی کاغذات میرے چچا نے جلا دئے تھے۔ صرف یہی کاغذ باقی ہے۔ الفاظ ایسے لکھئے جس سے یقین آ جائے کہ آپ سچ کہتے ہیں۔ بس پھر بکس کو حسب ہدایت دھوپ گھڑی پر رکھ دیجئے۔ آپ سمجھ گئے؟

اوپنشا۔ جی ہاں!

ہولمز۔ سر دست انتقام لینے کا کوئی خیال نہ کیجئے۔ کیونکہ ہم بعد میں قانون کی مدد سے اُن لوگوں کو اُنکے کیفر کردار تک پہنچا سکینگے۔ بالفعل ہمیں اپنا جال بنانا ہے۔ حالانکہ انکا بنا بنایا تیار ہے۔ سب سے اوّل تو آپ کو اِس خطرے سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جس سے آپ کو بہت اندیشہ ہے پھر البتہ اِس راز کا انکشاف اور مجرموں کی سزا دہی کی فکر کرنی چاہئے۔ نوجوان نے اُٹھ کر اوورکوٹ پہن لیا۔ اور کہا۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ آپ کی باتوں سے میری جان میں جان آئی ہے۔ اور کچھ امید بندھ چلی ہے۔ میں آپ کی ہدایتوں پر کاربند ہونگا۔

ہولمز۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ اِس اثنا میں اپنی جان کی حفاظت کیجئے۔ کیونکہ بلاشبہ آپ کی جان سخت خطرے میں ہے۔ آپ گھر کو واپس کسطرح جائینگے؟

اوپنشا۔ ریل کے ذریعے۔ واٹرلو سٹیشن سے سوار ہونگا۔

ہولمز۔ ابھی نو نہیں بجے۔ اور گلیوں میں ابھی بھیڑ بھاڑ بھی باقی ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں۔ کہ آپ بے خطر جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ آپ جس قدر بھی احتیاط کریں تھوڑی ہے۔

اوپنشا۔ میں مسلح بھی ہوں۔

ہولمز۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں کل اِس معاملہ کی تفتیش شروع کرونگا"

اوپنشا۔ توکیا آپ ہورشم میں تشریف لائیں گے؟۔

ہولمز۔ نہیں۔ اِس راز کا انکشاف لنڈن میں ہو سکتا ہے۔ اور وہیں میں اس کو ڈھونڈ لونگا۔

اوپنشا۔ تو میں دو ایک دن میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونگا۔ اور بکس اور کاغذوں کے متعلق جو بات ظہور میں آئے گی۔ اُس سے اطلاع دونگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اِس معاملے کی ہر شق میں میں آپ کے مشورے سے فائدہ اُٹھاؤں۔

اُس نے ہم سے ہاتھ ملائے اور رخصت ہوا۔ باہر ہوا بدستور چیخ رہی تھی۔ اور کھڑکیوں پر بوچھاڑ بھی بدستور ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ قصہ جو ہمیں سنایا گیا۔ یہ بھی اربعہ عناصر کے دیوانہ وار جوش و خروش ہی نے ہماری طرف بھیجا تھا (جیسے طوفان سمندری گھاس اِدھر اُدھر سے دھکیل کر لاتا ہے) اور اب واپس منگا لیا تھا۔

شرلاک ہولمز کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اُس کا سر آگے کو جھکا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں سرخ سرخ شعلوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے پائپ کو سلگایا اور دھوئیں کے سیاہ سیاہ حلقوں کو جو ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے چھت کی طرف چڑھنے لگے تھے۔ دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے کہا۔

واٹسن! جتنے مقدمے میرے پاس آئے ہیں۔ اُن میں ایسا عجیب تو شائد ایک

بھی نہ تھا۔

میں۔ شاید وہ چار نشانوں والا مقدمہ اسی قسم کا تھا۔

ہولمز۔ ٹھیک کہتے ہو بے شک وہ مقدمہ اسی قسم کا تھا لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ جان اوپنشا کی حالت شولٹوں سے بھی زیادہ اندیشناک ہے۔

میں۔ لیکن آپ نے یہ بھی سوچا۔ کہ وہ خطرہ ہے کس قسم کا؟

ہولمز۔ خطرے کی نوعیت میں

میں۔ وہ خطرہ کیا ہے؟

شرلوک ہولمز نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنی کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر رکھ لیں اور انگلیوں کے سروں کو ملا لیا۔ اور کہنے لگا۔ قیاس کا کمال یہ ہے۔ کہ اگر آدمی کو ایک منفرد واقعہ اور اس کے تمام پہلو بتا دیے جائیں۔ تو وہ اس ایک واقعہ سے صرف پہلے واقعات کا تمام سلسلہ ہی مستخرج نہ کرے بلکہ بعد میں جو نتائج اس سے مترتب ہوئے وہ بھی بتا سکے۔ کہتے ہیں۔ کہ کوویر ایک ہڈی کے مشاہدہ سے سارے حیوان کی بناوٹ صحیح طور پر بیان کر دیتا تھا۔ اسی طرح مشاہدہ کرنے والے کو اگر سارے سلسلۂ واقعات میں سے صرف ایک واقعہ کو اچھی طرح سے سمجھ لینے کا موقعہ دے دیا جاوے۔ تو لازم ہے کہ وہ اس سے پہلے اور پچھلے واقعات تمام و کمال صحیح طور پر بتا سکے۔ ہم لوگوں کو قوتِ عقلیہ کے کمالات پر ابھی پوری طرح سے آگاہی نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ کمرۂ مطالعہ میں بیٹھ کر ہی ان متعلق مسائل کی گتھیوں کو جن کو حواس کے ذریعے کھولنے میں کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ عقل کے ذریعے کامل طور پر سلجھا دیا جائے۔ البتہ قوتِ عقل پوری طرح تب مدد دے سکتی ہے۔ جب کہ قیاس کرنے والا تمام واقعات سے جو اس کو معلوم ہوں کام لے سکے۔ اور یہ وہ بات ہے۔ جو ہمارے زمانے میں بھی جب کہ مفت تعلیم اور انسائیکلوپیڈیوں (جامع العلوم کتابوں) کا عام رواج ہے۔ نادر الوجود ہے۔ تاہم اتنا

تو ممکن ہے۔ کہ آدمی اس قدر علم جتنا اُس کو اپنے کام میں درکار ہے۔ کامل طور پر حاصل کرے۔ کم از کم میں نے تو اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہی کیا ہے۔ اگر مجھے ٹھیک یاد ہے۔ تو آپ نے اِن دنوں میں جب ہماری دوستی شروع ہوئی تھی۔ میرے معلومات کو جامع الفاظ میں بیان کیا تھا۔

میں (ہنسکر) ہاں ہاں، وہ بھی ایک عجیب تحریر تھی۔ اُس میں لکھا تھا۔ کہ فلسفہ ہیئت سیاست مدن میں آپ کے معلومات کالعدم ہیں۔ نباتات کا بھی صحیح علم حاصل نہیں۔ علم طبقات الارض کی اِس شق میں آپ کو کمال ہے۔ کہ شہر سے پچاس پچاس میل تک کے پھیر میں کسی جگہ کی مٹی کا داغ ہو۔ آپ پہچان لیں گے۔ علم کیمیا میں بھی چنداں دخل نہیں۔ تشریح الاجسام کی تعلیم باقاعدہ نہیں حاصل کی۔ سنسنی پیدا کرنے والے قصوں اور جرائم سے آگاہی ہے۔ کہ اُس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ستار بجا سکتے ہیں۔ قانون میں بھی دخل۔ اور کوکین اور تمباکو سے اپنے تئیں دانستہ مسموم کر چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں میری تجزیہ کے ارکان تھے۔

آخری بات کے سننے سے ہولمز کھلکھلا کر ہنسا۔

ہولمز۔ خیر تو میں اب بھی وہی بات کہتا ہوں۔ جو پہلے کہتا رہا ہوں۔ کہ آدمی کو دماغ کی کوٹھڑی میں صرف وہی سامان رکھنا چاہئے۔ جس کے استعمال کرنے کی ضرورت اُس کو پڑ سکتی ہے۔ باقی اسباب اپنی لائبریری کے گودام میں رکھنا چاہئے تاکہ ضرورت کے وقت وہاں سے کام لیا جائے۔ آپ مہربانی سے اس امریکن اینسائیکلوپیڈیا کی جو آپ کے پاس تختے پر پڑی ہے۔ صرف ک والی جلد مجھے نکال دیں "مہربانی"! ۔ اب آئیں ان حالات پر غور کر کے کچھ نتیجہ نکالیں۔ پہلے تو ہمیں یہ فرض کر لینا چاہئے کہ کرنل اوپنشا کسی معقول وجہ کے بغیر امریکہ کی رہائش نہ چھوڑی تھی۔ لوگ بڑھاپے میں اپنی عادت نہیں بدلا کرتے۔ اور فلوریڈا جیسے ملک کی دلکش آب و ہوا کو چھوڑ کر انگلستان

کسی شہر میں رہنا یوں بھی بلا وجہ اختیار نہیں کیا جا سکتا وہ تنہا رہنے کا شائق تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی چیز یا کسی آدمی سے خوف لاحق تھا۔ اس لئے ہم قیاس میں مدد لینے کے خیال سے تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہ وہ امریکہ سے کسی چیز یا کسی آدمی کے خوف کی وجہ سے بھاگ آیا تھا۔ وجہ خوف کا سراغ اُن خوف ناک خطوط میں تلاش کرنا چاہئے جو اُس کو اور اُس کے وارثوں کو آتے رہتے ہیں۔ آپ نے اِن خطوط کی مہروں پر بھی خیال کیا؟

میں۔ پہلا پانڈیچری سے آیا۔ دوسرا ڈنڈی سے اور تیسرا لنڈن سے

ہولمز۔ ہاں لنڈن کے مشرقی حصے سے۔ اس سے آپ کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔

میں۔ یہ تمام مقامات بندرگاہیں ہیں۔ لکھنے والا ضرور کسی جہاز پر سوار تھا۔

ہولمز۔ بہت خوب۔ اس سے کچھ سراغ چلے گا۔ بلا شبہ گمان گذرتا ہے۔ نہائت قوی گمان۔ کہ چٹھیوں کے لکھنے والا جہاز پر سوار تھا۔ اب ایک اور بات غور طلب ہے۔ پانڈی چری سے جو تنبیہ آئی۔ اُس کے اور قتل کے درمیان ۷ ہفتہ کا وقفہ ہوا۔ ڈنڈی والے واقعہ میں ۳-۴ دن کا وقفہ ہوا اس سے کچھ پتہ ملتا ہے؟

میں۔ یہ کہ پہلی صورت میں زیادہ فاصلہ طے کرنا تھا۔

ہولمز۔ لیکن خط کو بھی تو زیادہ فاصلہ طے کرنا تھا۔

میں۔ تو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔

ہولمز۔ خیر ایک بات تو صاف ہے۔ کہ ایک یا زیادہ آدمی جو ان جرموں کے مرتکب ہیں۔ بادبانی جہاز میں سوار ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کی نیت سے روانہ ہونے سے قبل وہ ہمیشہ اپنی عجیب و غریب تنبیہ روانہ کر دیتے ہیں۔ جب خط ڈنڈی سے آیا۔ تو جرم کا ارتکاب بہت جلد ہوا اگر وہ پانڈی چری سے کسی دخانی جہاز میں آتے تو خط کے ساتھ ساتھ ہی وہ بھی آ پہنچتے۔ لیکن ۷ ہفتے کا جو وقفہ ہوا۔ تو غالباً

اس لئے کہ لکھنے والا تو بادبانی جہاز میں آہستہ آہستہ آیا۔ اور خط ڈاک کے جہاز میں

میں۔ ممکن ہے۔

ہولمز۔ ممکن ہی نہیں بلکہ اغلب ہے۔ اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا۔ کہ اس معاملہ میں کسقدر جلدی کی ضرورت ہے۔ اسیوجہ سے مینے نوجوان اوپنشا کو محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔ ان لوگوں کو راستہ طے کرنے میں جتنا وقت لگتا ہے۔ اس کے فوراً بعد جرم کا ارتکاب ہوجاتا ہے۔ اور چونکہ یہ خط لنڈن سے آیا ہے۔ اس لئے وقفہ کوئی محسوب نہ کرنا چاہئے

میں۔ اس بے دردانہ غارت گری سے کیا مدعا کیا ہے؟

ہولمز۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اوپنشا کے پاس جو کاغذات تھے۔ وہ ایک یا زیادہ آدمیوں کے لئے جو بادبانی جہاز میں سوار ہیں۔ بیحد اہمیت رکھتے ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ کئی آدمی اس میں شامل ہیں۔ ایک آدمی دو قتل اس صفائی سے کب کر سکتا تھا۔ کہ جیوری تک کو دھوکا ہوجائے۔ اسمیں ضرور کئی آدمی شامل ہیں۔ اور ہیں بھی نہایت عیار اور مستقل مزاج۔ وہ اپنے کاغذ واپس لینا چاہئے۔

میں۔ چاہے وہ کسی کے پاس ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے۔ تو ک ک ک کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔ بلکہ عیاروں کی کوئی جماعت ہے۔

میں۔ لیکن وہ ہیں کون؟

شرلوک ہولمز نے آگے کو سر جھکایا اور آہستہ سے کہا۔ کیا آپ نے کوکلکس کلین کا نام نہیں سنا۔

میں۔ نہیں۔

ہولمز نے اس کتاب کے جو اس کے گھٹنے پر پڑی تھی کئی ورق الٹ کر یہ لفظ نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ کوکلاکس کلین۔ یہ آواز بندوق کا گھوڑا چڑھانے میں نکلتی ہے۔ اور اسی خیالی شابہت کی وجہ سے یہ مرکب وضع کیا گیا۔ جنوبی اضلاع متحدہ امریکہ

کے بعض سپاہیوں نے خانہ جنگی کے بعد اِس نام کی ایک خوفناک خفیہ کمیٹی بنالی اور ملک کے مختلف حصوں میں خصوصاً لوئیسیانہ ۔ کیرولینا ۔ جارجیا ۔ فلوریڈا میں اس کی مقامی شاخیں بہ سرعت تمام بن گئیں ۔ یہ کمیٹی اپنی قوتوں کو سیاسی معاملات میں صرف کرتی تھی ۔ خصوصاً اس غرض سے کہ حبشی ووٹ دینے والوں کو خوف دلایا جائے ۔ یہ کمیٹی اپنے دشمنوں کو یا تو قتل کر دیتی تھی ۔ یا ملک سے بھگا دیتی تھی ۔ قتل سے پہلے تنبیہ کے طور پر مخصوص آدمی کو ایک عجیب لیکن مشہور طریق سے آگاہ بھی کر دیتے تھے ۔ شاہ بلوط کی پتہ وار ٹہنی کبھی خربوزے یا سنگترے کے بیج کا استعمال کرتے تھے ۔ جب یہ چیزیں کسی کے پاس پہنچتیں ۔ تو اس کو لازم تھا کہ علانیہ اپنے اطوار سے باز آ جاتا ۔ یا ملک سے بھاگ جاتا ۔ اگر وہ اِس تنبیہ کی پرواہ نہ کرتا ۔ تو یقیناً اس کو قتل کروایا جاتا تھا اور قتل بھی اِس طریق سے ۔ کہ کسی کو اسکا وہم و گمان بھی نہ ہوتا ۔ اس کمیٹی کا کام ایسا عمدہ اور کام کرنے کا طریق ایسا باقاعدہ تھا کہ ایسی ایک صورت بھی معلوم نہیں جس میں کوئی آدمی بھی انکی زد سے بچ نکلا ہو یا کوئی مجرم گرفتار کر لیا گیا ہو ۔

باوجودیکہ اضلاع متحدہ کی حکومت اور جنوبی اضلاع کے نیک لوگوں نے بہت کوشش کی تاہم یہ کمیٹی برسوں تک اپنا کام کرتی رہی ۔ لیکن بالآخر ۱۸۶۹ء میں یک لخت ٹوٹ گئی گو گاہے گاہے اب بھی ویسے ہی واقعات ہوتے رہتے ہیں ۔"

ہولمز (کتاب رکھ کر) آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ سوسائٹی کا ناگہاں ٹوٹ جانا اور اوپنشا کا امریکہ سے اُن کے کاغذات لے کر روپوش ہو جانا ایک ہی وقت میں واقع ہوا ۔ عجب نہیں کہ اِن دو باتوں میں علت و معلول کا تعلق ہو ۔ اس لئے تعجب نہیں کہ اس کمیٹی کے چند دلیر آدمی اوپنشا اور اس کے گھرانے کی تخریب کے درپے ہوں ۔ یہ تو آپ سمجھ سکتے ہیں ۔ کہ اس رجسٹر اور ڈائری کی مدد سے جنوبی اضلاع کی ایسی

کمیٹی کے چند اکابر قانون کے پنجے میں آ سکتے ہونگے۔ جب تک کہ یہ کاغذات واپس نہ لے لئے جاویں

میں "تو جو ورق مینے دیکھا ہے وہ ———"

ہولمز (بات کاٹ کر) "وہ ایسا ہی ہے جیسا ہم کو توقع تھی۔ اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو اس میں لکھا تھا کہ بیج فلاں فلاں کو بھیجے گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ کمیٹی کیطرف سے انکو تنبیہ کی گئی ہے بعد کے اندراجات یہ تھے کہ فلاں فلاں کا صفایا کر دیا گیا یا وہ ملک چھوڑ گئے اور یہ کہ فلاں سے ملاقات کی گئی جس کا نتیجہ یقیناً اس کے حق میں اچھا نہ ہوا ہوگا۔ خیر ڈاکٹر صاحب ! میں خیال کرتا ہوں کہ ہمیں اس تاریکی پر کچھ روشنی ڈالنی چاہیئے اور اس اثنا میں نوجوان اوپنشا کے بچنے کی یہی صورت ہے کہ وہ میری ہدایتوں پر کاربند رہے"

صبح کو مطلع صاف تھا اور سورج اس مدھم رنگ کے برقعہ کے پیچھے جو شہر لنڈن پر پڑا رہتا ہے۔ ماند روشنی سے چمک رہا تھا۔ جب میں نیچے اترا تو شرلاک ہولمز کھانے کی میز پر بیٹھا تھا۔

ہولمز۔ مجھے معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کا انتظار نہیں کیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ نوجوان اوپنشا کے مقدمے میں مجھے دن بھر مصروف رہنا ہوگا۔

میں۔ آپ کیا کرینگے ؟

ہولمز۔ کارروائی منحصر ہے میری پہلی تحقیقات کے نتائج پر۔ شاید مجھے ہورشم میں بھی جانا پڑے۔

میں۔ آپ پہلے وہاں نہ جائینگے ؟

ہولمز۔ نہیں۔ میں شہر میں کارروائی شروع کرونگا۔ آپ گھنٹی بجائیں تاکہ خادمہ آپ کے لئے قہوہ لائے۔

میں قہوہ کے انتظار میں تھا۔ میز پر ایک تازہ اخبار بند پڑا تھا۔ میں نے اُٹھا کر کھولا

جونہی دیکھنے لگا - میری نظر ایک عبارت پر پڑی تو میں نے چیخ کر کہا " ہولمز! تم نے بہت دیر کر دی۔"

ہولمز (پیالہ ہاتھ سے رکھ کر) اُف! مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا! صورت واقعہ کیا ہوئی ہے؟" وہ متانت سے باتیں کر رہا تھا گو میں دیکھ رہا تھا کہ اس واقعہ کا اثر اُس کے دل پر بہت زیادہ ہُوا۔

میں - میری نظر اوپنشا کے نام اور اس عنوان پر پڑی ہے - " واٹر لو کے پل کے پاس ایک مہلک حادثہ "

لکھا ہے کہ کل رات ۹-۱۰ بجے کے درمیان کانسٹبل کُک نے جو واٹر لو کے پل کے پاس متعین تھا - ایک آدمی کی چیخ پکار اور پانی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی - لیکن رات اندھیری اور نہایت طوفان خیز تھی اس لئے باوجود چند آدمیوں کی تگ و دو کے بھی اُس کی جان نہ بچائی جا سکی تاہم الارم بجایا گیا اور دریائی پولیس کی مدد سے لاش پانی میں سے نکالی گئی - یہ ایک نوجوان آدمی کی لاش تھی اُس کی جیب میں ایک لفافہ تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا نام جوان اوپنشا ہے اور اُس کی سکونت ہورشم کے قریب ہے - گمان کیا جاتا ہے کہ وہ واٹرلو سٹیشن کی طرف ریل گاڑی میں سوار ہونے کی غرض سے جلدی جلدی جا رہا تھا - اور چونکہ راستہ تاریک تھا اس لئے بھٹک کر وہ گھاٹ کے کنارے تک آ گیا اور پانی میں گر گیا - اُس کے بدن پر کوئی علامت کسی حملے کی نہ تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ مرنے والے کی موت اتفاقی حادثہ سے ہوئی - حکام کو گھاٹوں کی درستی کی طرف جلد سے جلد توجہ کرنی چاہئے - ہم چند منٹ تک خاموش بیٹھے رہے - ہولمز اس قدر افسردہ سا تھا کہ میں نے اُس کو اس سے قبل اتنا افسردہ کبھی نہ دیکھا تھا - آخر اُس نے کہا -

ہولمز - واٹسن! اس واقعہ سے مجھے ندامت ہوئی ہے - اور گویہ تاثر ادنےٰ قسم کا ہے

تاہم امر واقعہ یہی ہے۔ جو میں بیان کر رہا ہوں۔ اب یہ معاملہ میرا نج کا معاملہ ہے۔ اگر خدا نے مجھے صحت دی تو میں اس گروہ کو جلدی ہی زیر مواخذہ لاؤنگا۔ حیف کہ وہ میرے پاس استمداد کے لیے آئے۔ اور میں نے اُسے اُس کی موت کے حوالے کر دوں د ہ اپنی کرسی سے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نہایت سخت اضطراب کی حالت میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس کے پتلے پتلے رخساروں پر سرخی کی جھلک نمودار تھی۔ اور وہ اپنے لمبے پتلے ہاتھوں کو کبھی بند کرتا تھا اور کبھی کھولتا تھا۔ آخر اُس نے کہا "

"یہ شیطان نہایت ہی عیار ہیں! میں حیران ہوں کہ وہ اُسے پانی کے کنارے تک کس طرح لے گئے۔ گھاٹ سٹیشن کے سیدھے راستے پر نہیں ہے۔ پل پر تو بے شک مینہ اور آندھی کے باوجود بھی اتنی رونق تھی کہ وہ اپنے جرم کا ارتکاب وہاں نہ کر سکتے تھے خیر واٹسن! ہم دیکھینگے کہ بالآخر کون جیتتا ہے۔ میں اب جاتا ہوں۔"

میں دن بھر اپنے فرائض منصبی کی ادائگی میں مصروف رہا اور شام کو دیر سے گھر کو لوٹا۔

شرلوک ہولمز اس وقت تک بھی گھر نہ پہنچا تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب وہاں پہنچا اس کا چہرہ زرد تھا۔ اور وہ بہت ہی تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور ایک ٹکڑا ڈبل روٹی کا توڑ کر جلدی جلدی کھانے اور پانی کے گھونٹ سے اُس کو حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔

میں۔ کوئی سُراغ چلا؟

ہولمز۔ ہاں وہ اب میری مٹھی میں ہیں۔ نوجوان اوپنشا کا انتقام اب جلدی ہی کیا جائے گا۔ واٹسن! ہم اُن کے شیطانی نشان کو اُنہی پر کیوں نہ استعمال کریں؟۔ کیوں کیسی کہی؟

میں۔ "کیا مطلب؟" اُس نے الماری سے ایک سنگترہ لیا۔ اور چھیل کر اس میں سے

بیج نکالے اور پانچ پانچ بیج لے کر ایک لفافے میں لپیٹے اور لفافے کے اندر لکھا "ش۔ ہ۔ بجائے ج۔ ا اور لفافہ بند کر کے مہر لگائی اور سرنامہ لکھا" کپتان جیمز کیلھون۔ کشتی لون سٹار مقام سوانا علاقہ جارجیا"

ہولمز (ہنس کر) جب وہ بندرگاہ میں داخل ہوگا تو یہ خط اُسے ملیگا اور شاید وہ رات کو چین سے نہ سو سکیگا۔ جیسے اوپنشا کی موت کا پیش خیمہ وہ خط تھا جو اس کو ملا یہ خط کپتان کی موت کا پیش خیمہ ہوگا

میں۔ یہ کپتان کیلھون کون ہے ؟

ہولمز۔ ان عیاروں کا سرگروہ۔

میں۔ آپ نے کیسے پتہ نکالا ؟

اُس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر تاریخیں اور نام ہی نام لکھے تھے اور کہا " میں نے سارا دن لوئڈ کمپنی کے رجسٹر اور پرانے کاغذات کی فائلیں دیکھنے میں صرف کیا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ جو جہاز پانڈیچری میں۔ جنوری یا فروری ۱۸۸۳ء میں ٹھیرا تھا وہ بعد میں کہاں گیا۔ ۳۶ جہاز متوسط انداز کے وہاں اِن اثنا میں ٹھیرے ان میں سے ایک کا نام لون سٹار تھا۔ اس نام نے میری توجہ کھینچی کیونکہ یہ جہاز لنڈن سے روانہ ہوا تاہم اِس نام کا ایک ضلع امریکہ میں بھی ہے۔

میں۔ ٹکساس کا ضلع ؟

ہولمز۔ مجھے یقینی طور پر نہ جب معلوم تھا نہ اب ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ جہاز امریکی الاصل ہے۔

میں۔ اچھا پھر کیا ہوا ؟

ہولمز۔ پھر میں نے ڈنڈی کے کاغذات کی پڑتال کی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہی جہاز وہاں جنوری ۱۸۸۵ء میں پہنچا تو میرا شک یقین سے بدل گیا پھر میں نے دریافت کیا کہ

اب لنڈن کے بندرگاہ میں کون کون سے جہاز لنگر انداز ہیں۔

میں۔ خوب!

ہولمز۔ معلوم ہوا کہ لون سٹار پچھلے ہفتہ میں یہیں تھا۔ میں البرٹ ڈاکس میں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ یہ جہاز آج صبح سوانا کو روانہ ہو گیا۔ میں نے گریوسنڈ کو تار دیا لیکن معلوم ہوا کہ جہاز وہاں سے گذر چکا تھا۔ اور چونکہ مشرقی ہوا چل رہی تھی۔ اس لئے غالباً اب وہ جزیرہ وائٹ کے پاس پہنچ گیا ہوگا

میں۔ اب آپ کیا کرینگے؟

ہولمز۔ اوہ۔ میں نے اُس کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس جہاز پر یہ کپتان اور دو میٹ یہ تین آدمی امریکہ کے باشندے ہیں۔ باقی لوگ فنلینڈ اور جرمنی کے رہنے والے ہیں۔ یہ بھی پتہ ملا ہے کہ یہ تینوں کل رات جہاز سے غیر حاضر تھے۔ یہ بات مجھ کو ایک قلی نے بتائی جس نے اُن کا اسباب لدوایا۔ اس بادبانی جہاز کے سوانا میں پہنچنے سے پہلے یہ خط ڈاک کے ذریعے وہاں پہنچ جائے گا۔ اور تار کے ذریعے میں پولیس کو اطلاع دے دونگا کہ اِن تینوں بھلے مانسوں کی ایک قتل کے مقدمے میں یہاں بہت ضرورت ہے۔

لیکن بہترین انسانی تجاویز بھی نقصوں سے خالی نہیں ہوتیں۔ مقدر میں نہ تھا کہ جان اوپنشا کے قاتلوں کو نارنگی کے بیج ملتے جن سے اُنکو معلوم ہوتا کہ ایک آدمی جو عیاری اور استقلال میں کسی طرح اُن سے کم نہ تھا۔ ہاتھ دھو کر اُنکے پیچھے پڑا ہے۔ اس سال جو طوفان کا بہت زور رہا ہم دیر تک سوانا کے جہاز لون سٹار کی نسبت کسی خبر کے سننے کے منتظر رہے لیکن کوئی خبر نہ پہنچی۔ اور جو آخر ہم نے سنا بھی تو یہ کہ بحر اوقیانوس میں ایک دفعہ ایک جہاز کا پچھلا تختہ کسی کو نظر پڑا جس پر دو حروف "ل۔ س۔" (یعنی لون سٹار کے نام کے پہلے حروف) کھدے ہوئے تھے۔

اس سے زیادہ ہم کو لون شمار کے انجام کی نسبت کوئی اطلاع نہ مل سکیگی۔

(ماخوذ از انگریزی) (محمد شفیع ایم-اے)

غزل

(از منشی محمد اظہر علی صاحب آزاد-ایم-آر-اے-ایس-لنڈن)

مانگ وہ تھی کہ ادا لوٹ گئی بال کھلتے ہی بلا لوٹ گئی

نکہتِ زلف سے ہو کر سرمست دوش پر تیرے صبا لوٹ گئی

خشمگیں دیکھ کے تیری آنکھیں ترچھی چتون پہ قضا لوٹ گئی

اللہ اللہ ترا اندازِ ستم دیکھ کر جور-جفا لوٹ گئی

بوسہ دیتے ہی جھکی شرم سے آنکھ نوکِ مژگاں پہ حیا لوٹ گئی

حسرتیں دیکھ کے ہوتے پامال خونبہا کے حنا لوٹ گئی

دیکھ کر بندِ درِ توبہ کو ایسی مچلی کہ دعا لوٹ گئی

حسرتیں ساتھ جنازے کے ہوئیں میرے قدموں پہ وفا لوٹ گئی

پایا جب بندِ فنا سے آزاد میری تربت پہ فنا لوٹ گئی

تصویر-اس پرچہ میں آنریبل مسٹر جسٹس راناڈے آنجہانی کی تصویر ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہے جسٹس راناڈے مادرِ ہند کے ان یادگارِ زمانہ فرزندوں میں سے ہیں جنپر وہ ہمیشہ ناز کیا کریگی۔ آپ کی علمی اور قانونی قابلیت کا اعتراف خود گورنمنٹ انکو ہائیکورٹ بمبئی کا جج مقرر کرنیسے فرما چکی ہے۔ آپنے مرہٹہ قوم کے عروج کے متعلق نہایت قابلانہ تصانیف کی ہیں۔ آل انڈیا سوشل کانفرنس میں کمال سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ آنریبل مسٹر گوکھلے کو اُنسے فیضانِ تربیت حاصل ہے جسکا نتیجہ جملہ اہلِ ہند آنریبل موصوف کے طرزِ زندگی میں ملاحظہ کر رہے ہیں۔ گو جسٹس راناڈے آج دنیا میں نہیں مگر انکا نامِ نیک ہندوستان کے نامی گرامی اصحاب کی فہرست میں درج ہے اور موجودہ اور آئندہ والی نسلوں کی رہنمائی کا کام دے رہا ہے۔ ایڈیٹر

نثاری

وہ شے جو ملک کو قابلِ فخر بناتی ہے۔ جو زندگی کی اعلےٰ خوبی کی سرتاج ہے جو ہر درجہ کے انسان کو سرفراز اور ممتاز بناتی ہے۔ وہ ملکی زبان کی ترقی ہے جس ملک کی زبان باقاعدہ اور علمی زبان ہے وہاں دولت اور حشمت کا مینہ برس رہا ہے۔

فے الحقیقت زبان ایک مصدر ہے جس کے نظم و نثر دو صیغے ہیں۔ اردو زبان میں میں نظم کے زباندان شاعر تو بہت سے ہیں اور نثر کے زباندان بہت کم ہیں شاعری میں استادی شاگردی کی مدنے اس کو ایک خاص فن بنادیا ہے۔ اور لوگوں نے اس پر بہت توجہ کرکے اس میں بعض ایسی باتیں ایجاد کی ہیں جنکا جاننا ہر شاعر کے لئے ضروری ہے اور جنکا تعلق خاص نظم سے ہے نثر سے اُن کو کچھ نسبت نہیں۔ جیسے تقطیع میں حرفوں کے گرنے کی بحث یا الفاظ کا صحیح وزن جیسے پیاس اور پیار کو بہ یائے مخلوط نظم کردیا اردو کا اصلی الف تقطیع سے نہ گرنے پائے وغیرہ ایسی باتیں ہیں۔ جنکا جاننا شاعر کے لئے ضروری ہے۔

اس سبب سے نظم نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی ہے اور جب تک شاعر عروض و قافیہ اور متروکات شعر وغیرہ سے واقف نہو اس وقت تک اس کو شاعر نہیں کہہ سکتے لیکن نثر کو ابھی تک یہ بات حاصل نہیں ہوئی۔ اردو نثر عبارت ہر کس و ناکس کوئی سپوٹی لکھ لیتا ہے زباندان ہو یا نہ ہو۔ عبارت میں الجھاؤ ہو۔ الفاظ بے ربط ہوں فقرے خلافِ محاورہ ہوں کوئی کچھ کہنے والا نہیں۔

حالانکہ نثاری نظم کے مقابلہ میں بہت مشکل ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ نثر میں

نہ عروض جاننے کی ضرورت ہے نہ قافیہ سمجھنے کی حاجت ہے۔ اس پر بھی صحیح نہ لکھنا مشکل ہے اردو نظم میں میر۔ سودا۔ حاتم۔ ذوق۔ مصحفی۔ مومن۔ غالب۔ آتش۔ ناسخ۔ وزیر۔ بحر۔ صبا۔ منیر۔ رشک۔ سحر۔ داغ۔ امیر۔ جلال۔ نسیم۔ تسلیم۔ انیس۔ دبیر۔ ریاض۔ وغیرہ تمام ہندوستان میں مشہور ہوئے اور ملک نے انکی قدر و عزت کی اس وقت بھی ہندوستان میں بہت سے شاعر موجود ہیں اور زمانہ انکی قدر کرتا ہے لیکن نثر کے بیشمار لکھنے والوں میں آپ کو صرف میر امن دہلوی مرزا رجب علی بیگ سرور غالب آزاد حالی۔ شرر۔ شمس العلما نذیر احمد مرحوم وغیرہ کے چند نام ملیں گے جن کو تمام ہندوستان جانتا ہے۔

اس سے تو یہ بات پائی جاتی ہے کہ بمقابلہ نظم کے نثر بہت مشکل ہے۔ لیکن اسکے قواعد مرتب نہیں ہوئے اس لئے لوگوں نے اسے بالکل سہل سمجھ کر بغیر حصول فن طبع آزمائی شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ انکی نثاری مقبول عام نہ ہوئی اور ان بے شمار نثر لکھنے والوں میں معدودے چند ایسے نکلے جن کا کلام پسند خاطر ہوا۔

مجکو بہت افسوس ہوتا ہے جب میں موجودہ رسائل میں عمدہ مضمون خراب الفاظ میں دیکھتا ہوں انگلش ترجمہ لکھنے والوں کا تو یہ خیال ہے کہ اردو میں عبارت قواعد صرف و نحو کے موافق ہو یا نہ ہو۔ الفاظ فصیح ہوں یا نہ ہوں۔ صرف پڑھنے والا ماحصل نفس مطلب سمجھ لے۔ اس خیال نے زبان کو بے حد نقصان پہنچایا اور نثر لکھنے والوں کی قدر کھو دی۔ کلام نے مقبول عام ہونے کی سند حاصل نہ کی۔ ہم حیران ہیں کہ لوگوں نے آخر نثاری کو اسقدر سہل کیوں سمجھ لیا ہے کہ اس کی گردن پر خواہ مخواہ چھری پھیری جاتی ہے حالانکہ نثر نظم سے بہت مشکل ہے نظم میں تعقید اور عبارت کا الجھاؤ ہوتا ہے تو لوگ شاعر کو اس خیال سے معاف رکھتے ہیں کہ غریب نے عروض اور قافیوں کی قیود کی پابندی کے لحاظ سے مجبور ہو کر اس طرح نظم کیا ہے چاہے شاعر نے اپنی عدم زباندانی سے ایسا

کیا ہو۔ لیکن نثر میں ایسی غلطی کبھی قابلِ معافی نہیں ہو سکتی۔

نظم میں فعل و فاعل کی تقدیم و تاخیر قابلِ معافی سمجھی جاتی ہے لیکن نثر میں اگر اسطرح کوئی عبارت لکھے تو وہ نامطبوع ہوتی ہے۔ نظم میں کوئی شعر ایسا نظر نہیں آتا۔ جس کو اگر روزمرہ محاورے کے موافق نثر میں لکھیں تو اُس کے لفظوں میں تقدیم و تاخیر نہ کرنا پڑے۔ مثال کے طور پر ہم دو ایک شعر لکھتے ہیں:۔

جہاں تیرے جلوے سے معمور نکلا پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا

اگر اس شعر کو ہم قواعد اردو کے موافق بغیر تعقید بولنا چاہئیں تو اسطرح بولیں گے۔

"تیرے جلوے سے جہاں معمور پایا جس پہاڑ پر آنکھ ڈالی کوہ طور معلوم ہوا"

دلِ زار کا ماجرا کیا لکھوں فسانہ ہے مشہور سیماب کا

دلِ زار کا ماجرا کیا لکھوں سیماب کا فسانہ تو مشہور ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہماری قسمت ایسی نہ تھی کہ یار کا وصال ہوتا اگر اور جیتے رہتے تو یہی انتظار ہوتا

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم سے تعلق قطع نہ کیجئے اور کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔

کیا غم ہے امیرؔ اگر نہیں مال اس وقت میں آبرو بہت ہے

امیرؔ کیا غم اگر مال نہیں ہے اِس وقت میں بڑی چیز آبرو ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے آپ کو معلوم ہو گیا نظم میں جو باتیں قابلِ معافی ہیں نثر میں قابلِ گرفت ہیں اس سبب سے بمقابلہ نظم کے نثر بہت مشکل ہے۔

لیکن اس کو لوگ حاصل نہیں کرتے اور اس قدر سہل سمجھ لیا ہے کہ آنکھ بند کر کے جو کچھ جی چاہتا ہے لکھ جاتے ہیں اِس سے زبان کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے اور لکھنے والوں کی قدر نہیں کی جاتی۔ میرے خیال میں لوگوں کو اس فن کو حاصل کر کے باقاعدہ

کرنا چاہئے اور جس طرح نظم میں ایک دوسرے کا محتاج ہے اسی طرح نثر میں بھی اس بات کو لازم کر لینا چاہئے کہ جب تک نثاری کسی زباندان سے باقاعدہ نہ حاصل کیجائے الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے کو قلم نہ اٹھایا جائے۔ ایک تو اس سے زبان کو نقصان پہنچتا ہے دوسرے فن کی وقعت نگاہوں سے گرتی جاتی ہے۔

یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو نظم لکھنا جانتا ہو نثر پر بھی قادر ہو۔ حکیم سید ضامن علی جلال مرحوم نظم کے استاد تھے لیکن نثر کی دو سطریں بے تکلف لکھ سکتے تھے جس شخص نے انکی لغت کی کتاب سرمایۂ زبان اردو کی نثر دیکھی ہے وہ اس بات کو کہہ سکتا ہے کہ بمقابلہ نظم کے انکی نثر میں زمین و آسمان کا فرق تھا فصیح الملک نواب مرزا داغ کی بھی یہی کیفیت تھی امیر مرحوم بیشک نثار بھی تھے اور وہ عیوب نثر سے واقف تھے۔ نثر کا فن جدا ہے اور بغیر تحصیل کے وہ نہیں آسکتا۔ جو لوگ بغیر سیکھے ہوئے اس راہ میں قدم رکھتے ہیں غلطی پر ہیں جو جامہ اور لباس فصحائے ہر لفظ کے واسطے قطع کیا ہے اگر اسی محل پر لفظ صرف نہ کیا جائے گا تو کبھی سننے والے کو مزانہ دے گا اور نہ پر اس کلام کا اثر نہ ہوگا ایک ہی لفظ کسی محل پر پیارا معلوم ہوتا ہے کسی محل پر بھونڈا۔ جیسے تم کیسے رہے؟ تمہارا مزاج کیسا ہے؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ مذکورہ بالا فقروں میں، کیسے، کیسی، کیسا، اپنے فصیح معنوں پر مستعمل ہوئے اس لئے اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن میں کیسے آؤں؟ وہ کیسے جائے؟ تو کیسا ٹھہر گیا؟ غیر موزوں اور بھدے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ کیسے اور کیسی اور کیسا اپنے فصیح معنوں پر مستعمل نہیں ہوئے ان فقروں کو اسطرح ادا کرنا چاہئے۔

میں کیونکر آؤں؟ وہ کس طرف جائے؟ تو کس لئے ٹھہر گیا؟

اب ان کی فصاحت کو دیکھو اور مقابلہ کرو لفظوں کے زور کو دیکھو۔

جو لوگ محض مطلب ادا کرنے کے واسطے ادبی رسالوں میں اپنے مضمون بھیجتے

ہیں وہ رسالوں کی مٹی خراب کرتے ہیں اور اپنی عزت کھوتے ہیں یہ تو وہی مثال
ہوئی جیسے بعض لوگ لکھتے ہیں۔ میں ناظم نہیں ہوں۔ شاعر نہیں ہوں۔ اس فن کو
کسی سے حاصل نہیں کیا ہے شاعری سے صد ہا کوس دور ہوں لیکن آج کل نظم
مطبوع عام ہے اور لوگوں کو اس کے یاد کرنے میں آسانی ہوتی ہے اس لئے ناظرین
کی تفریح طبع کے لئے نظم کرتا ہوں۔ مقام انصاف ہے جب آپ کو شاعری نہیں آتی
اس فن کو کسی سے حاصل نہیں کیا تو نظم کرکے اپنی تالیف کی کیوں مٹی خراب کی۔

نثاری کے قاعدے ایسے نہیں ہیں کہ ہم ایک آدھ مضمون میں ختم کر سکیں لیکن
مختصراً نثر عبارت کے اقسام لکھے جاتے ہیں۔ نثر کی تین قسمیں ہیں مُرَجَّز۔ مُسَجَّع۔ عارِی۔
پر ان میں مختلف صنعتیں ہیں مقطع۔ موصل۔ ترصیع۔ تنسیق الصفات۔ متعقد۔ متلون۔
سیاقت الاعداد وغیرہ۔

ان تمام صنعتوں کے بیان کے لئے ایک کتاب درکار ہے منجملہ ان تمام صنعتوں
کے صنعت ترصیع آجکل ناٹکوں میں مطبوع عام ہو رہی ہے اصطلاح میں ترصیع اس
صنعت کو کہتے ہیں کہ انشا پرداز جو کلمہ لکھے دوسرا کلمہ اُس کا ہم وزن ہو اور قافیہ بھی
رکھتا ہو لیکن ہر ناٹک لکھنے والا اسکا کافی لحاظ نہیں رکھتا۔

نثر مرجز ایک قسم کی نظم عبارت ہے جس میں وزن عروضی ہو قافیہ نہ ہو اُس کے لئے
دو ایک بحریں خاص مقرر ہیں۔

مسجع عبارت وہ ہے کہ نظم کیطرح مقفی اور مردّف ہو لیکن اسمیں وزن شعر نہ
ہو جیسے فسانہ عجائب کی عبارت۔ سجع کی تین قسمیں ہیں متوازی۔ مطرف۔ متوازن
متوازی میں الفاظ برابر کے لاتے ہیں جو ہم قافیہ ہوں اور ہم وزن ہوں جیسے جفا
خفا ادب لقب۔

مطرف موافق ہونا دو لفظونکا ردیف و حرف روی کی قید سے اس میں وزن

کی کوئی ضرورت نہیں ہے جیسے نثار انتظار۔ حال محال۔

متوازن وہ ہے جس میں دو فقرے ہم وزن ہوں اور روی کی قید سے خالی ہو جیسے کارساز کردگار۔

اسمعیل بن عباد سے کسی نے پوچھا کہ حسن سجع کیا ہے جواب دیا کہ جو اہل سماعت کے کانوں کو اچھا معلوم ہو اور سبک ہو۔

مسجع لکھے تو مناسب ہے کہ عبارت خوب ہو۔ اضافتیں برابر ہوں پہلا فقرہ چھوٹا ہو دوسرا فقرہ کسیقدر بڑا ہو۔ فقرے میں تین اضافتوں سے زیادہ نہ ہوں۔

یہ تمام اقسام کی عبارتیں حسن کلام کے لئے موقع موقع سے آتی ہیں لیکن اصل عبارت ہر دلعزیز اور دلچسپ و دلکش، عاری ہے۔

نثر عاری وہ ہے جو محاورات کے خلاف نہ ہو قافیہ اور ردیف اور وزن سے کوئی تعلق نہ رکھتی ہو الفاظ فصیح ہوں۔ نامربوط نہ ہوں۔ سلاست مع بلاغت ہو۔ تناسب الفاظ زبردستی نہ پیدا کیا گیا ہو۔ تسلسل عبارت میں نقص نہ ہو۔ الجھاؤ نہ ہو صاف صاف بیان۔ عام فہم اور خاص پسند ہو۔ ہندی۔ فارسی الفاظ میں ترکیب اضافی نہ ہو جیسے پہاڑ عظیم۔ شدت دھوپ۔ عربی فارسی لفظوں میں ترکیب بقاعدۂ عربی الف لام نہ لائیں۔ جیسے حسب الفرمان و عدیم الفرصت الفاظ زائد بغیر ضرورت نہوں۔ جیسے، الغرض، القصہ، الحاصل، المختصر، غرضکہ، خلاصہ اینکہ، پس، حاصل کلام، آمدم برسر مطلب، تاآنکہ، چنانچہ، چنانکہ، کیونکہ، اسواسطے کہ، اس لئے کہ، ایسے لفظوں سے پرہیز کریں اور خلاف تہذیب الفاظ نہ لکھیں اور جو الفاظ محاورہ لکھنو و دہلی کے خلاف لوگوں میں غلط مستعمل ہو گئے ہیں انکو زبان قلم سے نہ ادا کریں جیسے راجہ کی جمع خلاف فصحا لوگوں نے راجے بنالی ہے۔ عمدہ کی جمع عمدے۔ شے کی شئیں۔ لاکھوں کی جگہ لکھوں۔ کم کی جگہ کمتی۔ ناراضی

کی جگہ ناراضگی وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہئے بیشک نثاری ایک فن ہے اسکو حاصل کرکے لکھنا چاہئے اور عدم واقفیت سے اس کی وقعت نہ مٹانا چاہئے۔ فقط

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

نوائے غم

از ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لاہور

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار جسکے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جسکا سکوت اور منت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت!
آہ! امید محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ اس سازنے مضراب کی کھائی نہ کبھی
گر آتی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی
چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتارِ حیات
نغمۂ یاس سے دھیمی سی صدا اٹھتی ہے اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے
جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
مری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

نیا عالم

یوں تو جس دنیا میں ہم رہتے ہیں سے ہر شخص جانتا ہے لیکن اس کے علاوہ دوسرے اور عالم بھی ہیں جو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں لیکن ہمیں اُنکی خبر نہیں وہ ایسے عالم ہیں جنکے عجائبات کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں نہ اُنکے اجرام کے ترانے سُن سکتے ہیں اور نہ اُنکی لذات کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

بادی النظر میں کسی اندھے یا بہرے کی زندگی نہایت قابل رحم ہوتی ہے۔ اندھا قدرت کے دلچسپ مناظر اور کرشمے دیکھنے سے مجبور ہے۔ بہرا بیچارہ دیکھ تو سکتا ہے مگر دل خوش کن نغمے یا اور دوسری چیزیں سننے سے محروم ہے۔ مگر ہمیں اپنے حال پر رحم نہیں آتا کہ قدرت کے دوسرے عالم ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں اور اُنکے اجرام کو جو اپنی زبان حال سے اپنے وجود اور فرائض کی کہانیاں کہہ رہے ہیں ہم سننے سے قاصر ہیں۔

تو کیا یہ ایسے عالم ہیں جن کی ہر چیز طلسمی ہے اور ہمیں نظر نہیں آسکتی ؟ نہیں۔ مغربی سائنس کی مدد لیجئے اور دیکھئے کہ آپ پر کیا کیا اسرار کھلتے ہیں۔ مغربی سائنس نے ہمارے واسطے جو جو چیزیں مہیا کی ہیں اُنکا اعتراف کرنا تک ناممکن ہے۔ ٹیلسکوپ (دوربین) مائکراسکوپ (خوردبین)۔ فوٹوگرافی کا کیمرا۔ اسپکٹراسکوپ وغیرہ وغیرہ آلات ہیں جنکی بدولت اس عالم کا طلسم ٹوٹا ہے۔ آئیے۔ ہم آپ کو مختلف عالم کی سیر کرائیں۔ اور آپ ان حیرت انگیز کرشموں کو دیکھ کر ضرور بول اُٹھینگے کہ ع

اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب!

کسی تاریک رات کو اگر آسمان پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اگر ہم بغیر کسی آلہ کی مدد کے انہیں گننا چاہیں تو کل افق کے دائرے کے اندر تین چار ہزار کی تعداد ہو گی۔ اب اگر کسی نہایت قوی دوربین سے دیکھیں تو لاکھ سے بھی تعداد بڑھ جاتی ہے اور سائینٹفک رسائینس واژن) نے پتہ چلایا ہے۔ کہ ایک افق کے اندر دو کروڑ سے لے کر تین کروڑ تک ستارے ہیں۔ اس پر سے اگر کل ستاروں کا حساب لگایا جائے تو عقل دنگ رہ جائے۔

علم طبعیات (فزکس) کی مدد سے اگر روشنی۔ گرمی اور برق (الکٹریسٹی) کو جانچیں تو یہاں بھی عجیب شعبدے نظر آتے ہیں نیوٹن نے سب سے اول دریافت کیا کہ سفید روشنی سات رنگوں سے مرکب ہے۔ نیوٹن نے ایک تاریک کرے میں جس میں روشنی کی صرف ایک شعاع داخل ہوتی تھی ایک سہ پہلو شیشہ کا ٹکڑا اسطرح رکھا کہ شعاع اسپر پڑے۔ دیکھا تو مقابل کی دیوار پر سات رنگ ارغوانی۔ آسمانی۔ نیلا۔ سبز۔ زرد۔ نارنجی۔ سرخ نظر آتے تھے۔ کسی ترکیب سے یہ رنگ روک دئے گئے اور اسی مقام پر نیوٹن نے فوٹوگرافی کی ایک پلیٹ رکھی۔ اور دیکھا کہ باوجود پلیٹ پر روشنی نہ پڑنے کے اس کی حالت متغیر ہو گئی تھی۔ اسکا سبب یہ ہے کہ کہ بنفشی رنگ سے اور بھی بہت سی شعاعیں نکلتی ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں شعاعوں نے پلیٹ پر اثر کیا۔

کیمسٹری (علم کیمیا) میں ان شعاعوں کو الٹرا وائلٹ ریز کہتے ہیں۔ ان شعاعوں میں قدرت نے کچھ ایسا مادہ رکھا ہے کہ ایک درجہ تک امراض جلد اور ناسور اچھے ہو سکتے ہیں۔ انہیں شعاعوں کی بدولت سبز پتوں کا آبی مادہ اور کاربونک ایسڈ شکر اور نشاستہ سے مبدل ہوتا رہتا ہے۔ اسیطرح سرخ رنگ سے بھی نامعلوم شعاعیں نکلتی ہیں۔ مگر یہ شعاعیں گرم ہوتی ہیں۔ ان شعاعوں میں تھرمامیٹر (مقیاس الحرارت) رکھنے سے دیکھا گیا ہے کہ پارہ چڑھتا ہے۔

روشنی ۔ گرمی ۔ اور الکٹریسٹی وراصل حرکت کے اُن طریقوں کے نام ہیں جو ایتھر میں پیدا ہوتی ہیں مگر اُنکی وسعت اور تعداد جنبش میں فرق ہوتا ہے ۔ ایک موج کی وسعت $\frac{1}{125.....}$ انچ ہوتی ہے ۔ متذکرہ بالاسات رنگوں کی امواج کی وسعت میں فرق ہے اس میں سے اکثر تو نازک آلات کی مدد سے دریافت کی گئی ہیں ۔ مگر بعض آلات کی مدد سے بھی نہیں دریافت کی جاسکتیں ۔ مگر ان کے وجود سے سائنٹسٹس کو انکار نہیں ہے ۔

آئیے اندازہ کریں کہ کتنے ٹمپریچر (درجۂ حرارت) میں زندگی ممکن ہے ۔ ایک طرف تو صفر ڈگری ہے جو درجۂ انجمادی ہے اور دوسری طرف ۲۰۰ ڈگری جو بائیلنگ پائنٹ زمانے کا درجہ ہے ۔ اس سے آگے بڑھئے تو سورج کی گرمی ۶۰۰۰ ڈگری ہے ۔ اور ۲۰۰ ڈگری سرد سے سرد درجہ ہے ۔ فرض کیاجائے کہ کل روئے زمین کا درجۂ حرارت ۲۰۰ ڈگری ہو جائے تو کیا ہوگا ؟ تمام پانی کے قطعات جمے ہوئے برف کے تختے ہو جائیں گے ہوا سمٹ کے رقیق مادہ بن جائے گی اور یہ رقیق مادہ اُبلنے لگیگا اور کل حالتیں بدل جائینگی ۔ اسیطرح سائنٹسٹس نے دریافت کیاہے کہ اگر کرۂ زمین کا درجۂ حرارت سورج کی حرارت کے برابر ہو جائے تو سمندر اور دریا بخارین کے اُڑ جائیں گے پہاڑ پگھل کر بہہ جائیں گے اور پھر اُن میں بھی تبخیر ہوگی ۔

زمین کی گردش کو لیجئے ۔ ایک ۔ دو ۔ تین ۔ چار ۔ لیجئے اتنے شنے گنتے کے عرصے میں زمین سورج کے اطراف کئی کوس نکل گئی ۔ زمین سورج کے اطراف بحساب ۱۱۴۰ میل فی منٹ گردش کرتی ہے ۔ امیر اپنی حویلیوں میں اور غریب اپنی جھونپڑیوں میں آرام کرتے ہیں ۔ مگر کسی کو خبر تک نہیں ہوتی کہ زمین اس سناٹے سے گردش کر رہی ہے خیر زمین تو بہت بڑی شے ہے ۔ عالم ذرات کو لیجئے ۔ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جو ہمیں نظر آتا ہے بیشمار دوسرے نامعلوم چھوٹے ذروں سے جنہیں ماہرانِ سائنس ایٹم کہتے ہیں بنا ہے ۔ اور ایٹم اور دوسرے نہایت چھوٹے ذروں سے بنا ہے جنہیں کالیکیول

کہتے ہیں۔ سائنس دان لوگوں نے ان ذروں کو بہت قوی خردبینوں سے جانچا ہے اور دریافت کیا ہے کہ ہر ذرہ حیرت ناک سرعت کے ساتھ جس کی رفتار ہزار سے لے کر کروڑ میل فی سیکنڈ تک ہے حرکت کر رہا ہے ہمارا بدن جو بے شمار ذروں کا مجموعہ ہے ان کا جولانگاہ ہے۔ مگر ہمیں مطلق خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح کرۂ زمین کے پھول۔ پتے۔ غرض ہر چیز میں یہ حیرت ناک جنبش جاری ہے۔

آپ کو آواز کیونکر سنائی دیتی ہے۔ آپ نے جہاں بات کی۔ آپ کے منہ کے پاس کے ہوائی ذروں نے ٹکر کھائی۔ یہ ذرے اس ٹکر کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں اور دوسرے قریب کے ذروں کو ٹکر دیتے ہیں۔ اسیطرح رفتہ رفتہ آواز سامع کے کان تک پہنچ جاتی ہے۔ آواز کا پھیلنا ایسا ہے جیسے پانی میں پتھر کے گرنے سے موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور بتدریج پھیلتی جاتی ہیں۔ اسی اصول کے ساتھ الکٹریسٹی کا اصول بھی وابستہ ہے جب الکٹریسٹی کسی مشین سے پیدا ہوتی ہے اور اس مشین کی مرور کدورتوں پر آجاتی ہے تو ایتھر کے ذرات میں بھی ایسی موجیں پیدا ہوتی ہیں جس طرح آواز کو قوت سامعہ کی بدولت سنتے ہیں اسی طرح ایک اور آلہ جس کو الکٹرک آئی اور برقی آنکھ کہتے ہیں ا[illegible] کی امواج کو گھسیٹ لیتا ہے۔ اور اسی پر وائرلس ٹیلیگرافی منحصر ہے۔ دیکھئے سائنس کی تلاش کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ ریڈیم میں سے شعاعیں نکلتی ہیں اور ان شعاعوں کے نفوذ کی رفتار دس ہزار سے کر ایک لاکھ میل فی سیکنڈ تک ہے۔ سب سے بڑے اچنبھے کی بات یہ ہے کہ ریڈیم سے اتنی بیشمار شعاعیں نکلتی ہیں مگر اس کی قوت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر اس قوت کو کسی بند کسی ترکیب سے جمع کیا جائے تو بڑے بڑے جنگی بیڑوں کو چٹکی بجاتے میں اڑانے یا شہروں کو تباہ کرنے میں کوئی دیر نہ لگے گی۔

کیوں جناب! کیسی سیر ہوئی۔ یہ سب سائنس کے کرشمے ہیں۔ سائنس کی بدولت حضرت انسان نے ان چیزوں پر کامیابی حاصل کی ہے جو بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

مگر یہ انکشافات اسرار قدرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں ؎

دلِ ہر ذرہ را کہ بشگافی
آفتابیست درمیان بینی

(مقتبس از انگریزی) سید دلدار حسین از بہاء الدین کالج۔ جوناگڈھ

غزل

دیکھنا اور تکلم سے وہ قاصر ہونا
وائے بیمار کا اس حال میں آخر ہونا

نالے بے سود سہی تازہ مصیبت تو یہ ہے
ضبط پر بھی نظر آتا نہیں قادر ہونا

ہم سے آستانے پہ سجدہ کا اصرار عبث!
اہلِ اسلام کا اچھا نہیں کافر ہونا

راز داری کا شرف تو نے جسے بخشا ہے
ختم اسی پر ہے ترے بھید کا ظاہر ہونا

منزلِ گور کی سختی تو رہی ایک طرف
لاکھ آلام کا باعث ہے مسافر ہونا

کچھ تو ڈھارس ہو مرے دل کو دمِ بازپسیں
تم ذرا آ کے سرہانے دمِ آخر ہونا

اہلِ دل جلوہ ترا دیکھ چکے حشر کے دن
ایسے منظر کا کچھ آسان ہے ناظر ہونا

مجلسِ وعظ جما ہو اگر اے واعظ!
خدمتِ پیرِ مغاں میں کبھی حاضر ہونا

کہہ رہی ہے ترے دامانِ کرم کی وسعت
کم سے کم میرے گناہوں کا ہے وافر ہونا

سن تو کیا کہتے ہیں مرغانِ چمن شام و سحر
بے زبانوں کا ذرا دیکھ تو ذاکر ہونا

جب سے دیوانہ بنایا ہے یہ تاکیدیں ہیں
دیکھو رسوا نہ کہیں تم مری خاطر ہونا

یہ کھچاوٹ یہ لگاوٹ بھی ہے اک امرِ عجیب
کہیں سو پردے میں چھپنا کہیں ظاہر ہونا

کیوں نہ دیکھیں نگہِ کم سے مجھے لوگ حفیظ
اک بڑا عیب ہے اس دور میں شاعر ہونا

(حفیظ جالندھری)

حمد باری

سارے جہاں میں تو ہے۔ سارا جہان تیرا — پایا نشاں نہ لیکن۔ او بے نشان تیرا

ذرّوں میں تیری تابش۔ تاروں میں تیرا جلوہ — تیری ہی یہ زمیں ہے اور آسمان تیرا

تو وہ مکیں ہے تیری ہر شے میں ہے تجلّی — کون و مکاں ہیں تیرے اور لا مکان تیرا

ارفع ہے شان تیری او آسمان والے! — پایہ بلند تیرا! اونچا نشان تیرا

عقلِ دقیقہ رس کو یاں دسترس نہیں ہے — کیسا قیاس تیرا! کیسا گمان تیرا

دیر و حرم میں تو ہے۔ ہر دو سرا کے مالک! — یہ بھی مقام تیرا۔ وہ بھی مکان تیرا

تاروں سے تو ہے اونچا۔ اونچے مکان والے!

برتر ہے آسماں سے۔ او آسمان والے!

تو پھول ہے چمن میں تو شمع انجمن میں — جلوے ہیں تیرے ہر سو اس محفلِ کہن میں!

آنکھوں میں نور ہے تو۔ دل میں سرور ہے تو — قالب میں جان ہے تو اور روح ہے بدن میں

پردے میں جان کے اک تصویرِ قال ہے تو — تو نطق ہے زباں میں۔ تو ہے زباں دہن میں

خلوتکدے میں غنچوں کے ہے شمیم وحدت — اور تو ہے رنگِ کثرت پھولوں کی انجمن میں

صحرا میں تو نگہباں۔ راحت کا گھر میں ساماں — غربت میں تو ہے مونس دلسوز ہے وطن میں

او بیکسوں کے والی! او بے پروں کے مالک! — ڈھارس بندھانے والے ہر رنج و غم و محن میں

دیتا ہے تو ہی تسکیں شوریدگانِ غم کو — آزارِ جاں گسل میں۔ اندوہِ جاں شکن میں

کعبہ بھی جب ہے تیرا اور بتکدہ بھی تیرا — ان بن ہے مفت کی کیوں پھر شیخ و برہمن میں

بندے ہیں سب خدا کے آپس میں بیر کیسا!

دیر و حرم میں اُس کے جلوے ہیں غیر کیسا؟

بالک رام شاد بجواڑیہ ریاست پٹیالہ

کلامِ اکبر

(لسان العصر سید اکبر حسین صاحب دام فیضہ الہ آبادی کی تازہ ترین نوا پیرائی)

لطف چاہو اک بتِ نوخیز کو راضی کرو
نوکری چاہو۔ کسی انگریز کو راضی کرو

لیڈری چاہو۔ تو لفظِ قوم ہے مہماں نواز
گپ نویسوں کو اور اِل میز کو راضی کرو

طاعت و امن و سکوں کا دلکو لیکن ہو جو شوق
صبر پر طبعِ ہوس انگیز کو راضی کرو

زق زق و بق بق ہیں دنیا کے نہ ہو اکبر شریک
چپ ہی رہنے پر زبانِ تیز کو راضی کرو

وضع بدلی گھر کو چھوڑا کا غذوں میں چھپ گئے
چند روزہ کھیل تھا آخر کو سب کھپ گئے

مٹ گئے نقش و نگارِ دیرِ فانی کے مرید
نام نہیں کار نگیا روشن جو ہنر کو جپ گئے

دل کا ٹکڑا تو رہا باقی پئے یادِ خدا
ریل میں کیا غم جو اکبر کھیت پیترے نپ گئے

سامنا اک نگہِ ناز کا ہے جان کی خیر
مہرباں اک بتِ عیار ہے ایمان کی خیر

اور سبحہ و زنار اُٹھا جاتا ہے
خیر ہندو کی اب ہے نہ مسلمان کی خیر

ناز سے دامن اُٹھاتی تھی جو اپنا لیلےٰ
زیرِ لب کہتی تھی مجنوں کے گریبان کی خیر

ترکِ شیراز سے خوشتر ہیں بتانِ مغرب
ظاہرا اب نظر آتی نہیں ایران کی خیر

اسنے میدانیں سر و بیچے کیا قوم کا نام
آپ بنگلے میں منایا ہی کیے جان کی خیر

پارٹی کچھ بھی نہیں جب نہ ہو وقتِ طاعت
قوم کی خیر نہیں جب نہ ہو ایمان کی خیر

مس مس برقِ کلیسا کا ہے ٹیچر اکبر
آج تو علم بھی ٹانگیگا مسلمان کی خیر

ٹیٹنک[1] ٹکڑے ہوا ٹکرا کے آئس برگ سے
دب گیا سائنس بھی آخر پیامِ مرگ سے

عیش کا بھی ذوق دینداری کی شہرت کا بھی شوق
آپ میوزک ہال میں قرآن گایا کیجئے
ٹھیکہ داروں نے کیا نیلام قومی روح کو
چھاؤنی میں اب فقط روٹی کمایا کیجئے

عجب کیا شیخ برگڈ میں جو مشتاقِ غلامی ہیں
ہمارے اونٹ صاحب تو بڑی کسرٹ کے حامی ہیں

تھی مرے پیش نظر وہ مس تہذیب پسند
کبھی وسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربتِ قند
ملک الموت نے ناگاہ بھری اپنی زغند
پارک کو چھوڑ کے ہونا ہی پڑا آہ میں بند
حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں
کیا خوب جوابِ خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

سبحان اللہ! معنے آفرینی اسیکا نام ہے۔ ایڈیٹر

سرسیّد کی یاد

جب مطلعِ ہندوستاں
تھا ہو رہا عبرت نشاں

---

[1] نام جہاز

بادل گھنے آشوب کے کرتے تھے ژالہ باریاں
برقِ فسادِ دہر تھی دکھلا رہی جولانیاں
تھی کانپتی انساں کی جاں!

کاشانۂ اسلام تھا ہنگاہِ آلام و بلا
بچے سے بوڑھے تک وہاں تھے کھو رہے تاب و تواں
واں بیکلی تھی حکمراں کل کا نہ تھا نام و نشاں
اعضا تھے سب کے کانپتے ضعف و نقاہت کے تلے

اے الاماں! اے الاماں!

اتنے میں اک مردِ خدا آیا مجسم درد کا
تصویر جس کی شکل تھی قربانی و ایثار کی
سینہ میں جس کے موجزن بحرِ غمِ اہلِ وطن
جس کی رگِ جاں میں بھرا خوں تھا گداز و سوز کا
دل جس کا تھا آتشکدہ رخ جس کا تھا ماتم زدہ
جس کا جگر صد چاک تھا جس کا کلیجہ تھا پھٹا
آنکھوں میں جس کے اشک کی اک لہر تھی لہرا رہی
ہر لفظ سے ہر بات سے حرکات سے سکنات سے
جس سے کہ ہوتی تھی عیاں بہبودِ ئِ درماندگاں
آکر پکارا ناگہاں!

یا معشر القوم الحزیں! کیوں غم سے ہے اندوگیں؟
چہرہ پہ تیرے زردیاں ق اندوہ و ماتم کے نشاں
تقدیر کی نیرنگیاں افلاک کی بیدردیاں

دکھلا رہی ہیں بیگماں

اُٹھ، ڈر نہیں، گھبرا نہیں	یوں دست و پا لرزاں نہیں
گو تو ضعیف و زار ہے	اور بسمل و بیمار ہے
آخر مگر انسان ہے	دی حق نے تجھکو جان ہے
اُٹھ، عزم کے پاؤں اُٹھا	لے، یہ ہے ہمت کا عصا
دشوار ہے گو مرحلہ	ہمت کا حامی ہے خدا

وہ کار پرداز جہاں!

تو اُمتِ شاہِ اُمم	تجھپر فدا جاہ و حشم!
کیا قیصر و کسرےٰ و جم	اہلِ عرب، اہلِ عجم
تم سب نے اپنے سر کئے	اور تیرے آگے رکھ دئے۔

کرباد اپنی عزّ و شاں!

کڑکا کوئی بجلی کا تھا؟	انسان کی تھی یا صدا؟
جو ہند کو لرزا گئی	جنبش میں سب کو لا گئی
مُردوں کو زندہ کر گئی	جاں قالبوں میں بھر گئی
دل بزم کے گرما گئی	حرفِ تپش سکھلا گئی

صاحبدلاں! صاحبدلاں!

اے بزمِ دورِ آخری!	تجھ کو خدا دے زندگی!
تھی جس سے تیری روشنی	وہ شمع گرچہ بجھ گئی
کرنیں پہ اُس کی جابجا	عالم کی ہیں ظلمت ربا
خلوت میں اُن کی روشنی	جلوت میں اُن کی چاندنی
ہوگی بقائے دہر تک	چشم و چراغِ مردمک

روشنگرِ بزمگاہِ جہاں

اے شمعِ نورِ زندگی! گو آج پوشیدہ ہے تو
پر بزم ہے چلّا رہی نورِ دل و دیدہ ہے تو

سرسیدِ ہندوستاں!

غلام محمد طور ایم - اے

میں کیا ہوں؟

میں تم سے کیا بتاؤں اے میرے دل! میں ہوں کیا ہوں؟ اک نقطۂ محبت یا مرکزِ وفا ہوں
سب چھیڑتے ہیں مجھکو خاموش ہوں مگر میں ہوں نغمہائے پنہاں یا سازِ بے صدا ہوں
ہوں اعتبارِ ہستی - اندازہ گیرِ ہستی مخمورِ اک شرابی مغرور اک گدا ہوں
مدت ہوئی کہ ہوں میں دلدادہ مشائخ یا فرشِ خانقہ ہوں یا نقشِ بوریا ہوں
سجدے کئے ہیں میں نے برسوں صنمکدے میں دل سے بتوں کا بندہ ظاہر میں باخدا ہوں
ہے ظرف میرا عالی مستغنیٔ تموّل گنجینۂ سلاطیں یا خوانِ اغنیا ہوں
مانندِ کاہ مجھ تک کھنچتے ہیں دل سبھوں کے ہوں مادّہ کشش کا - جذّاب کہربا ہوں
محفل میں اہلِ دل کی ہوں نغمۂ طرب زا مجلس میں اہلِ غم کی میں دردآشنا ہوں
کرتا ہوں باخبر میں منزل سے بیخودوں کو اِس قافلہ میں گویا آوازۂ درا ہوں
سرسبز ہوں بظاہر باطن میں خون ہے دل میں اِس چمن میں گویا نیرنگئے حنا ہوں
ہر نسخۂ محبت میں نے کیا مرتب اکسیرِ اہلِ دل ہوں اِک جزوِ کیمیا ہوں
گو مستِ خاک ہوں میں سب کی نگہ میں لیکن اِک مخزنِ جواہر یا معدنِ طلا ہوں
اِک بے وفا پہ مائل مدت سے ہے مرا دل ہیہم ترانہ سنج روحی لک الفدا ہوں

یہ انتقالِ پیکر ہے صورتِ تغیّر — میں ورنہ درحقیقت سرمایۂ بقا ہوں

ہوں قلزمِ قدم کا مشہور اک شناور — گو دجلۂ جہاں میں اک موجۂ فنا ہوں

اجزا دل سے میرے خلقت ہوئی تو مجھ کی — کہتا ہے پھر مجھی سے ہر بت کہ میں خدا ہوں

تھا پتھروں سے مجکو شغلِ صنم تراشی — دیوانگی میں بھی میں بیکار کب رہا ہوں

بااختصار سن لو یہ سرگذشت میری — اٹھتا ہے جو دلوں میں وہ دردِ جانگزا ہوں

رگ رگ میں ایک نشتر ٹوٹا ہوا پڑا ہے — جتنی مصیبتیں ہیں ان سب کی انتہا ہوں

اس کی نظر ہے سطحی میری نظر ہے غائر — ناصح کی دوستی کو کسطرح میں نباہوں؟

محمد ہادی عزیز لکھنوی

افسانۂ شوق

ذیل کی مختصر نظم ہمارے غائبانہ کرمفرما منشی ابوظفر صاحب واقف کی طبع "بہ حقِ شوق" کا نتیجہ ہے۔ پچھلے پرچہ میں آپ کی نظم ٹوٹا ہوا دل ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہے۔ افسانۂ شوق میں بھی وہی خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ عہدِ محبت کے محسوسات کو خوب دلگداز الفاظ میں ادا کیا ہے۔ نظم کیا ہے؟ بیچارے ستمکشیدگانِ محبت کے خیالات کا فوٹو ہے جنکے دل کوقت ثانی کی عدم توجہی سے صنمکدۂ شوق کی بجائے مزارِ شوق بن چکے ہیں۔ واقفانِ راز سمجھیں اور اپنے اپنے دلِ خستہ پر نازِ پاششِ غم ہوں۔

غلام محمد طور ایڈیٹر

خوں ہو کے بہ گیا وہ دلِ داغدارِ شوق — اب شوق ہی رہا نہ رہی یادگارِ شوق

وہ دن گئے کہ ہم بھی تھے سرتا سر اشتیاق — دل میں ہزار شوق تھا سر میں ہزار شوق

شوقِ وفورِ شوق میں برسوں رہا کئے — منت پذیرِ مرہمِ زخمِ فگارِ شوق

بیتابیٔ حصولِ تمنا کی وہ خلش! وہ دشنہ ریزیٔ ستمِ روزگارِ شوق!

وہ پاسِ ننگ و نام سے نالہ کو روکنا! وہ کشمکش سکونِ دلِ بے قرارِ شوق!

وہ پختگیٔ شورشِ سودائے آرزو! وہ اژدہامِ خواہشِ بوس و کنارِ شوق!

وہ شاہدِ مراد کا من من کے روٹھنا! وہ ناصبوریٔ دلِ بے اختیارِ شوق!

وہ خرمنِ قرار پہ بجلی کا ٹوٹنا! ہونا وہ رخصتِ صبر کا نذرِ شرارِ شوق!

ناکامیٔ مراد میں وہ جی کا ڈوبنا! وہ خوں فشانیٔ نگہِ اشکبارِ شوق!

وہ بھی تھا کیا زمانہ دلِ بد نصیب! جب میرا شکارِ شوق تھا میں تھا شکارِ شوق

آنکھوں کو اب کہاں وہ تماشائے بازدید! دل میں نہیں وہ حسرتِ وصلِ نگارِ شوق

وہ گرمیٔ وفورِ تمنا نکل گئی ہنگامہ آفریں نہ رہا کاروبارِ شوق

اب ہر طرف ہے یاس کا نظارۂ مہیب دل میں بجائے شوق ہے باقی مزارِ شوق

عہدِ شباب اور غمِ شوق ہائے ہائے!
ہوں میں خزاں رسیدۂ فصلِ بہارِ شوق

آرزوئے دید

(ہجراں نصیب بیمارِ عشق قاصد کو پیام دے رہا ہے)

قاصد! تجھے بتاتا ہوں اُس شوخ کا پتہ ہاں! اس کو بھول نہ جانا خبردار! دیکھنا

اس شوخ کا مکان سمجھنا کہ ہے وہی جس جا پہ لاکھوں طالبِ دیدار دیکھنا

نالاں جو ہوگا کوئی۔ تو گریہ کناں کوئی لب پر کسی کے آہِ شرربار دیکھنا

محوِ تماشا ہوگا کوئی در کے سامنے مشتاقِ دید کچھ پسِ دیوار دیکھنا

آنکھیں کسی کی ہونگی لگی بام کی طرف کچھ نظریں سوئے روزنِ دیوار دیکھنا

رکھنا تو احتیاط سے اس کوچہ میں قدم ... تا ڑیں نہ تیرا غیر سوئے یار دیکھنا
چپکے سے جا کے کہنا یہ پھر پاسبان سے ... پر اسطرح کہ کر نہ دے انکار دیکھنا
منت سے آرزو سے غرض جس طرح سے ہو ... اُس شوخ تک پہنچنا میرے یار! دیکھنا
جانے کے ساتھ ہی نہ مرا ذکر چھیڑنا ... پہلے وہاں پہ موقعہ گفتار دیکھنا
تنہائی میں سنانا اُسے جا کے حالِ دل ... کہنا نہ کچھ جو مجمعِ اغیار دیکھنا
غصہ میں سُنکے پہلے بظاہر کہے گا وہ ... باتیں نہ ایسی ہوں یہاں ہمارا! دیکھنا
بگڑیں وہ لاکھ اپنی کہے جائیو۔ مگر ... غصہ سے ڈر نہ جانا خبردار! دیکھنا
کمسن ہے مہ جبیں ہے نزاکت شعار ہے ... کرنا نہ اپنی بات پہ اصرار دیکھنا
کہنا کہ ہے رفیق کی حالت بہت بُری ... لازم ہے چلکے آپ کو سرکار! دیکھنا
آنکھیں بھی چھت سے لگ گئیں خاموش ہے زباں ... مشکل کلام کرنا ہے۔ دشوار دیکھنا

القصہ صاف کہنا کہ ہے نزع میں رفیق
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

ادب آموز

کر رہا ہے کیا جاہل! ... کیا یہ تیرے شایاں ہے ... عقل تجھمیں ہے غافل! ... شکر کر تو انساں ہے
سعی ناقص ہے کاہل! ... ہے جہاں میں جاہل ... یاں ذریعۂ کامل ... کوشش نمایاں ہے
یہ تری شرافت ہے؟ ... یا یہ شر و آفت ہے؟ ... سینہ میں کدورت ہے ... دل میں شوقِ عصیاں ہے
لعل و بے بہا گوہر ... بعد مرگ ہیں پتھر ... چند روزہ ثروت پر ... اسقدر تو نازاں ہے
عجب تاجِ سلطانی ... ہے عجب یہ نادانی ... آدمی سے حیوانی ... یہ خطا و نسیاں ہے
ہے قناعت اک نعمت ... اس سے ملتی ہے راحت ... ہے تری بُری نیت ... اس سے تو پریشاں ہے
یار ہو شاطر ہو ... جسکو پاس خاطر ہو ... وقت پر جو ناصر ہو ... دوستی کے شایاں ہے

نیک ہے اگر عورت ہے مکاں وہ جنت
زن اگر ہو بدسیرت گھر نہیں، زنداں ہے

تو کرے خطا عصیاں وہ کرے عطا احساں
فضل و بخششِ یزداں تجھ پہ کیسا احساں ہے

میں ہوں عبدِ بدکردار تو کریم ہے غفار
میں ظلوم عصیاں کار تو رحیم و رحماں ہے

ہے گدائے بے ساماں کوئی کوئی ہے سلطاں
ہے یہاں کوئی خنداں اور کوئی گریاں ہے

خارِ رنج و ایذا کا مفسدوں کو ہے کھٹکا
اُسکو خوف ہی ہے کیا جسکا پاک داماں ہے

کس سے بار اٹھیں اس کے سر پہ پڑا جس کے
رکھ گیا ہے وہ چپکے ایسا بارِ احساں ہے

یہ ہے گردشِ دوراں کاخ تھے جو عالیشاں
خاک میں ہیں وہ پنہاں در ہے اب نہ درباں ہے

سن تو بلبلِ شیدا! کہہ رہی ہے سوسن کیا؟
خارزار گل ہوگا آج یہ گلستاں ہے

خوانِ نعمتِ الواں یہ ہے مجمعِ یاراں
وقت بد میں اے ناداں! کون کس کا پرساں ہے؟

چاہتے ہو گر راحت اے زمیں! کرو محنت
اس سے گھٹتی ہے نکبت بڑھتی عزت و شاں ہے

تازہ غزلیں

(نتیجۂ طبع مولانا عرشؔ یادگارِ مومنؔ و تسلیمؔ)

موت پر انساں کی دم بھر نظر ہوتی نہیں
سب کی ہوتی ہے خبر۔ اپنی خبر ہوتی نہیں

عشق میں اس کج ادا کے پھولنا پھلنا محال؟
یہ بھی ہے شاخِ کماں جو بارور ہوتی نہیں

اے شبِ غم جان دو پھر کیوں ہے اب ناکوں سے ہو؟
جاگ اٹھی خلقِ خدا لیکن سحر ہوتی نہیں

اب تو آ جاؤ کوئی دم کو خدا کے واسطے
دم لبوں پر ہے۔ دوا کچھ کارگر ہوتی نہیں

غسل میں چشمِ حبابِ آب تجھ سے شرم کیا؟
دیکھنے کو انکی آنکھیں ہیں۔ نظر ہوتی نہیں

وار ایسا ہے سبک اس قاتلِ سفاک کا
عاشقوں کو قتل کی اپنے خبر ہوتی نہیں

شمع ہم کو رو رہی ہے۔ اسکی بے برگی کو ہم
کیا شجر ہے جس کو امیدِ ثمر ہوتی نہیں

کس غضب کی شامِ ہجراں آئی او بختِ سیاہ!
منتظر خورشیدِ محشر ہے سحر ہوتی نہیں

بو پریشاں۔ رنگ فق۔ و دامنِ گل میں چاک چاک
آہ بلبل کی مری جاں بے اثر ہوتی نہیں

بعدِ مردن انتہائے تفتہ جگری دیکھئے
شمع رونا چاہتی ہے چشم تر ہوتی نہیں

خط ہمارا لے چلا ہے قاصدِ دریائے اشک
ناؤ کاغذ کی یہاں زیر و زبر ہوتی نہیں

اختتامِ منزلِ ہستی نے یہ ثابت کیا
ماندگی اس راستے میں عمر بھر ہوتی نہیں

کوئی باعث ہے نہیں تھمتے جو آنسو شمع کے
دیتے ہیں تسکین پروانے مگر ہوتی نہیں

حجتِ اقرار پر اِک لطف تھا انکار کا
"ہاں" اِدھر سو بار ہم کرتے اُدھر ہوتی "نہیں"

منزلِ خورشید میں ذرّوں کو دیکھا چاہئے
دوڑتے دن بھر ہیں۔ تکلیفِ سفر ہوتی نہیں

کچھ غمِ احباب ہے کچھ ہے خیالِ اقربا
چین سے مر کر بھی تربت میں بسر ہوتی نہیں

مجھ کو رونا بھی تو یوں رونا کہ ہونٹوں پر ہنسی
ہائے ظالم آستیں تیری کہ تر ہوتی نہیں

منزلِ آسودگانِ خاک کیا منزل ہے آہ!
شمع رو کر جان دے۔ انکو خبر ہوتی نہیں

کیا کٹھن منزل عدم کی ہے کہ جانا بھی ضرور
پھر تماشہ یہ کہ اس میں رہگذر ہوتی نہیں

آئی بالوں میں سفیدی عرش کر فکرِ کفن
یہ سحر وہ ہے کہ جس کی دوپہر ہوتی نہیں

(از منشی حیات بخش صاحب رسا وکیل و شاعر دربار رام پور)

اب دردِ دل کہیں تو کہیں کس جگر سے ہم
چڑھ کر تری نظر پہ گرے ہیں نظر سے ہم

رسوا ہیں ایسے گر کے کسی کی نظر سے ہم
اٹھتی ہیں انگلیاں جو نکلتے ہیں گھر سے ہم

نکلا نہ کام ناصیہ سائی سے بھی اگر
تقدیر پھوڑ لیں گے ترے سنگِ در سے ہم

افشائے رازِ عشق کا اتنا لحاظ ہے
پھرتے ہیں منہ چھپائے ہوئے شہر بھر سے ہم

اس چشمِ شوق پر بھی نظر ڈالیو کبھی
دیکھو تو دیکھتے ہیں تمہیں کس نظر سے ہم

اس وہم کا علاج کہ خط دیجے انکے نام
آگے چلے ہیں چار قدم نامہ بر سے ہم

دوزخ میں کون جاتا ہے جنت کو چھوڑ کر؟
جنت میں جائینگے نہ ترے رہگذر سے ہم

برباد ہو گئیں دلِ ویراں میں حسرتیں
کیونکر نکالیں خانہ خرابی کو گھر سے ہم

آتی ہے ان بتوں میں نظر شان اور ہی
جب دیکھتے ہیں چشمِ حقیقت نگر سے ہم

تیغِ نگاہِ ناز کے ممنون کیوں نہ ہوں
واقف ہوتے ہیں لذتِ زخمِ جگر سے ہم

اس چال سے پھر ان کو رضامند کر لیا
قدموں پہ گر پڑے جو گرے ہیں نظر سے ہم

کھوئے گئے ہیں ایسے کسی کی تلاش میں
اپنا نشان پوچھتے ہیں ہر بشر سے ہم

لکھیں جو خط میں حالِ دلِ زار فائدہ؟
دل ہی نہ باندھ دیں کمرِ نامہ بر سے ہم

جس نے دیئے ہیں زخم دکھاتے ہیں دل اسے
بیٹھے ہیں داد چاہنے بیداد گر سے ہم

کیا تم سے حال اپنا کہیں حضرتِ رسا
بیتاب دردِ دل سے ہیں دردِ جگر سے ہم

(از مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی)

آئے تری محفل میں تو میخانہ سمجھ کر
چوما تری آنکھوں کو تو پیمانہ سمجھ کر

رندو نہ اٹھاؤ ہمیں بیگانہ سمجھ کر
آئے ہیں یہاں محفلِ جانانہ سمجھ کر

مطلوبِ حسینانِ زمانہ ہے یہی دل
جو پھینک دیا آپ نے اچھا نہ سمجھ کر

بیٹھو کہ ابھی جان ہے بیمار میں باقی
کیوں چل دیے منہ پھیر کے زندہ نہ سمجھ کر

کھل جائے کہیں رازِ محبت نہ جہاں پر
کر آہ مگر اے دلِ دیوانہ سمجھ کر

وہ کھیل سمجھتے ہیں مرے سوزِ دروں کو
احوال بھی سنتے ہیں تو افسانہ سمجھ کر

جنت ہی میں شاید نظر آ جائے وہ جلوہ
جاتے ہیں اسے منزلِ جانانہ سمجھ کر

جب میں ہوں تمہارا تو یہ دل بھی ہے تمہارا　　آجاؤ اسے اپنا ہی کاشانہ سمجھ کر
کانٹوں نے نہ چھوڑا ترے وحشی کو وہاں بھی　　صحرا میں گیا تھا اُسے ویرانہ سمجھ کر

حامدؔ کو عنایت کوئی خم آج ہو ساقی!
آیا ہے گدا مجلسِ شاہانہ سمجھ کر

(از جناب ہنر غازیپوری)

ہے تاک جھانک میں جو رخِ بے نقاب کی　　نکلا ہے چاند اوڑھ کے چادر سحاب کی
گھبرا کے سوچتا ہوں میں تعبیر خواب کی　　اس طرح یاد آتی ہیں باتیں شباب کی
آج آنسوؤں میں صبح سے بو ہے کباب کی　　سوزش نہ چھپ سکی دلِ پُر التہاب کی
دل سے کبھی نہ جائے گی خو پیچ و تاب کی　　ہے وجہ اضطراب کمی اضطراب کی
پل پر پیادہ جائینگے زاہد ہیں با حواس　　بیخود ہوں مجھ کو چاہئے کشتی شراب کی
جامِ جہاں نما ہیں سب اوصاف ہیں مگر　　دو کوڑی کا اگر نہ ہو بوتل شراب کی
وہ بے حجاب صحن میں آتے ہیں جب کبھی　　اُس وقت شکل دیکھے کوئی آفتاب کی
دل مجھ سے لے کے خاک میں تم نے ملا دیا　　بے فائدہ غریب کی مٹی خراب کی
ہو فکرِ وصلِ یار اب اتنا کہاں ہے وقت　　افسوس ہم نے قدر کی کچھ شباب کی
رنجہ جائے چار دن بھی یہ امید اب نہیں　　دیکھا مجھے کہ بن گئے صورت عتاب کی
تیرے قدم کے فیض سے او شہسوارِ ناز!　　روشن بغیر دیدہ ہیں آنکھیں رکاب کی
چھد چھد کے رہ گئے دلِ عشاق سیکڑوں　　تیر نگاہ سیخ ہے گویا کباب کی
یارب پھرے نہ کوچۂ جاناں سے نامہ بر　　امید تو بندھی ہے دل میں جواب کی
گیسو سے رنگ مشک کو عنبر کو بو ملی　　ناگن نے اس سے سیکھی روش پیچ و تاب کی
واعظ اسی کی چاٹ میں ہے خواستگارِ خلد　　کس منہ سے کر رہا ہے مذمت شراب کی؟
خاکِ درِ عدو پہ ہے پابوسِ یار ہے　　دل نے تو اپنی آپ ہی مٹی خراب کی

اب میرؔ ہیں نہ خواجہ وزیر آہ اے ہنرؔ　　دے داد کون اِس غزلِ لاجواب کی
(ہنر غازیپوری)

صبحِ زندگی

شائقین کو مژدہ ہو کہ یہ کتاب جس کا انہیں ایک عرصہ سے انتظار تھا اور جس کی فرمائشیں دفتر مخزن میں چھپنے سے بہت پیشتر ہی موصول ہو چکی ہیں۔ اب شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوشخط قلم دو قسم کے کاغذ پر چھپی ہے۔ قسم اول کے کاغذ کی چونکہ مانگ زیادہ ہے۔ اسلئے قسم اول کی کتابیں جلد منگوانی چاہئیں۔ یہ کتاب دو سو چھتیس صفحہ کی ہے۔ اور اس میں ایک لڑکی کے چار برس کی عمر سے لے کر شادی کے وقت تک کے وہ تمام حالات جو تربیت سے تعلق ہیں۔ قصہ کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور اس طرح کنواری لڑکیوں کو جس جس عمر میں جن جن باتوں کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے نہایت خوبی سے بتائی گئی ہیں۔ مذہب کی وقعت خدا کی عظمت۔ گفتار۔ کردار۔ اطوار۔ عادات کے متعلق طرزِ بیان نہایت مؤثر ہے خانہ داری کی تفصیل میں انتظام صفائی ستھرائی کے علاوہ سینے پرونے چلپنے کاڑھنے کی بہت ہی باتیں تشریح سے لکھی گئی ہیں۔ سینے اور کاڑھنے کی ترکیب کے ساتھ نمونے بھی دیئے گئے ہیں! عورتوں کی زندگی پر استانی کا وعظ اس کتاب کی رُوح رواں ہے۔ وداع کا سماں۔ پھوپھی کا بھتیجی کو رخصت کرنا اور آخری نصیحتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ زبان کے متعلق بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کتاب ایک مستند اہل زبان یعنی منازل السائرہ کے مشہور مصنف مولوی محمد عبد الراشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ باعتبار واقعات یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر تالیفی کتاب زمانہ لٹریچر میں موجود نہیں۔ قیمت قسم اول ۲ روپے علاوہ محصولڈاک . . . . قسم دوم ۱۲؍

درخواستیں بنام منیجر رسالہ مخزن لاہور آنی چاہئیں

طب یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے جو خدمات
انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطراف ہند میں اس کام کے لئے سب کی
نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں
ہیں وہ انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں جناب حاذق الملک احساس فرض کے ساتھ دل
میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی
اس اہم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ انکے احساس فرض
کا ثبوت اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمر ہے گو اس کی ظاہری حیثیت ایک
تجارتی حیثیت ہے۔ لیکن اگر حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام
نہیں۔ طب یونانی کی بقا کا سامان ہے۔ شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اسلئے
جس غرض سے یہ قایم ہوا ہے۔ اسکے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے
اجزاء سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکی طرز ساخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا
کرتا ہے بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام طور پر اطبا برتتے ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ
اعلیٰ نسخے جو صرف رؤسا و امرا کو میسر آتے تھے بالکل اصل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور
واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ و زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے
نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص دوائیں بھی اس
دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں۔ صحت و تندرستی ایک جوہر بے بہا ہے اور ہر ایک انسانی جسم اس جوہر کا گنجینہ ہے۔
اسلئے تمام ارباب وطن کو ان اعلیٰ اور منتخب یونانی اور ویدک ادویات سے جو اس دواخانہ میں خاص اہتمام
سے بنتی ہیں۔ فائدہ اٹھانیکا اور اسکے ساتھ اس کار خیر کی مدد کا موقع ملسکتا ہے۔ خوبی انتظام اور حسن معاملہ
کے سبب تھوڑے عرصے میں اس دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ خط کا پتہ منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقامِ خلافت - مصنفہ شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ پہلے ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ شائقین جلد منگوالیں۔ ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے گا۔

رسومِ دہلی - مولفہ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگِ آصفیہ . . . .

اقبالِ دلہن - مصنفہ مولوی محمد بشیر الدین احمد خانصاحب قسم اول ۔ قسم دوم

خوابِ ہستی - مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن . . .

ابومسلم خراسانی - رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے مولوی محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمایش پر عربی سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے

انتخابِ مخزن - مخزن کی سابقہ ۹ جلدوں کا انتخاب قیمت . . . .

دردِ جانستاں - مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کی زبان میں دہلی کا سچا قصہ

مثنویاتِ میر حسن - مثنوی بینظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک قلمی نسخے سے شامل کر دی گئی ہے

سیرِ تبت - انگریزی کتاب فورایرس ایران تبت کا بامحاورہ ترجمہ اور ملک تبت کے متعلق معلومات وغیرہ

مرقعِ خوش خطی - فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہوری نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین کیواسطے تیار کیا جسکو دیکھ کر خط کے تمام نکات آسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب نے اسکے اہتمام میں مد نظر رکھا ہے۔ دعوےٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اسوقت ملک میں موجود نہیں۔

سحرِ عشق مع اشاعت خاص نمبر - میر نثار علی صاحب شہرت نے اسکو نہایت کوشش سے تیار کیا ہے قیمت

درخواستیں بنام منیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

جو بھلا سکتے ہو بھلا دو۔ اِسمیں بھی آسایش ہے)

بظاہر کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی یاد یا اُس کے حافظہ میں فرق آئے یا اُس کی یاد اور اُس کا حافظہ وقت پر کام نہ دے سکتے۔ دنیا کے ہر ایک مرحلہ میں قریبًا قوتِ یاد اور طاقتِ حافظہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ صرف طالبعلمی کے زمانہ میں ہی یا صرف طالب علموں کو ہی۔ بلکہ ہر زمانہ میں اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے بعض علوم اور فنون کی بنیاد ہی حافظہ پر ہے۔ اگر حافظہ الہامی کلام یاد نہ رکھتا تو تحریر اسے قبول نہ کر سکتی۔ طب اور ڈاکٹری میں جنہیں صدری نسخے کہا جاتا ہے۔ ان کا تحفّظ بھی حافظہ ہی کرتا ہے عدالتوں کے کمرے میں وکیل۔ انجمنوں میں لیکچرار۔ وعظ و نصیحت میں مذہبی واعظ۔ جس قدر تقریریں کرتے ہیں اُن کا ماخذ مختلف تحریریں ہوتی ہیں مگر اُن تحریرات کو قوتِ حافظہ ہی وقت پر دیانت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

روزمرہ کے کاروبار میں کسی اور قوت کی اس قدر ضرورت نہیں پڑتی جس قدر حافظہ کی پڑتی ہے۔ اگر قوتِ حافظہ شاملِ حال نہ رہے تو ایک کا دوسرے کو پہچاننا بھی مشکل ہو جائے ننھے ننھے بچے بچیاں جو دور ہی سے ماں کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں وہ بھی حضرتِ حافظہ ہی کا ایک ادنے کرشمہ ہے اگر حافظہ ان معصومینِ روزگار کی مدد نہ کرے تو وہ ماں کا خیال ہی قایم نہ رکھ سکیں۔ خورد سال۔ ناپختہ عقل بچوں کو کون سی طاقت عزیزوں۔ماں باپ۔ دایہ۔ آیا کی طرف لے جاتی ہے؟ اور کون سی قوت اُن کی رہبری کرتی ہے؟ وہی حافظہ جو ہر ایک انسان کے وجود میں قدرت نے بہ مختلف مقاصد پر ودیعت کر رکھا ہے۔

کیا ان حالات میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شریف اور مفید قوت کی انسان کو ضرورت نہیں یا کبھی اُس کے استفادہ سے باز رہنے کی بھی انسان کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ہم اکثر پاتے ہیں کہ قدرت نے ہر شے یا قوت کی دو متخالف صورتیں رکھی ہیں اور ان دونوں صورتوں کا عمل جداگانہ ہوتا ہے اور اپنے اپنے وقت پر اُن دونوں کی ضرورت پڑتی اور ان کا احساس ہوتا ہے۔ بہ پابندی اسی اصول کے۔ اگر حافظہ یا عملِ حافظہ کی ضرورت ہے تو اُس کے مقابلے میں فراموشی کی بھی ضرورت ہے اگرچہ اُس کے احساس کی مقدار اور وسعت حافظہ کی مانند نہ ہوا اور اگرچہ اُس کا احساس گاہ گاہ ہی ہوتا ہو یا چند خاص معاملات اور واقعات سے وابستہ ہو۔ کیا ہم اپنی زندگی میں سب واقعات۔ سب سانحات۔ سب احساسات یاد رکھنا چاہتے ہیں؟ اور کیا بہت سے ایسے واقعات اور خیالات نہیں ہیں کہ جن کی یاد ہمارے واسطے ایک تکلیف دہ

سماں ہے ؟ کیا بہت سے واقعات ایسے نہیں ہیں جنہیں ہم خود بھلا دینا چاہتے ہیں ؟ کیا کبھی کبھی اُن کی یاد اور اُن کا کسی رنگ میں سامنے آنا ہمارے واسطے ایک ایسا سماں نہیں ہے جو ہمیں ایک تازہ آفت۔ تازہ تکلیف میں ڈال سکتا ہے ؟

کبھی کبھی ہم اگر ایسے واقعات کی یاد تازہ بھی کرتے ہیں تو صرف اُسقدر رہی جو تکلیف دِہ نہیں ہوتا۔ ہم رفتہ رفتہ اِس بات کے عادی ہوتے جاتے ہیں کہ جو امور۔ جو واقعات۔ جو خیالات ہمیں تکلیف میں ڈالنے والے ہیں وہ ہماری یاد میں آتے ہی نہیں۔ حافظہ میں ایک یہ بھی قوت ہے کہ وہ اُن عناصر کے یاد دلانے سے پرہیز کرتا ہے جو ہمیں تکلیف دہ ہیں۔ کسی صدمہ کے پیش کرنے پر انسان رفتہ رفتہ جو صبر کرتا اور اُسے بھول جاتا ہے یہ نتیجہ بھی قوت فراموشی کے عمل کا ہے۔ حافظہ اُس سے قطع تعلق کر لیتا اور فراموشی اُسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے۔

"بھول جانا ہر وقت بُرا نہیں"۔

"فراموشی ہر وقت مضر نہیں"

طالب علم کے واسطے بھول جانا اور فراموشی بُری ہے۔ لیکن طلب علوم میں جو تکلیفات عائد ہوتی ہیں اُن کا بھول جانا۔ اُن کا یاد نہ کرنا ایک مفید فراموشی ہے۔ اخلاقی رنگ میں دوسروں کی بُرائیاں بھول جانا ایک وصف ہے اور سیاسی رنگ میں اُن کا یاد رکھنا ایک سیاسی جوہر۔ احسان کر کے بھول جانا ایک تمدنی وسعتِ حوصلہ ہے اور کاروباری زندگی میں ایسی بھول تمدن کے واسطے ایک فریب دِہ طریق ہے۔ جو جج جج ہونے کی حالت میں ملزموں کی ارتکابی صورتیں بھول جاتا ہے وہ انصاف کا ایک شرمناک داغ

لگتا ہے لیکن جو جج ملزموں کی ذاتی حرکتوں کو بھول جاتا اور انہیں ذہن میں نہ رکھ کر فیصلہ دیتا ہے وہ ایک ایسی فراموشی اختیار کرتا ہے جو اغراض انصاف کے واسطے ایک زینۂ سلامتی ہے۔

لازمی نہیں کہ انسان ہر وقت ہر سانحہ یاد رکھے یا اس کے لئے ہر بات کا یاد رکھنا ضروری ہو۔ یہی فطرت کی تعلیم ہے۔ ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ اگرچہ اسکے دماغی جوف میں صدہا قسم کی باتیں محفوظ ہوتی ہیں لیکن وہ ایک ہی وقت یا ایک ہی آن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے دماغی تھیلے میں کیا کچھ بھرا ہے۔ دماغ وقت پر حافظہ کی امداد سے وہ باتیں وہ واقعات ساتھ ساتھ پیش کرتا جاتا ہے جن کا پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً ایک وقت انسان ایک خاص حالت بیان کر رہا ہے تو اس خاص کیفیت سے پہلے روز کے جو واقعات ہونگے۔ انسان کو ان کا خیال بھی نہیں ہوگا۔ حالانکہ اس کے دماغ میں وہ بھی محفوظ ہیں۔ ہاں مگر جب ان کا تذکرہ چھڑے گا تو حافظہ انہیں بھی پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

عمل فراموشی میں ہم کبھی تو یہ چاہتے ہیں کہ

(الف) کوئی بات۔ کوئی واقعہ۔ کوئی سانحہ ہمیں کسی خاص وقت پر یاد آئے۔

اور کبھی یہ کہ

(ب) کبھی یاد ہی نہ آئے۔

ہر انسانی زندگی ان دونوں خیالات کا مجموعہ ہے اور ان دونوں رنگوں میں فراموشی عمل کرتی ہے۔ ہم بہت سے خیالات اسی واسطے محفوظ رکھتے ہیں کہ وہ کسی خاص وقت پر یاد آئیں یا یاد میں لائے جائیں۔

ہم ایسی باتیں ہر وقت اس واسطے یاد میں نہیں لانا چاہتے کہ اُنکی یاد یا تو بے مصرف ہوتی ہے اور یا انکی یاد سے ہماری زندگی تلخ ہوتی ہے یا اُنکی یاد سے بہت سی ایسی باتیں بھی معرضِ بحث میں آجاتی ہیں جو پرانی اُلجھنوں کو تازہ کر کے مزید یا جدید اُلجھنیں ڈالتی ہیں۔

کسی دوست کی گذشتہ غلطی یا بدی کو یاد میں لانا اُس کیفیت محبت میں خلل ڈالتا ہے جو اُس کے بعد پیدا ہو چکی ہے۔ بیوی خاوند کی اور خاوند بیوی کی گزشتہ لغزشوں کو اگر ہمیشہ یاد میں رکھے تو ان دونوں میں کبھی بھی صلاحیت نہیں پیدا ہو سکتی اور نہ امورِ خانہ داری میں آسایش سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔

بعض باتیں بعض واقعات ایسے بھی ہیں جنہیں ہم کبھی بھی یاد میں نہیں لانا چاہتے قوتِ فراموشی رفتہ رفتہ انکا ازالہ کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ اُن کا خیال بھی نہیں آتا۔

جو انسان اپنی زندگی کے تمام واقعات یاد رکھتا اور ان میں سے کوئی واقعہ بھی فراموشی کی نذر نہیں کرتا وہ اپنے تئیں ایک تہلکہ یا ایک آفت میں ڈالتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر وقت گذشتہ لغزشیں اور گذشتہ آفتیں اُسکے اردگرد رہیں اور اُس کی جان اُن سے خلاصی نہ پائے۔

اخلاق اور مذاہب نے بھی یہ کہا ہے کہ گناہ کر کے بھول جاؤ۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ کرو تو اُس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ آئندہ کے واسطے اُس کا خیال بھی نہ آئے۔ انسان کی زندگی مختلف مطالبات کا خزانہ ہے ان میں سے چند مطالبات ایسے ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں اور چند ایسے ہیں کہ جنہیں رجسٹر مطالبات سے کسی وقت کاٹنے کی ضرورت پڑتی

ہے۔ اگر ایسے مطالبات کاٹے نہ جائیں تو انسانی زندگی کی گاڑی کے پہیوں میں روڑا اٹک جاتا ہے۔

انسان خود ہی اس کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ وہ تمام قسم کے مطالبات کو یاد رکھ کر خوش گزران کرسکتا ہے یا بعض کو بھلا کر۔ اس میں حافظہ کی کسر شان نہیں ہے اور نہ ہی حافظہ اس پر اصرار کرتا ہے۔ حافظہ اُن واقعات کو یاد کرکے یا یاد کرا کر جنہیں انسان یاد میں نہیں لانا چاہتا خود بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے ایسے ناگوار واقعات کے یاد کرنے پر دماغ کی جو حالت ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک اس قسم کی مصیبت ہے جس سے انسانی دماغ انسانی حافظہ ایک آفت میں پڑ جاتا ہے۔

حافظہ کوشش کرتا ہے کہ

ایسے امور۔ ایسے واقعات۔ ایسے سانحات یاد نہ آئیں۔ دیگر واقعات دیگر باتوں کے یاد آنے سے انہیں فراموش کرتا اور اُن سے جان چھڑاتا ہے۔ یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جن سے کوئی انجان انکار کرسکے یا جنہیں مختلف دلائل سے ثابت کرنے کی یہ ضرورت ہو۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ہر انسان کی ذات میں پائی جاتی ہیں اور جو ہر انسان کی زندگی میں کم وبیش گزرتی ہیں۔ انسان جب اپنا مطالعہ کرتا ہے تو اُس پر ان باتوں کی کیفیت کھل جاتی ہے اور وہ جان جاتا ہے کہ اُس کی مختلف قوتیں کس کس رنگ میں کام کررہی ہیں اور ان میں کیا کچھ عاملانہ تضاد اور تخالف ہے۔

ہماری اپنی زندگیاں ہی تصدیق کرتی ہیں کہ ہمیں حافظہ اور فراموشی دونوں کی ضرورت ہے اگر حافظہ ہماری زندگیوں کے واسطے ایک ذمہ دار کفیل ہے تو فراموشی ہی ایک جواب دہ وکیل ہے۔ حافظہ ہمیں ضروری

واقعات یاد دلاتا ہے اور فراموشی غیر ضروری واقعات کی یاد مٹاتی ہے۔ دونوں کا عمل ہمارے واسطے فائدہ مند ہے۔ بچپن کی زندگی کیسی پیاری اور کیسی آرام دہ ہوتی ہے لیکن اگر انسان جوان ہو کر اس میں محو رہے تو اس کا شباب اور اس کا بڑھاپا خود اس کے واسطے ایک وبال ہو جائینگے اور انسان اس کشمکش میں سے کبھی بھی نہیں نکلیگا جو اس یادداشت کی تازگی سے پیدا ہوتی ہے۔

انسانی زندگی کی کشمکش ایک ایسی کشمکش ہے کہ جس سے کوئی انسان بھی محفوظ اور خالی نہیں۔ اگر انسانی دلوں کا جائزہ لیا جائے تو ایسے ایسے بھید کھلیں کہ خود انسان ہی محو حیرت ہو کر رہ جائے۔ ایک پنجابی مقولہ ہے۔

"دل دیاں سمندروں ڈونگھیاں کون دلاں دیاں جانے۔"

اس کشمکش زندگی کے دو بڑے پائے یا۔ بڑے ستون حافظہ اور فراموشی ہیں یا یہ کہ انسانی زندگی ان دو بڑے ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ ایک ستون پر وہ کل باتیں وہ کل واقعات کندہ ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں دوسرے ستون پر وہ واقعات اور وہ امور ہیں جن کی یاد ضروری نہیں یا جو قابل یاد نہیں یا جنہیں ایک خاص وقت پر یاد کرنا زیبا ہے۔

جو شخص صرف ایک ہی پایہ پر کھڑا ہوتا ہے وہ اپنی زندگی خود ایک تہلکہ میں ڈالتا ہے اگرچہ ایک لنگڑا دنیا میں زندگی بسر کر سکتا ہے لیکن ایسی زندگی ایک ادھوری زندگی ہوگی اور یہ نہیں کہا جائے گا۔ کہ ایسی زندگی کوئی کامیاب زندگی ہے یا تمدنی امور میں اس کا کوئی مفید اثر ہے۔ جو باتیں۔ جو چیزیں۔ جو واقعات یاد رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔

اگر انہیں خواہ مخواہ یاد رکھا جائے تو اُس کا اثر یہ ہوگا کہ تمدنی گاڑی اٹک اٹک کر چلے گی اور وہ منزل جسے مجموعہ انسانی طے کرنا چاہتا ہے سہولت سے طے نہیں ہو سکی۔

فراموشی کی پھر دو قسمیں ہیں۔

(الف) فراموشی۔

(ب) خود فراموشی۔

پہلی شق میں وہ فراموشیاں شامل ہیں جو خود اپنی ذات اور دوسرے لوگوں سے تعلق ہیں اور دوسری شق سے وہ فراموشی مراد ہے جو محض ذاتی فراموشی ہوتی ہے جسے دوسرے الفاظ میں خود فراموشی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں یہ درجہ ایک خاص درجہ ہے اور صوفی جب اس درجہ میں پہنچ جاتا ہے تو وہ گویا اپنا آپ ہی بھول جاتا ہے۔ اپنا آپ بھولنے سے مطلب یہ ہے کہ اپنی حقیقت بھول جاتا ہے کیونکہ جب انسان صوفیانہ رنگ میں اپنی حقیقت کا مطالعہ کرتا ہے تو جو حقیقت وہ اس سے اول سمجھ چکا ہوتا ہے اُس سے بہ عالم فراموشی قطع تعلق کرتا ہے۔ تمدنی رنگ میں خود فراموشی سے مراد اُن امور سے اعراض کرتا ہے جن کی یاد سلسلۂ تمدن میں ابتری اور بدنظمی پیدا کرتی ہے۔

انسان کا ضمیر تجربہ اور غور سے یہ جانچ کر سکتا ہے کہ کون سے امور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اور تمدنی ضرورتیں وقت پر خود بخود ان کا اعلان کرتی ہیں اور انسان رفتہ رفتہ ان دونوں صورتوں میں تمیز کرتا جاتا ہے۔

یاد کرو سب معاملات سب واقعات کو۔ اور پھر سوچو کہ ان میں سے کس قدر معاملات اور کس قدر واقعات یاد رکھنے کے قابل ہیں اور کس قدر بھلا

دینی چاہیئے۔

"کیا ہماری زندگی سب واقعات کا یاد رکھنا اپنی آسائش خیال کرتی ہے؟"

"یا اُن میں سے چند یا بہت سے واقعات کو یاد نہیں رکھنا چاہیئے؟"

اخلاقی اور مذہبی معاملات میں حافظہ اور فراموشی دونوں کی ضرورت ہے۔

اگرچہ سیاسی معاملات میں بھی یہی صورت ہے مگر نسبتاً ان دونوں سے کم۔

"وہ باتیں یاد رکھو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

"اور وہ بھول جاؤ جو یاد رکھنے کے قابل نہیں۔

"یا جن کی یاد سے دل و دماغ صحیح انسانیت اور تمدن و سوشیل معاملات پر تکلیف دہ اثر پڑتا ہے۔

سلطان احمدؐ از بہاولپور

حارث بن کلدہ ثقفی

ذیل کا علمی مضمون ہمارے فاضل کرمفرما حکیم محمد یوسف صاحب تنیر حیدرآبادی نے کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء کے ساتویں باب سے جس میں قبل ظہور اسلام کے اطباء عرب کا ذکر ہے خاص مخزن کے لئے ترجمہ کرکے عنایت کیا ہے جو بشکریہ درج کیا جاتا ہے - امید کہ آپ آئندہ بھی اسی قسم کے مضامین بھیج کر ہمیں ممنون فرماتے رہینگے (ایڈیٹر)

یہ طبیب طائف کا رہنے والا تھا - علم طب کے شوق میں اس نے بہت سے شہروں کی خاک چھانی اور فارس میں پہنچکر فنِ طب میں کمال حاصل کیا - وہاں وہ مدتوں رہا اور امراض و معالجات کی معرفت میں مجتہد الفن ہو گیا - یہ شخص مشہور باجا عود بھی بہت اچھا بجاتا تھا جس کی تعلیم اُس نے فارس اور یمن میں پائی تھی - حارث بن کلدہ جناب رسالت پناہ صلعم کے عہد میں زندہ تھا اور آپ کے بعد ابابکر صدیق رض - عمر فاروق رض - عثمان ابن عفان رض - علی مرتضےٰ اور معاویہ کے زمانوں تک موجود رہا -

ایک مرتبہ معاویہ نے اس سے پوچھا کہ طب کیا چیز ہے - کہا ازم یعنی بھوک - ابن جلجل کہتا ہے کہ کتاب صحاح میں جوہری نے ازم کے معنی کسی چیز سے رُکنے کے بتائے ہیں -

"ازم الرجل" یعنی وہ شخص اس چیز سے باز رہا - ابو زید کہتے ہیں کہ ازم کے معنے لبوں کا بند رکھنا ہے - یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ حضرت عمر رض

فاروق نے حارث سے پوچھا طب کیا ہے۔ کہا ازم یعنی پرہیز۔
اس شخص نے طبیب العرب کا خطاب حاصل کیا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص مکہ میں بیمار ہوئے اور جناب رسالت پناہ کی خدمت میں حاضر کئے گئے فرمایا طبیب حارث بن کلدہ کو بلایا جائے۔ جب وہ حاضر ہوا تو سعد بن ابی وقاص کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔ کوئی خطر کی بات نہیں۔ تھوڑا سا کھجور اور السی کا آٹا لے کر اور حریرے کے طور پر پکا کر پلا دیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور سعد بن ابی وقاص اسی سے اچھے ہو گئے۔ حارث کے اسی قسم کے اور بھی بہت سے معالجات مشہور تھے اور وہ اہل عرب کے عادات وخصائل کے لحاظ سے انہیں چیزوں سے انکا علاج کیا کرتا تھا۔ جن کے وہ خوگر تھے۔

طب کے متعلق اس کے بہت سے دلچسپ اقوال ہیں منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ بارگاہ کسریٰ میں اس کو باریابی کا موقع ملا جب وہ باریاب ہوا نوشیرواں کے روبرو کھڑا ہوا۔ کسریٰ نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ کہا میں حارث ابن کلدہ ثقفی ہوں پوچھا۔ کیا کام کرتے ہو؟ کہا طب کا پیشہ۔ پوچھا۔ کیا تم اعرابی ہو؟ کہا ہاں ٹھیٹ اعرابی اور اسی کے ساتھ عرب کا متوطن۔ پوچھا عرب کے لوگ طب کی قدر کیا جانیں؟ وہ تو جاہل۔ نادان اور ردی غذاؤں کے خوگر ہوتے ہیں۔ کہا۔ انہیں وجوہ سے تو انھیں اس امر کی ضرورت ہے کہ کوئی انکی جہالت کی اصلاح کرے۔ انکی کجی کو دور کرے انکے اجسام کی حفاظت کرے اور ان کے اخلاط کی تعدیل میں سرگرم رہے۔ اس لئے کہ عقلمند تو خود ہی ان سب باتوں کو جانتا ہے۔ وہ اپنے مرض کی حقیقت سمجھتا ہے اور اپنے حفظ صحت کے لئے پہلے ہی سے تدبیریں سوچ لیتا ہے۔ کسریٰ نے کہا۔ وہ بھلا تیرا کہنا کسطرح مان لیتے ہیں؟ جواب دیا۔

بچوں کو بہلا پھسلا کر اور سانپ کو منتر کے زور سے مطیع کیا کرتے ہیں۔ اور اے بادشاہ! عقل تو قسمت ربانی ہے جو اس نے اپنے بندوں میں رزق کے طور پر تقسیم فرمائی ہے۔ ہر شخص اور قوم کا جو جو نصیب ہے وہ اسے مل جاتا ہے اور اس میں کس کو دخل ہے کہ کوئی دولتمند ہے کوئی مفلس اور محتاج۔ کوئی عالم ہے کوئی جاہل۔ کوئی عاجز اور بیکس ہے کوئی مدبر اور مآل اندیش۔ الحقصر یہ خدائے تعالیٰ کا عطیہ ہے اور اس میں کسی کا قابو چل نہیں سکتا۔ ان باتوں کو سنکر کسریٰ نہایت متعجب ہوا اور کہنے لگا کہ اہل عرب کے عادات وخصائل کے متعلق بھی کچھ بیان کرو۔ حارث نے کہا۔ وہ نہایت راستباز، حق پسند اور بے انتہا جری ہوتے ہیں۔ قدرت نے فصاحت و بلاغت ان کی زبانوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ اور حسب ونسب کے لحاظ سے انتہا درجہ کے شریف ونجیب ہوتے ہیں۔ ان کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ دلوں میں یوں اتر جاتی ہے جیسے کسی قادر انداز کے کمان کا تیر۔ بلکہ موسم بہار کی ہوا سے زیادہ نشاط افزا اور چشمۂ شیریں کے پانی سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ قحط میں وہ ایثار پسند لوگ مخلوق کو کھانے کھلاتے ہیں۔ اور رزم کے زمانہ میں سروں پر تلواریں لگاتے ہیں۔ کوئی شخص انکی عزت کو صدمہ نہیں پہنچا سکتا۔ اور کسی طرح ان کے ہمسائے تکلیف نہیں دئے جاسکتے۔ کسی کی مجال نہیں جو انکی طرف آنکھ بھر کے دیکھ سکے اور ان کے واجب التکریم لوگ ہرگز ذلیل نہیں کئے جاسکتے۔ وہ اپنے آگے سب کو ہیچ سمجھتے ہیں مگر اے جلیل القدر بادشاہ چونکہ کوئی عام شخص یا بادشاہ آپ کا مقابل قرار دیا جاسکتا ہے۔ لہذا بادشاہ کی فضیلت کے آگے وہ بھی سر تسلیم خم رکھتے ہیں۔ یہ باتیں سنکر نوشیرواں دوزانو ہو بیٹھا اور اس کی خوش بیانی سے اتنا خوش اور متاثر ہوا کہ چہرے سے مسرت کا پسینہ ٹپکنے لگا اور

دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔ دیکھو یہ شخص کتنا آزاد منش اور اپنی قوم کا کیسا مداح اور اُن کے فضائل کا کس قدر سچائی کے ساتھ معترف ہے۔ عاقل اور صاحب تجربہ شخص کی شان یہی ہونی چاہئے۔ پھر حارث کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ اجازت پاکر بیٹھ گیا۔ نوشیرواں نے پوچھا۔ تمہیں فن طب میں کیسا دخل ہے؟ کہا۔ نہایت کافی۔ پوچھا۔ طب میں اصل اور بڑا اگر کیا ہے؟ کہا۔ ازم۔ پوچھا ازم کسے کہتے ہیں؟ کہا۔ منہ پر قابو رکھنا اور ہاتھوں سے کام لینے میں اعتدال کا لحاظ۔ کسریٰ نے اس بات کی داد دی۔ پھر پوچھا۔ سب بیماریوں کی جڑ اور سب سے خوفناک مرض کیا ہے؟ کہا۔ غذا کے ہضم ہونے سے پہلے غذا کا استعمال۔ کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس سے مخلوق فنا ہو جاتی ہے اور درندوں تک سے جنگل خالی ہو جاتے ہیں۔ کہا سچ ہے۔ پوچھا۔ وہ کون سی چنگاری ہے جس سے بیماریاں ہیجان میں آتی ہیں؟ کہا۔ تخمہ۔ اگر باقی رہ گیا تو مہلک ہے اور تحلیل ہو گیا تو ردی اخلاط کی تولید کا باعث ہو کر امراض کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔ کہا سچ ہے۔ پھر کہا۔ پچھنوں کے بارہ میں تمہاری رائے کیا ہے۔ کہا۔ زوالِ قمر کے زمانہ میں اگر ابر و باراں نہ ہو۔ رنج و غم بھی نہ ہو اور سکون و راحت ہو۔ تو پچھنے لگوانا فوری مسرت اور رفع کلفت کا سبب ہوتے ہیں۔ پوچھا۔ حمام وغیرہ کے باب میں کیا رائے ہے؟ کہا۔ شکم سیری کی حالت میں حمام کرنا۔ نشہ کی حالت میں سو جانا۔ رات کے وقت ننگا رہنا۔ اور حالت غیظ و غضب میں کھانا کھا لینا ہرگز مناسب نہیں۔ نفس کو سکون کی عادت ڈالنی چاہئے کہ دل مطمئن رہے۔ غذا میں تقلیل لازم ہے کہ خوشگوار نیند آئے۔ پوچھا کہ دواء کے بارہ میں کیا رائے ہے؟ کہا۔ جب تک تندرستی ہو دوا کو نہ چھوؤ لیکن مرض پیدا ہو جائے تو اس کے استحکام سے پہلے چارہ سازی کی تدبیر کر لو۔

کیونکہ بدن کی حالت زمین کی سی ہے۔ اگر اصلاح ہوتی رہے تو بن جاتی ہے ورنہ خراب ہو جاتی ہے۔ پوچھا۔ شراب کے بارہ میں کیا رائے ہے؟ کہا۔ نفیس شراب سرور و نشاط پیدا کرتی ہے۔ رقیق خون میں جلد شریک ہو جاتی ہے اور خوشگوار شراب اشتہا پیدا کرتی ہے مگر بادۂ ناب کو بلا امتزاج نہ پیو کہ دردِ سر کی مورث ہے اور انواع انواع کی بیماریاں کھینچ لاتی ہے۔ پوچھا۔ گوشت کونسا بہتر ہے؟ کہا۔ نوجوان اور تندرست مینڈھے کا۔ مگر سوکھا نمکین گوشت ایک مہلک چیز ہے اور اونٹ بیلوں کے گوشت سے بھی احتراز لازم ہے۔ پوچھا۔ پھلوں کے بارہ میں کیا رائے ہے؟ کہا۔ نورس اور پختہ پھل جب تک اُن کا موسم اور وقت ہے۔ اچھی چیز ہیں۔ اور جب فصل کا اخیر وقت آجائے تو پھلوں کو ہرگز نہ چھوؤ۔ پھلوں میں بہتر پھل انار اور نارنگیاں ہیں۔ پھولوں میں پھول گلاب اور بنفشہ۔ اور ترکاریوں میں ترکاری ککڑی اور کاہو۔ پوچھا۔ پانی کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کہا۔ پانی جسم کے لئے روح رواں ہے اور صحت کا دار و مدار اُسی پر ہے۔ لیکن مقدار کے موافق پیا جائے تو مفید ہے اور بے اندازہ یا سو کر اُٹھتے ہی پیا جائے تو مضر۔ پانی کی صفت یہ ہے کہ رقیق ہو۔ صاف و شفاف ہو۔ بڑے بڑے بہتے دریاؤں کا ہو۔ ٹھنڈا ہو۔ جنگلوں وغیرہ کی کثافتیں اُس میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ اور مصفا چشموں میں مسلسل موجوں کے ساتھ حرکت میں ہو۔ پوچھا۔ اُس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟ ماء الحیاۃ وہ ہے جس میں ذائقہ کا وہم و گمان تک نہ ہو۔ پوچھا۔ رنگ کیسا ہو؟ کہا۔ جس کا رنگ متعین کرنے میں حیران رہ جائے اور ہر ایک چیز کا انعکاس اسکو اپنا ہمرنگ بنا سکے۔ پوچھا۔ انسان کے جسم میں اصل چیز کیا ہے؟ کہا۔ سر۔ پوچھا آنکھوں میں جو نور ہے یہ کیا چیز ہے؟ کہا۔ تین چیزوں سے مرکب۔ سفیدی

چربی ہے۔ سیاہی پانی اور پتلی ریح ہے پوچھا۔ جسم انسان کتنی چیزوں سے بنا ہے۔ کہا۔ چار چیزوں سے۔ سودا جو سرد و خشک ہے۔ صفرا جو گرم و خشک ہے۔ خون جو گرم و تر ہے اور بلغم جو سرد و تر ہے۔ پوچھا۔ ایک ہی چیز سے کیوں نہ بنایا گیا؟ کہا۔ ایک چیز ہوتی۔ تو آدمی نہ کھاتا۔ نہ پیتا۔ نہ بیمار ہوتا۔ نہ جیتا اور نہ مرتا۔ پوچھا۔ دو طبیعتوں پر کیوں اقتصار نہیں کیا گیا؟ کہا دو متضاد چیزیں ایک دوسرے کو فنا کر دیتیں۔ اور تین ہوتیں تو ان میں موافقت اور مخالفت صحیح کا اندازہ پیدا نہ ہوتا۔ اسلئے چار ہی موزوں تھیں اور انہیں سے اعتدال و قوام حاصل ہے۔ کہا۔ گرم و سرد چیزوں کو مختصر اور جامع الفاظ میں بیان کرو۔ جواب دیا کہ جتنی میٹھی چیزیں ہیں۔ گرم ہیں۔ جو ترش ہیں سرد ہیں۔ جو تیز و تند ہیں وہ بھی گرم ہیں۔ جتنی تلخ ہیں معتدل ہیں گر انہیں بعض گرم اور بعض سرد بھی ہوتی ہیں۔ پوچھا۔ مرہ صفرا کا علاج کیا ہے کہا۔ ملینات بارد۔ پوچھا۔ مرہ سودا کا؟ کہا۔ ملینات حارہ۔ پوچھا۔ بلغم کا؟ کہا۔ گرم و خشک چیزیں۔ پوچھا۔ خون کا؟ کہا۔ بڑھ جائے تو نکالنا اور گرم ہو جائے تو سرد و خشک چیزوں سے اس کا جوش فرو کرنا۔ پوچھا امراض ریاحی کا علاج کیا ہے؟ کہا۔ حقنوں کے ذریعہ سے تلئین اور گرم تیلوں سے تدہین کہا۔ حقنے کو تم بھی جائز سمجھتے ہو؟ بولا۔ کیوں نہیں؛ حکما نے لکھا ہے کہ حقنوں سے معدہ وغیرہ پاک ہو کر اندرونی امراض کافور ہو جاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے جو شخص حقنے کا خوگر ہو۔ اسپر بڑھاپا چھا جاوے یا وہ لاولد رہ جائے۔ سب سے بڑی جہالت یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر مضر چیزوں کا استعمال کرے اور اپنی صحت جسمانی پر خواہشات نفسانی کو ترجیح دے۔

پوچھا۔ پرہیز کیا ہے۔ کہا۔ ہر چیز میں اعتدال۔ کیونکہ زیادہ کھانا مسالک روح کو بند کر دیتا ہے۔ پوچھا۔ عورتوں اور ان سے مقاربت کے بارہ میں کیا کہتے ہو؟ کہا اُس کی زیادتی بری ہے اور یاد رکھو سن رسیدہ عورتوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ انکی مثال پرانے مشکیزے کی سی ہے۔ اُن کا پانی سم قاتل ہے اور اُن سے مقاربت موت کی حال۔ بخلاف اس کے نوجوان عورتیں ہیں۔ اُن کی خوشبو لطیف ہے اور اُن کے حرکات دل فریب۔ اُن کا دیدار نشاط افزا ہے اور اُن کی ہمکناری سرمایۂ دنیا و مافیہا۔ پوچھا۔ شانِ دلبری کے لئے کونسی عورتیں مناسب ہیں اور کن کا جمال آنکھوں میں نورِ مسرت کا ذریعہ ہوتا ہے؟ کہا۔ جو سرو قد ہوں۔ سر بڑا اور ابرو کشادہ رکھتی ہوں۔ ناک ستواں اور کچھ خم دار ہو۔ سرگین چشم ہوں۔ لبوں کی سرخی گلاب کی پنکھڑیوں کو شرمائے۔ رخسار تاباں اور صاف ہوں۔ سینہ فراخ ہو۔ گردن صراحی دار ہو۔ گل رخسار پھول کی پتیاں ہوں۔ لبوں کی سرخی سوسنی رنگ لئے ہوئے ہو۔ ابرو اتنے دراز ہوں کہ باہم مل جائیں۔ دونوں قبہ ہائے نور کا ابھار موزوں ہو اور پاؤں خوش ادا ہوں۔ رنگ نکھرا ہوا ہو۔ گیسو دراز ہوں اور گھنے ہوں۔ رخسار تر و تازہ اور گل اندام ہوں۔ اندھیرے میں دیکھئے تو چودھویں رات کا چاند نظر آئے۔ ہنسی میں غنچہ کا چٹکنا یاد دلائے۔ لب ارغوانی ہوں اور وہ سراپا بقعہ نور ہو۔ نرمی میں مکھن۔ مٹھاس میں شہد ہو۔ حورِ جنت الفردوس کو شرمائے اور اور اُس کے منہ سے گلاب اور چنبیلی کی سی خوشبو آئے۔ انہیں صفات سے متصف عورت نشاط کا سبب ہے۔ ان باتوں کو سن کر

نوشیروان ایسا ہنسا کہ اس کے شانے تک حرکت کرنے لگے۔

پھر پوچھا کہ اوقات جماع کیا ہیں۔ کہا۔ آخر شب۔ اس لئے کہ اسوقت پیٹ ہلکا ہوتا ہے۔ طبیعت میں راحت و سکون اور قلب میں امنگ ہوتی ہے اور رحم بھی پاک ہوتا ہے۔ لیکن دن میں تمتع اٹھانا چاہتے ہو تو صرف آنکھوں سے ان کے جمال جہاں آرا کی گلچینی کرو۔ اور گل چہرہ سے تمازت حسن چنو۔ ان کی میٹھی میٹھی باتوں سے اپنے کانوں کو مسرت اندوز بناؤ اور ہمہ تن محوِ نظارہ ہو جاؤ۔ نوشیروان نے کہا۔ شاباش۔ اے اعرابی۔ تم تو بڑے عالم اور نہایت ذہین اور ذکی شخص نکلے۔ اس کے بعد حارث کو خلعت وانعام اور نہایت گراں بہا صلہ دے کر رخصت کیا۔ و [illegible] میں جو تقریر کی تھی لکھوا کے رکھ لی۔

واثق باللہ اپنی کتاب بستان میں لکھتے ہیں کہ حارث ابن کلدہ کہیں جا رہا تھا۔ کچھ آدمیوں کو دیکھا۔ دھوپ میں بیٹھے ہیں۔ کہا۔ سایہ میں بیٹھو۔ تمازتِ آفتاب کپڑے تک کو بودا کر دیتی ہے اور اس سے تعفن پھیلتا ہے۔ رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور اس کی حدت سے امراض کے دفینے کھل جاتے ہیں۔

حارث بن کلدہ کے اقوال

بطن بیماریوں کا مخزن ہے اور پرہیز سود مند داؤں کی ایک دوا۔ اور تم بدن کو جو عادت ڈالو وہی پڑ جاتی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کہ یہ مقولے عبد الملک بن الجبر کے ہیں۔ بعض لوگ انہیں جناب رسالتمآب صلعم کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لفظ بطن کی جگہ معدہ کا لفظ ہے

جو بحیثیت مقام زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ اور یہ بھی روایت کی جاتی ہے۔ کہ مندرجہ ذیل مقولے اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے ہیں۔

جو شخص حفظ صحت کا طالب ہے اس کو غذا میں تلطیف کا خیال رکھنا چاہیے۔ اشتہائے صادق ہو تب کھانا کھائے۔ اور خوب پیاس لگے تب پانی پئے بلکہ حتی الامکان پانی کم پینا چاہیے۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرے۔ گر غذائے شب کے بعد تھوڑی دیر چہل قدمی کرنا مناسب ہے۔ معدہ خالی ہو تو سونا مضر ہے اور امتلاء معدہ کی صورت میں حمام کرنا پر خطر۔ موسم گرما میں ایک بار حمام کرنا۔ جاڑوں کے جاڑوں میں دس بار حمام کرنے سے بہتر ہے۔ رات کے وقت خشک گوشت کا استعمال پیام اجل ہے۔ اور جماع عجائز مقراض عمر۔

کلمات ذیل میں بعض کو حارث بن کلدہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

جس شخص کو عورتیں محبوب ہوں رات کی غذا سویرے کھائے اور صبح کو بھی غذا میں دیر نہ لگائے۔ قرض کا بوجھ ہلکا کرے اور جماع میں کمی اختیار کرے۔

عبد الملک بن عمر کہتے ہیں کہ حارث کا مقولہ تھا جو شخص بقا کا طالب ہے (اور بقا کہاں) تو صبح سویرے اور رات کو جلد کھانا کھائے۔ اپنی گردن سے قرض کا بوجھ ہلکا کرے۔ عورتوں سے جماع میں اعتدال کا طریقہ ملحوظ رکھے۔

جریر ابن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حارث ابن کلدہ بیان کیا کرتا تھا۔ چار چیزیں نفس ہستی کے انہدام کا موجب ہیں۔

امتلاء معدہ کی حالت میں مقاربت کرنا یا اُس حالت میں حمام کرنا۔ سوکھا گوشت کھانا۔ اور عجائز سے جماع کرنا۔

داؤد ابن رشید عمرو بن عوف سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حارث ابن کلدہ کے گرد و پیش بہت سے لوگ جمع ہو کر پوچھنے لگے کہ ہمیں کچھ ایسی باتیں بتائیے جن پر آپ کے بعد ہم لوگ کاربند رہیں۔ کہا۔ شادی کرو۔ تو جوان عورت سے کرو پھل کھاؤ تو دیکھ لو کہ خوب پکے ہوئے ہوں۔ اور بغیر مرض کے دواؤں کے عادی نہ ہو۔ ہر مہینے میں ایک مرتبہ نورہ کا استعمال رکھو کہ وہ بلغم کو پگھلاتا ہے۔ مرہ صفرا کی بیخ و بنیاد کھاٹتا ہے۔ اور گوشت اگاتا ہے۔ جب غذا کھاؤ تو اُس کے بعد قیلولہ کرو لیکن غذائے شب کے بعد کم از کم چالیس قدم ضرور ٹہلا کرو۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب ضرورت داعی ہو تو دوا سے دفع الوقتی کرو۔ لیکن بلا ضرورت دوا پینا بدن کی اصلاح کے عوض فساد کا سبب ہے۔

سلیمان ابن جلجل کہتے ہیں کہ مجھے بذریعہ حسن بن حسین کے انہیں سعید بن اموی سے۔ انہیں، ان کے چچا محمد بن سعید سے۔ اور انہیں عبد الملک بن عمیر سے روایت پہنچی ہے کہ قبیلہ ثقیف بن کنہ میں دو بھائی تھے جن میں باہم انتہا درجہ کی الفت تھی۔ اور ہر ایک دوسرے پر شیدا تھا۔ اتفاقاً بڑا بھائی بضرورت سفر کہیں جانے لگا تو اپنے چھوٹے بھائی کو اپنی بیوی کی خبرگیری کے متعلق سمجھا گیا۔ اتفاقاً اُس کی آنکھ ایک دن بھاوج سے دوچار ہو گئی اور آتش عشق سے گھلنے لگا۔ بھائی نے واپسی کے بعد یہ حال دیکھا تو اطبا سے رجوع کی مگر کسی طبیب نے اُس کے مرض کو نہ پایا۔ یہاں تک کہ حارث بن کلدہ کے سامنے لایا گیا۔ اُس نے دیکھتے

ہی کہا کہ اس کی آنکھوں پر شرم و حجاب طاری ہے لیکن میں امتحان کرلوں تو بتاؤں کہ کیا مرض ہے پھر اس نے نوجوان کو شراب پلائی۔ نشہ ہوتے ہی اس نے جذبۂ شوق میں عشقیہ اشعار گانے شروع کئے جس میں اس نے اپنی معشوقہ کے قبیلہ بنی کنہ میں ہونے کا پتہ دیا۔ یہ حال دیکھ کر سب متعجب ہوئے اور کہنے لگے کہ عرب کے سب سے بڑے طبیب بلاشبہ تمہیں ہو۔ حارث نے تھوڑی سی شراب اسے پھر پلوائی جس کے بعد اس نے ایسے اشعار پڑھے جن سے اس کا رازِ دل پورے طور پر آشکارا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اس کے بھائی نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ اس سے نکاح کرلو اس نے کہا بخدا میں ہرگز اپنے عقد میں نہ لاؤں گا یہاں تک کہ سوزِ عشق میں جان دے دی اور حسرتِ وصال ساتھ لے گیا۔

حارث ابن کلدہ ثقفی نے کتاب المحاورہ فی الطب تصنیف کی تھی۔ جس میں اس کا اور نوشیرواں کا مکالمہ درج تھا۔

حکیم محمد یوسف نیّر از حیدرآباد

(ماخوذ از عیون الانباء فی طبقات الاطباء)

خواجہ وزیر

ذیل کا ناقدانہ مضمون ہمارے فاضل بھائی جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے از راہِ عنایت ارسال فرمایا ہے۔ ہم اُسے بشکریہ درج رسالہ کرتے ہیں اور جناب عشرت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اسی قسم کے اور مضمون بھی عنایت فرمائیں۔ واقعی اردو علم ادب کو ایسے ہی وسیع واقفیت رکھنے والے نقادانِ نظم ونثر انشاپردازوں کی ضرورت ہے۔ جو اپنے قواے دل ودماغ کے بل پر ادب اردو کے قالب میں جان ڈال سکتے ہوں (طور)

خواجہ محمدؐ وزیر نام تخلص وزیرؔ مرحوم شیخ ناسخؔ مرحوم کے ارشدِ تلامذہ شمار کئے جاتے ہیں۔ شاعری کے لحاظ سے انکی طبیعت اپنے زمانے کی خسروِ ملک سخندانی تھی۔ والد کا نام خواجہ محمدؐ فقیر تھا۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاوالدین نقشبندی علیہ الرحمۃ سے ملتا ہے۔ آپ اعمالِ فتوح وتسخیر میں بے مثل عامل مشہور تھے۔

شاعری میں پختہ کار تھے۔ پہلا دیوان جو آپ نے جمع کیا اتفاقِ زمانہ سے برباد ہوگیا۔ طبیعت میں اس قدر استغنا تھا کہ آپ کو کلام کے ضائع ہونے کا مطلق رنج نہ تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے۔ دو مہینے کی توجہ میں دیوان جمع کرسکتا ہوں۔

اس زمانے کی قدردانی کی اونے تعریف یہ ہے کہ سو روپے ماہوار سے خواجہ صاحب کا خرچ کم نہ تھا پھر کسی کے ملازم تھے نہ کوئی زمینداری تھی۔ محض شاگردوں کی خدمت گزاری کا فیض سمجھنا چاہیئے۔

دو مرتبہ اودھ کے آخری بادشاہ حضرت محمد واجد علیشاہ مرحوم نے دربار میں طلب فرمایا۔ آپ نے عذر کر دیا کہ فقیر نہایت ضعیف ہے۔ دربار کی صحبت کے لائق نہیں ہے۔

ابتدا میں فقیر محمد خاں گویا سے لطف صحبت رہتا تھا۔ دونوں باہم شیر و شکر تھے۔ آخر کو شکر رنجی ہوئی۔ صحبت دیرینہ درہم و برہم ہو گئی۔ گوشہ نشینی اختیار کی گھر سے قدم باہر نہ نکالا۔

آفتاب الدولہ خواجہ ارشد علی خاں قلق انکے حقیقی بھانجے تھے مثنوی قلق انکی اصلاح سے مزین ہو چکی تھی۔

خواجہ بادشاہ سفیر مرحوم انکے بڑے صاحبزادے کا نام ہے۔ انکی تصنیف سے ایک مثنوی گلشن عشق مشہور ہے لیکن مثنوی قلق کی طرح مقبول نہیں ہوئی۔ سفیر کی شاعری بھی اچھی تھی۔ تخمیناً انکے انتقال کو بیس برس ہوئے سفیر کے دو فرزند تھے ایک کا تخلص قدیر تھا وہ عین عالم شباب میں باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ قدیر کی وفات کے دس برس کے بعد سفیر کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب کے شاگردان میں سید ہادی علی بیخود۔ سید محسن علی محسن۔ آفتاب الدولہ مہرالملک خواجہ ارشد علیخاں بہادر شمس جنگ عرف خواجہ اسد قلق۔

میر محمدی سپہر۔ شیخ بہادر علیصاحب ایجاد۔ شیخ قادر علی موحد صاحب دیوان تھے۔ تہذیب اخلاق اور فروتنی میں خواجہ صاحب کا مثل نہ تھا۔

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنی زندگی میں کہہ دیا تھا کہ وزیر میرا شاگرد رشید ہے انکی شاعری میں رعایت معنوی کا بہت لحاظ رہتا تھا اور اس کے ساتھ ہی رعایت لفظی مناسب موقع پر لکھتے تھے۔ ناسخ کے رنگ کو محاورات اور رعایات کا لباس پہنایا تھا۔ تاریخ بہت کم کہتے تھے لیکن جب فرمایش سے مجبور ہو کر کہتے تھے قلم توڑ دیتے تھے۔ داروغہ عاشق علیخاں نے عیش باغ کے قریب ایک باغ لگایا اس میں نقل روضہ کربلا بنوائی۔ خواجہ صاحب سے تاریخ کی فرمایش کی۔ آپ نے "باغ کربلا" میں مادہ تاریخ نکالا۔ قطعے بہت نہ لکھے مگر ایک قطعہ لکھا اور کس غضب کا لکھا:۔

الہیٰ تجکو غفور الرحیم کہتے ہیں ۔۔۔ اگر عوض مرے جرم و خطاے بیحد کا
یہ انکے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں ۔۔۔ میں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج

مثال دینے میں صاحب تھے ایک شعر میں لکھتے ہیں۔

نمایاں پشت لعل لب پہ یہ عکس مژگاں کا ۔۔۔ مسیں بھیگی نہیں ہیں آو نیرا اس آئینہ روکی

مسیں بھیگنا سبزہ آغاز ہونا۔ مراد یہ ہے کہ سبزہ آغاز نہیں ہوا بلکہ لعل لب کی پشت پر مژگاں کا عکس پڑتا ہے۔

جھکائی میں نے جب گردن تو اٹھا ہاتھ قاتل کا ۔۔۔ ادھر میں نے تواضع کی اُدھر تعظیم اُسنے کی

اس کی صفائی بندش کو ملاحظہ کیجیے

بنایا کرتے ہیں ناوک فگن تودہ مرے گل کا ۔۔۔ نشانہ بعد مردن بھی رہا میں تیر قاتل کا
خدہے نام ملک عاشقی میں پہلی منزل کا ۔۔۔ یہیں مردن بھی مشکل ہے پہنچا یار تک دل کا

بلند مضامین قابل دید ہے۔

اسے خضر آچشمہ حیواں دیکھا ۔۔۔ آج ہم نے لب جاناں دیکھا

لب جاناں کو چشمۂ حیواں سے کتنی نازک تشبیہ دی۔ چند ان چھوٹے چھوٹے

مصرعوں میں کتنی صفائی سے اس مضمون کو ادا کیا ہے۔

جب سوئے گورِ غریباں دیکھا | بادشاہی کی تمنا نہ رہی

کیا عبرت ناک سین دکھایا ہے۔

کس کی پھر جھوٹی قسم کھائیگا | سر مرا کاٹ کے پچھتائے گا

کس قدر معاملہ بندی ہے اللہ اللہ!

خاک سے پیدا ہوا اور خاک میں مدفوں ہوا | مر گیا لیکن نہ میں منت کشِ گردوں ہوا

اتنا غیرت دار تھا کہ آسمان کا احسان نہ لیا۔ خاک سے پیدا ہوا اور خاک میں مل گیا۔

یعنی دہانِ تنگ پہ دھوکا ہو خال کا | شوخی ہے یہ بھی اُسنے جو مِسّی لگائی ہے

دہانِ تنگ کو تل سے نئی مثال دی ہے یہ تنگیِ دہن کا انتہائی ثبوت ہے۔

جان کے میں برہنہ پا ہو گیا | فرشِ الٰہی ہے زمیں اے جنوں!

کتنا نیچرل مضمون ہے۔

مفت میں انگشت نما ہو گیا | ہاتھ و زیرؔ اُس کو لگایا نہیں

کتنا بامحاورہ شعر ہے۔

گرہ پڑ جاتی ہے جسوقت دھاگا توڑ کر جوڑا | ہوا جب دل شکستہ پھر صفائی غیر ممکن ہے

کتنا عمدہ تمثیلیہ شعر ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صائب نے اردو میں شاعری کی ہے۔

مذیر! نیکوں کی صحبت سے بد بھی ہوتے ہیں نیک
کسی کو کاٹے نہ زنہار یاسمیں کا سانپ!

یہ ایک کلیہ ہے چنبیلی کے درخت پر جو سانپ ہوتا ہے وہ کسی کو نہیں کاٹتا۔

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شاداں ہو کر زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

کتنا بلند مضمون ہے

آبِ شمشیر پلا دو مئے احمر کے عوض بھر دو قبضے کے کٹورے کبھی ساغر کے عوض

یہ ایک نازک بات بیان کی ہے اچھی تلوار میں قبضے کے دو طرف کٹورے بنے ہوتے ہیں جن میں مقتول کا خون جمع ہوتا ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ مئے احمر کے بدلے آبِ شمشیر پلا دو ساغر کے بدلے قبضے کے کٹورے بھر دو یعنے قتل کر دو۔

یہ کیا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل ورنہ زخم پکارا کئے "قاتل قاتل"

کتنا صاف مطلع ہے۔

کس قدر ہے فرق یوسف میں اور اپنے یار میں
گو خریدار اس کے آئیں یہ بکے بازار میں

کیا اچھا ثبوت ہے

وصل کی رات ہے جھگڑ و نہ برابر تو رہے
پھٹ گیا میرا گریبان۔ تمہارا دامن

کیا اچھا ثبوت مساوات کا دیا ہے۔

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

یہ مطلع قصہ طلب ہے کسی خاص صحبت مشاعرہ میں خواجہ حیدر علی آتش نے ناسخ پر چوٹ کی تھی جس کا مطلع یہ تھا۔

یہ بزمِ خاص ہے کچھ بارگاہِ عام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازئ غلام نہیں

ناسخ کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انکو شیخ خدا بخش سوداگر نے مول لے کر اپنا بیٹا بنایا ہے اور یہ افواہ ایسی مشہور ہوئی کہ لوگوں کو یقین کامل ہو گیا اس زمانے میں اس بات کا کافی لحاظ تھا کہ شاعر عالی خاندان نجیب الطرفین ہو ورا سے شک میں لوگ پرہیز کرتے تھے۔ آتش نے اسی چوٹ پر مطلع کہا تھا جس میں ناسخ کے وقار اور عزت میں فرق آئے۔ لیکن لائق شاگرد وزیر نے اسکا معقول جواب دیدیا۔

یہ سر جھکانا یہ منہ پھیرنا ہے مانع دید
مری نماز میں سجدہ نہیں سلام نہیں

ہماری نماز میں سجدہ ہے نہ سلام ہے کیونکہ سر جھکانا منہ پھیرنا مانع دید ہے کس قدر نئی اور نازک بات ہے اسی کا نام شاعری ہے۔

مر گئی بلبل جو کیا یاد چمن کو
غربت میں خدایا دلائے نہ وطن کو

کتنا صاف مطلع ہے

اس پتہ سے پوچھنا قاصد مکان یار کو
چاندنی کہتے ہیں کس کے سایۂ دیوار کو

کیا پتہ بتایا ہے اسی کا نام کمال شاعری ہے۔

سائل کا ہاتھ چوم لے دست خدا کے ساتھ آیا ہے پادشہ ترے در پر گدا کے ساتھ

یہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سائل کے ہاتھ کے نیچے خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔

وہ پریزاد ستانے سے خفا ہوتا ہے	اب سلیماں بھی اگر آئیں تو کیا ہوتا ہے
جو کہ طائر ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے	اے شہ حسن وہ اڑتے ہی ہما ہوتا ہے

انکا حسنِ بندش اور زبان قابلِ دید ہے۔

سبکروحی سے بوئے گل بنا ہوں وہ بلبل ہوں کہ غنچہ آشیاں ہے

آشیانِ بلبل کو غنچہ سے تشبیہ دی ہے۔

ایسا اک جام دے اے ساقی مینوش ! مجھے دونوں عالم لنظر آنے لگیں بیہوش مجھے

یہ ایک فلسفیانہ مطلع ہے۔

برق و باراں جسکو کہتے ہیں وہ اک افسانہ ہے
کچھ حقیقت رونے کی کچھ حال بیتابانہ ہے

کیا پاکیزہ بامحاورہ تشبیہ ہے

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سوگیا ہے درِ فتنہ باز ہے

کھلی ہوئی آنکھوں کو درِ فتنہ سے کیا خوب مثال دی ہے۔

کیا کیا نہ ہم کو اپنی عبادت پہ ناز تھا بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے

بے نیاز جس کو اطاعت کی پروا نہ ہو جو گنہگار اور زاہدوں کو برابر سمجھتا ہو۔

دن ہو گیا نمود شب وصل کٹ گئی الٹی نقاب کیا میری قسمت الٹ گئی
تکلیف دستِ یار کو بارِ دگر ہوئی افسوس ایک وار میں گردن نہ کٹ گئی

کتنی پاکیزہ بندش ہے!

چاہتا ہے خاک کیا تو گھر بنانے کے لئے
فکر رہنے کی نہ کر آیا ہے جانے کے لئے

بے ثباتی دنیا کا نقشہ کھینچ دیا۔

مے دے کہ نہ دے بادۂ اطہر تو نہیں ہے

کچھ پیرِ مغاں ساقیِ کوثر تو نہیں ہے
میں آنکھیں بچھاؤں وہ شہِ حسن اگر آئے
درویش ہوں آزاد ہوں۔ بستر تو نہیں ہے

تم جو پتھراؤ کرو کور بھی بینا ہو جائے — منہ پہ پتھر جو لگے آنکھ کا ڈھیلا ہو جائے

لکھنے لگا حقیقتِ گریہ جو یار کو — میری طرح قلم کے بھی آنسو نکل پڑے

دیکھ چھپائے گا او بت مرے ترسا بچے — اُٹھ کے کعبہ کو چلا جاؤنگا بتخانے سے
وہ مسیحا جو چلا ہاتھ چھڑا کر شبِ وصل — نبضیں بھی چھوٹ گئیں ہاتھ کے چھُٹ جانے سے

سینہ پہ میرے زخم ہیں کیا بے نشاں لگے — جراح ہاتھ ملتا ہے پھاہا کہاں لگے؛

یادِ مژگاں میں بری آنکھ لگی جاتی ہے — لوگ سچ کہتے ہیں سولی پہ بھی نیند آتی ہے

مسطورہ بالا اشعار سے آپ کو خواجہ وزیر مرحوم کی شاعری کا حال معلوم ہو گیا ہو گا کہ کس پایہ کے شاعر تھے۔

انکی زندگی میں انکی کلام کی شہرت اِس قدر تھی کہ مالک مطبع مصطفائی نے دیوان طبع کرنے کی خواہش کی یہاں دیوان کیا ایک غزل بھی پاس نہ تھی۔ وعدہ کیا کہ انشاء اللہ اب جو کچھ کہونگا جمع کرتا جاؤنگا اور اگر عوارضِ لاحقہ سے مہلت ملی تو دو مہینے میں دیوان پورا کر دونگا۔ مگر ابھی ایفاے وعدہ کی مدت پوری نہ ہونے پائی تھی کہ ذیقعدہ کی بائیس تاریخ سنہ ۱۲۷۰ھ •

کو جمعہ کے روز انتقال فرمایا۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی میر مظفر علیخاں بہادر اسیر نے تاریخ انتقال لکھی۔

رحلتِ خواجہ وزیر اہل جہاں کو ہوئی شاق خاک بر سر ہوئے اس غم سے صغیر اور کبیر
کی رقم کلک نے صفحہ پہ یہ تاریخ وفات خواجۂ عالمِ ارواح ہوئی جانِ وزیر
۱۲ھ

واقعی دنیا کیا ہے ایک نگار خانۂ بے ثبات ہے جس میں فنا ہونے والی صورتیں دکھائی جاتی ہیں۔ گلشن کی بہار ایک تماشا ہے جس میں خزاں کا رنگ بھرا ہے۔

یہ خوشنما درخت۔ یہ رنگ رنگ کے پھول۔ یہ ہری ہری پتیاں ایک دن صرفِ خزاں ہونگی جو کلی کھلکھلا کر ہنستی ہے ایک دن شبنم اس کے حال پر ضرور روئے گی۔

ایسے ایسے مشہور شاعر لکھنو کی سرزمین میں خواب ناز فرما رہے ہیں لیکن افسوس ہے انکی قبر کا نشان بھی مشکل سے ملتا ہے۔

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

کانِ ملاحت

ذیل کا مفید مضمون ہمارے محترم دوست حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کے قلم جدت رقم سے ہے۔ آپ عرصہ سے طرح طرح کے آلام میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں آپ کی زوجۂ محترمہ آپ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ اس کے بعد آپکے والد ماجد بھی عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ ایسے ایسے داغہائے سینہ کے ہوتے بہ خواسم

کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد

آپ کو نظم و نثر لکھنے کی بھلا کہاں فرصت ہے۔ مگر پھر بھی ہماری درخواست پر جو ہم نے ان حالات سے بیخبری کی حالت میں کی تھی۔ آپ نے مضمونِ ہذا عنایت فرما کر اپنی دیرینہ مخزن نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ جسکے لئے ہم تہِ دل سے جنابِ فراق کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ دیگر پسماندگان کو بالعموم اور جنابِ فراق کو بالخصوص صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اور انہیں اس امتحانِ الہٰی میں جو انہیں اجداد سے ترکہ میں ملا ہے۔ ثابت قدمی عطا ہو مضمون کے متعلق ہمیں ڈر ہے کہ بعض سطحی نظر رکھنے والے ناظرین اسے حدیث و قرآن کے آیات سے لبریز دیکھ کر اس کو مذہبی مضمون خیال کرینگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کانِ ملاحت دراصل عشقِ فتنہ انگیز کی رنگا رنگی اور سیماب صفتی کی مجسم تصویر ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر ہندو مسلمان عشق کی لذات اور اس کے اسرار حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ پڑھنے والے کے دل میں عشق کی ذرا سی چمک ہو ؎

مجھے قدر عاشقوں کی مرے جان! خوب ہوتی ترا نیشِ غم سے سینہ جو کبھی فگار ہوتا

باغ میں گل کھلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں
انگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

حضرت سید جعفر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے (جو خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز کے کامل خلیفہ ہیں اپنی کتاب بحر المعانی کے عنوان میں) یہ حدیث ارقام فرمائی تھی انا نور من نور اللہ والخلق من نوری یعنے حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے نور میں سے ایک نور ہوں اور تمام خلق میرے نور سے بنی ہے مگر تمام خلق میں سب سے پہلے جو چیز پیدا کی گئی تھی وہ کیا تھی۔ عقل۔ چنانچہ یہ حدیث اول ما خلق اللہ تعالی العقل پہلی حدیث کی تفسیر کرتی ہے عقل کو تین قسم کی معرفت دی گئی تھی۔ معرفت الہی معرفت نفس۔۔ معرفت فنا۔ پہلے معرفت سے حسن دوسری معرفت سے عشق تیسری معرفت سے حزن پیدا ہوا یا یوں سمجھئے کہ ایک ماں سے تین بھائی پیدا ہوئے جنکا نام حسن اور عشق اور حزن تھا حسن نے جب خود آرائی کے آئینہ میں اپنا دلفریب جمال دیکھا تو مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا اور کھلا کر ہنس دیا۔ اور حسینوں کے ہنسی میں پھول جھڑتے ہیں مگر حسن کے تبسم سے ملائکہ پیدا ہوگئے اور سبوح قدوس کی دھوم مچا دی۔ حسن کے تبسم ناز کو دیکھ عشق سے صبر نہ ہوسکا اور وہ یہ کہتا ہوا حسن کی طرف بلائیں لینے کو بڑھا۔

ــــ

دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں؟
دم ہی تو ہے سنجائے کیوں؟
ہمکو خدا جو صبر دے۔

تماشا حسین بنا ہے کیوں ؟

عشق کی بیخودی دیکھ کر حزن اس کے سنبھالنے کو اس کی جانب بڑھا۔ عشق نے اسے جھٹکنا چاہا مگر حزن اسے کب چھوڑتا تھا ان دونوں کی کشاکش سے آسمان اور زمین اور تمام کائنات پیدا ہو گئی۔ حسن ابھی اپنے ناز و انداز کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور اس کو یہ دھن سما گئی تھی کہ میرا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ میں بے مثال ہوں۔ میں بے نظیر ہوں۔ جو ایک معتمد جاسوس نے آکر اس سے کہا۔ مینے سنا ہے کہ جب تک حسن کو ملاحت کا زیور نہ ملیگا وہ روکھا اور پھیکا رہے گا۔

حُسن۔ ملاحت کیا پیارا نام ہے! اچھا! یہ بتاؤ۔ ملاحت کہاں ہے ؟

جاسوس۔ کانِ ملاحت میں

حُسن۔ اور کانِ ملاحت کہاں ہے ؟

جاسوس۔ فقط نام ہی نام سنا ہے۔ پتہ نہیں ملا ہے۔ مگر ملاحت ہی ایسی چیز ہے جس کی تمنا میں تمام جہان بے چین ہے۔

حسن ملاحت کے شوق میں بے قرار ہو گیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے زمین آسمان ایک کر ڈالا مگر ملاحت کا نشان کہیں نہ پایا۔ تھک کر بیٹھ رہا جو عالمِ ملکوت میں شور ہؤا۔ آدم! آدم!

حُسن (ملایکہ سے) یہ آدم کیا چیز ہے ؟

ملایکہ۔ سنا ہے خدا نے مٹی سے ایک پیاری صورت بنائی ہے اور اس کا نام آدم رکھا ہے۔ اپنا خلیفہ بھی اسی کو کرے گا اگر حکم ہو تو پر وہ زمین پر جا کر اسے دیکھ آئیں۔

حُسن (اپنے جی میں کہیں آدم ہی کانِ ملاحت نہ ہو اور ملایکہ

سے مخاطب ہوکر) میں خود جاتا ہوں اگر وہ دیکھنے دکھانے کے قابل ہوگا تو میں آکر تم سے کہہ دونگا پھر تم بھی جاکر دیکھ آنا۔

ملایکہ بہت خوب! بہت مناسب ہے۔

حسن نے جاکر جب خلیفۃ اللہ آدم علیہ السلام کی موہنی صورت دیکھی تو اس کی ادائیں جی میں کھُب گئیں اور حسن نے آدم کے سراپا میں اپنا گھر بنالیا۔ جب حسن پلٹ کر نہ آیا تو عشق و حزن بے قرار ہو گئے۔ اور ملایکہ کو ساتھ لے کر حسن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جب منزل مقصود پر پہنچے تو دیکھا۔ حسن آدم کے تن بدن میں سما گیا ہے اور خلافت کے تخت پر بڑے دبدبہ کے ساتھ تمام خدائی پر حکومت کر رہا ہے۔ عشق اور حزن نے جاتے ہی حسن کیطرح آدم کے وجود میں اپنا اپنا ٹھکانا کر لیا مگر ملایکہ کو حسن کی یہ شان و شوکت دیکھ تاب نہ ہوئی اور بے اختیار سجدہ میں گر پڑے۔ مگر کم بختی کا مارا ہوا شیطان حسن کے جاہ و جلال کو دیکھ کر جل مرا اور سجدہ کے لئے نہ جھکا واذ قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس۔ ابی واستکبر وکان من الکافرین۔ حسن نے آدم خاکی میں ملاحت کو برسوں ڈھونڈا مگر اس کا پتہ نہ چلا ادھر آدم کی عمر پوری ہوئی اور حسن ناکام اور اس کے ساتھ عشق و حزن بھی عالم بالا کو سدھار گئے۔ ایک مدت کے بعد یوسف کا غل مچا اور حسن اس امید میں کہ شاید کانِ ملاحت یوسف کے اندر پنہاں ہو۔ جستجو کے لئے چپکے سے چل دیا اور یوسف کے جسم نازنین میں داخل ہو کر کان ملاحت کو ڈھونڈنے لگا۔ ادھر عشق و حزن حسن کی جدائی نے تڑپا دیا اور یہ بھی دونوں کے دونوں حسن کے تجسس

میں آگے پیچھے چل دیئے اور خاک چھانتے کنعان پہونچے اور حضرت یعقوب سے معلوم ہوا کہ حسن یوسف کے پہلو میں بیٹھا ہوا مصر کے تختِ سلطنت پر براج رہا ہے۔ عشق یہ شعر پڑھتا ہوا فوراً مصر کو چل دیا ؎

بنا کر اپنا دیوانہ الگ بچ کر چلے جانا
ترے دامن سے لینا ہے مجھے بدلا گریباں کا

حزن بھی عشق کے ساتھ جاتا تھا مگر حضرت یعقوب نے اُسے روک لیا اور اُس کے نام پر بیت الاحزان نام مکان بنا کر اُس میں اُسے ٹھیرایا اور اسّی برس تک اپنا کلیجہ اور دل جلا جلا کر اُسے کھلاتے اور آنسوؤں کا خنک پانی پلاتے رہے۔ وابیضت عینٰہ من الحزن فھو کظیم ۵ حضرتِ حزن کا ایک ادنےٰ کرشمہ تھا۔ ادھر عشق نے مصر پہنچکر دیکھا کہ حسن یوسف کی شان دلربائی کے ساتھ تاجدار بن رہا ہے کورنش کے لئے جھکتا تھا جو ناز و ادا کے حاجبوں کو حکم ہوا کہ عشق بے ادب کو دربارِ محبوبی سے فوراً باہر نکال دو عشق دربار سے نکل کر حیران کھڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو پڑے بہ رہے تھے جو اُس کی خوش قسمتی سے زلیخا وہاں آنکلی اور اس کی اُس کی آنکھیں چار ہوگیں۔

زلیخا۔ اچھی! تم کون ہو؟ اور اس وقت تمہارے مُنہ پر اِس قدر اُداسی کیوں چھائی ہوئی ہے۔

حسن (رو کر)

نہ پوچھو کچھ مصیبت دردمندانِ محبت کی
خدا پر خوب روشن ہے گذر جسطرح کرتے ہیں

ہم تین سگے بھائی تھے ایک گھر میں بڑھے پلے۔ ایک مدرسہ میں

تعلیم پاتے رہے۔ میرا بڑا بھائی جس کا نام حسن ہے خلیفۃ اللہ آدم کے وجود میں حکمرانی کرتا تھا اُسنے مجھے آدم کے دل کی انگیٹھی گرم کرنے کی خدمت دے رکھی تھی۔ میں اُسی کو اپنا فخر جانتا تھا اور آدم کے قلب کی انگیٹھی کو خوب دہکاتا رہتا تھا۔ مگر کچھ دنوں سے ہم بھائیوں میں تفرقہ پڑ گیا ہے اور میں دن رات دھکے کھاتا پھرتا ہوں۔ زلیخا کامل عشق کی پرورد داستان پر پھر آیا اور اُس کو اپنا مہمان بنا لیا۔ پھر اس مہمان عزیز نے جو بھولی بھالی شاہزادی زلیخا پر تباہی ڈالی وہ سورہ یوسف میں مرقوم ہے قد شغفہا حبا اسکی جانب اشارہ ہے ہوتے ہوتے حسنِ یوسف کا شہرہ مصر سے کنعان پہونچا تو حزن نے حضرت یعقوب کو ابھارا اور سو سو برس کے بوڑھے کو مصر لے آیا۔ جب عشق اور حزن کو شاہنشاہِ حسن کے دربار میں باریابی ہوئی۔ تو ھذا تاویل الرءیا یہ کہتے ہوئے بے تحاشا اُس کے سامنے سجدہ میں گر پڑے۔ مگر حسن نے برسوں کی تلاش میں یوسف کے عارضِ تاباں اور کاکلِ پیچاں میں بھی کانِ ملاحت کو نہ پایا۔ آخر کار حضرت یعقوب حضرت یوسف۔ حضرتِ زلیخا جنت الفردوس کو سدھارے اور حسن و عشق و حزن نامرادی اور مایوسی کے پردہ میں چھپ گئے جو سالہا سال کے بعد حسن کے نصیب جاگے۔ کانِ ملاحت کا پتہ رحمتِ الٰہی نے چپکے سے بتا دیا۔ حسن اگلی طرح کانِ ملاحت کی جستجو میں تنہا جانا چاہتا تھا جو عشق و حزن یہ کہتے ہوئے حسن کے ساتھ ہوئے؎

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا مے روی

حسن اور اس کے ساتھ عشق و حزن شہر فاران کے اندر حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کے دولت خانہ میں داخل ہوئے اور کانِ ملاحت کو شانِ بے مثالی کے ساتھ بی بی آمنہ کی اچھوتی کوکھ میں جلوہ گر پایا۔ کانِ ملاحت کی تجلی نے اِن تینوں کے ہوش اڑا دئے اور انکے منہ سے سوائے اِس کے اور کچھ نہ نکلا ؎

نہ آخر رحمۃ للعالمینی ز محروماں چرا غافل نشینی

کانِ ملاحت نے مسکرا کر جواب دیا۔ کیوں گھبراتی ہو؟ تمام عالم کو میرا انتظار ہے اور میں تمہارا منتظر ہوں۔ جلد آگے بڑھو اور میری رکاب سعادت تھام کر میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ ربیع الاول کی ۱۲ ویں تاریخ دوشنبہ کے دن یا دسویں اپریل ۵۷۱ء مسیحی کو کانِ ملاحت نے مع حُسن و عشق و حزن کے اِس جہان میں رونق بخشی۔ کانِ ملاحت کا مسلمانوں کے دفتر میں نامِ پاک محمدؐ عربی ہے۔ اسی ملاحت کے اعتبار سے آپ فرمایا کرتے تھے۔ انا املح واخی یوسف اصبح جب کبھی آپ کا حسنِ لازوال موجیں مارتا تھا تو بے اختیار منہ سے نکل جاتا تھا من رانی فقد رای الحق اور کبھی عشق آپ کو پیچ و تاب میں ڈالتا تھا تو حضرتِ جبرئیل کو حکم ہوتا کہ دحیہ کلبی بن کر جاؤ اور ہمارے حبیب کو فاوحی الی عبدہ ما اوحی سنا کر دل بہلاؤ اور جب حزن و ملال آپ پر طاری ہوتا تو آپ ارشاد فرماتے تھے ارحنا یا بلال۔ الغرض اس ذات پاک کے اوصاف کی یہ ایک تمہید ہے جو فراق کے قلم شکستہ رقم سے نکلتی۔ ورنہ اصل مضمون کی سمائی تو آسمان زمین کے دفتر میں بھی نہیں ہو سکتی فقط

سید ناصر نذیر فراق دہلوی از بلند شہر

افسانہ

(خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا)

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ بالکل نئی سرزمین کی ہوا کھا رہا ہوں- یہ ایک چھوٹا سا ٹاپو ہے جس کے چاروں طرف دور دور تک نیلگوں سمندر پھیلا ہوا ہے اس جزیرے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے سرسبز پہاڑ ہیں- جن میں سے برابر چشمے جاری ہیں- دامن میں ہری بھری خوشنما کھیتیاں لہلہاتی ہیں- پہاڑوں پر علاوہ دیودار چیڑ اور اخروٹ وغیرہ قسم قسم کے میوہ جات کے نایاب درخت ہیں اور بے شمار نازک اندام پودے رنگ برنگ کے پھولوں اور پھلوں سے مرصع اور مطلا پہاڑوں کی چوٹیوں سے لے کر ابر نیساں کی طرح چھائے ہوئے ہیں -گویا اس صانع لطیف نے خود اپنے ہاتھوں سے اس سرزمین کی باغبانی کی ہے- اور خاص اسکی نگرانی میں یہاں کے درختوں کی پرورش ہوئی ہے- ہری ہری گھاس میں سرخ و سپید سرمئی و گلابی زرد و نیلے - غرض طرح طرح کے خوشرنگ پھولوں کے تختوں کے تختے بچھے ہوئے نظر آتے ہیں اور جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سبز مخمل پر کسی استاد کاریگر نے نہایت صنعت سے دل فریب بوٹے بنائے ہیں-

صبح کا وقت ہے میں چھڑی ہاتھ میں لئے دامن کوہ میں ٹہل رہا

ہوں اور جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں ایک نرالا عالم پاتا ہوں - کچھ صبح کا سہانا وقت اور کچھ یہاں کا دل فریب منظر دل میں چٹکیاں لے رہا ہے - اور بس یہی دل چاہتا ہے کہ میں بھی درخت بن کر ان درختوں کی جماعت میں کھڑا ہو جاؤں اور اپنے صانع حقیقی کی یاد میں مصروف رہوں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پہاڑ کی چوٹی پر دوربین ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاؤں اور چہار دانگِ عالم کا تماشہ دیکھوں - غرض طرح طرح کے ولولے دل میں اُٹھتے ہیں - اور خیالات کا ہجوم میرے دل پر چھایا ہوا ہے - یہاں کی ہر ایک چیز میں ایک نئی ادا اور نرالا بانکپن نکلتا ہے - درخت اور درختوں کے میوہ جات کچھ اس قسم کے ہیں - کہ میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے - پہاڑ کا پتھر بھی سرخ سیاہ یا مٹیالی رنگت کا نہیں ہے - بلکہ نہایت سفید اور چمک دار پتھر ہے جس سے سمجھنے والے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہاں کی زمین بالکل پاک صاف اور ستھری ہے آبشار اور چشموں کا منظر بھی قابل دید ہے - چشموں کا پانی رنگ برنگ کے خوشبودار پھولوں اور گاہے سبز پودوں سے ہم آغوش ہوتا ہوا گرتا پڑتا - رکتا - تھمتا بڑے مزے سے سطح زمین پر پہونچتا ہے - کہیں کہیں شوخ بادِ صبا اس کے دامن کو چاک کر دیتی ہے - اور پانی کے قطرے سچے موتیوں کیطرح بکھر کر خوبصورت درختوں پر نچھاور ہوتے ہیں - میں یہ تماشہ دیکھ ہی رہا تھا کہ تقدس مآب حضرت آفتاب کی جن کی تعریف میں عرفی کہتا ہے ؎

دمبدم چوں ماہ نو نورِ رخش افزوں شود
ہر کہ پیشانی نہد بر آستانِ آفتاب

سواری نمودار ہوئی اِس کی کرنوں نے پانی پر ایک ہلکا سنہری رنگ پھیر

دیا اور چشموں کی روپہلی موجیں سونے کی جھالریں معلوم ہونے لگیں مگر سورج کی شعاعوں کا میرے دل پر اُلٹا اثر ہوا کہ میرے تمام جذبات سرد ہو گئے اور یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کسی اور خطہ کی سیر کیجئے۔ یہاں سے ذرا چلا ہی تھا کہ دور سے آدمیوں کا ایک گروہ آتا ہوا نظر پڑا۔ آگے بڑھکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بہت سی عورتوں کی ایک جماعت ہے جو عجیب غریب آلات ہاتھ میں لئے پہاڑ کے رخ پر بڑی تیزی سے باقاعدہ قدم اُٹھائے آرہی ہے۔ میں اس غیر معمولی منظر کو دیکھ کر متحیر ہوا اور ایک درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ عورتیں میرے قریب آگئیں۔ اور اب میرا تعجب اور بھی بڑھنے لگا کیونکہ وہ نہایت قوی الجثہ اور تنومند عورتیں تھیں۔ اور سب کی سب ایک ہی قسم کے لباس۔ ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے اُن سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہی ہو؟ میرا سوال قدرتاً اردو میں تھا۔ لیکن ان میں سے ایک عورت نے جو شکل وشباہت میں ان سب میں ممتاز تھی۔ مجھ سے فارسی میں دریافت کیا۔ کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ اب میں نے اپنا مطلب فارسی میں بیان کیا۔ اس پر اُس نے یہ جواب دیا۔

عورت۔ ہم شہر چیتاں کے رہنے والے ہیں اور پاس کے گاؤں میں کام کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔

میں۔ کیا یہاں مرد نہیں ہیں جو تم عورتیں ایسے سخت کام کرتی ہو؟

عورت (خوب ہنسکر) یہاں یہی دستور ہے۔ یہ کام تو کچھ بھی نہیں۔

ہماری فوج بھی عورتوں ہی کی ہے اور ہمارے تمام کاروبار عورتوں ہی کے ہاتھ میں ہیں۔

میں۔ ایں! کیا واقعی؟

عورت (اور بھی زیادہ کھل کھلا کر) میاں اجنبی! یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور بالکل سچ ہے؟

میں۔ اچھا۔ تو وہ شہر جیستاں کون سا ہے؟ میں نے تو کبھی اسکا نام بھی نہیں سنا۔

عورت۔ شہر جیستاں یہاں سے بہت قریب ہے۔ صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے (اور انگلی اُٹھا کر) دیکھو وہ نظر آتا ہے۔ اس شہر کی حالت تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو جائے گی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں کیونکر اور کب کے آئے ہوئے ہو کہ تمہیں یہاں کے دارالخلافہ کے نام سے بھی واقفیت نہیں۔

میں۔ مجھے یہ خبر نہیں کہ میں کس طرح آیا ہوں۔ لیکن ابھی گھڑی دو گھڑی گذری یہاں آکر پہونچا ہوں۔ تم اسقدر بتا دو کہ تم کس چیز کی کانوں میں کام کرتی ہو۔ اور میں شہر میں جا کر کہاں ٹھیر سکتا ہوں۔

عورت۔ ہم جواہرات کی کانوں میں کام کرنے کو جا رہی ہیں۔ اور ہمارے بعد ایک دوسری جماعت آئے گی وہ سونے اور چاندی کی کانوں میں کام کرے گی۔ یہاں معدنیات بکثرت ہیں اور ہمارے شہر کا آٹھواں حصہ معدنیات نکالنے کا کام کرتا ہے۔ تمہیں شہر میں جا کر ٹھہرنے کی کچھ دقت نہیں ہوگی۔ سرکاری ہوٹل پوچھ لینا اور وہاں بے تکلف ٹھیر جانا۔

میں۔ اچھا تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عورت۔ براہِ مہربانی اب ہمیں جانے دو اب ہمارے کام میں ہرج ہوتا ہے یہ کہہ کر وہ عورت بھاگی اور اُس کے ساتھ سب عورتیں دوڑنے لگیں۔ اور مجھے یہ خیال آیا کہ جو وقت انھوں نے مجھ سے گفتگو کرنے میں صرف کیا ہے وہ اِسے پورا کرنا چاہتی ہیں"

میں بحرِ تحیر میں غوطہ لگاتا اور آغوشِ فکر میں لپٹا ہوا شہر کی طرف چلا۔ ذرا آگے بڑھا ہی تھا۔ کہ ایک دوسری جماعت دوسری قسم کی وردی میں اور اِس کی تھوڑی دیر بعد ایک تیسرا گروہ بالکل جداگانہ لباس میں نمودار ہوا۔ یہ بھی سب کی سب توانا اور خوشرو عورتیں تھیں۔ اور اپنے خیال میں محو پرے باندھے ہوئے سیدھی چلی جارہی تھیں۔ انھوں نے میری طرف دیکھا مگر اُن میں سے کوئی مخاطب نہ ہوئی۔ میں بھی ناک کی سیدھ میں مُنہ اُٹھائے چلا گیا۔

پہاڑ سے شہر تک ابر رڑ کی سڑک بچھی ہوئی تھی۔ دورویہ سرو و تاڑ کے درخت نصب تھے۔ اور ہری ہری کھیتیاں اپنا لطف دکھا رہی تھیں۔ شہر کے قریب بکثرت باغات نظر آئے۔ میں نے کہا کہ لگے ہاتھ ان کی بھی سیر کرلوں۔ باغات کے نظارے سے جو اثر میرے دل پر ہوا۔ اُس کا اظہار مشکل ہے۔ میرا تعجب گھڑی بہ گھڑی بڑھ رہا تھا۔ اور بے اختیار یہ شعر زبان پر جاری تھا ؎

اگر فردوس بر روے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

باغ بڑے نہیں تھے۔ مگر ان میں یہ نعمت موجود تھی۔ شفتالو کا باغ، م

اور بابل کے معلق باغات ان کے آگے گرد تھے۔ اور الف لیلہ کے مفروضہ باغات کی تو کچھ ہستی نہ تھی۔ انکے پھولوں کے سامنے ایک گل بکاولی کیا ہزار گل بکاولی ماند تھی۔ اور یہاں کی نہریں جنت کی سلسبیل کا نمونہ تھیں۔ انواع انواع کے میوہ دار درخت طرح طرح بوٹا سے بوٹے اپنی ٹولیاں بنائے اور ایک قطار میں قرینے سے کھڑے نسیم صبح کے خلاف سرگوشیاں کر رہے تھے ادھر باد صبا انکے پھل پھولوں سے اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ اور ان کی بھینی بھینی خوشبو سے تمام باغ مہک رہا تھا۔ نیلی پیلی سرخ و سپید۔ سبز و کاہی سرمئی و کاسنی۔ گلابی و اگرئی اودی و فاختئی آبی و زمردی۔ و فاختئی و آبی و زمردی۔ پچ رنگی و ترنگی۔ الغرض طرح طرح کے خوش الحان پرندے اپنے اپنے راگ گا رہے تھے۔ کوئی بانسری بجاتا تھا۔ تو کسی میں سے سارنگی کی آواز نکلتی تھی۔ کوئی ہارمونیم کی تان توڑ رہا تھا۔ کوئی سیٹی بجاتا تھا۔ تو کوئی گریموفون بنا ہوا تھا۔ کہیں سے ہزار داستانی کی آوازیں چلی آرہی تھیں۔ اور کوئی حق سرہ کے نعرے لگا رہا تھا۔ اور گو سورج کی کرنیں نمودار ہو گئیں تھیں۔ اور اب ان گوناگون پرندوں کی مجلسوں کے درہم برہم ہو جانے کا وقت آگیا تھا مگر یہ اپنے خیال میں مست اپنی اپنی بولیوں میں خدائے بیچون کی مدح میں چوں چوں کر رہے تھے۔ اور میں دیوانہ وار ہر ایک چیز کا مشاہدہ کرتا پھرتا تھا اور غالب کا یہ شعر بار بار پڑھتا تھا۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہر پھول اور پنکھڑی نئی وضع کی معلوم ہوتی تھی مگر ع

آشنایاں اپنا بھی اک سبزۂ بیگانہ تھا

درختوں کی آرائش کا کیا بیان کروں محمد شاہ رنگیلے اور اگلے وقتوں کے خلیفہ ہارون الرشید کو بھی یہ طیاریاں میسر نہ ہونگی۔ درختوں کے تنوں اور شاخ شاخ اور ڈالی ڈالی پر زری و زربفت کے تھان لپٹے ہوئے تھے۔ اور چاندی کے گملے نہروں کے کنارے کنارے رکھے تھے۔ جنکی سنگ مرمر کی شفاف روشوں پر نگاہ پھسلتی تھی۔ چاندی کے چھوٹے چھوٹے حوضوں میں سونے کے فوارے چل رہے تھے۔ اور حوضوں کے گرداگرد سبز سبز گھاس پر سرخ پھول ایسے معلوم ہوتے تھے۔ کہ گویا لال چنیاں جڑی ہوئی ہیں۔ یا کسی نازنین نے اپنے خوشنما ہاتھوں سے سبزے پر گلکاری کی ہے میں اپنے خیالات میں غرق اور اپنی قسمت پر فخر کرتا ہوا چہل قدمی کر رہا تھا کہ دفعتہً میری نظر ان عورتوں پر پڑی جو باغ بوقلموں کی درستی میں نہایت خوشی سے مصروف تھیں۔ اور مجھے اب کامل یقین ہو گیا کہ دراصل یہاں عورتوں ہی کا راج پاٹ ہے۔ لیکن مزید کیفیت اور بیچارے مردوں کی حالت دریافت کرنے کے لئے باغ میں سے نکل کر جلدی سے شہر کا راستہ لیا۔ یہاں سے شہر بہت قریب تھا آناً فاناً میں وہاں داخل ہو گیا۔

شہر بالکل نئی طرز کا تھا۔ بڑی چوڑی چوڑی سڑکیں خالص بلور کی تھیں۔ اور تمام دکانیں ایک ہی ساخت کی ایسی خوشنما بنی ہوئی تھیں کہ گویا کاغذ کی تراشی گئی تھیں۔ چمک دار سنگ مرمر اور پچی کاری کے کام پر چاندی کے کیواڑ عجب زیب دے رہے تھے۔ اور سونے کے بورڈ نکلنے والی سورج کی کرنوں سے چمک کر ایسے جگمگا رہے تھے کہ ان پر

پرنگاہ نہیں ٹھیرتی تھی۔ دوکانوں کے اندر چاندی کی کرسیاں اور میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ اور شیشہ دار چاندی کی الماریوں میں تمام اشیائے ضرورت قرینے سے رکھی تھیں۔ مگر دوکان کی ملازمین جو تمام عورتیں تھیں۔ نہایت سیدھے سادے لیکن ستھرے لباس پہنے ہوئے قاعدے سے کھڑی تھیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہاں سب دکانیں سرکاری ہیں۔ اور ہر ایک شخص کو ضرورت کے مطابق مفت چیزیں مل سکتی ہیں۔ میں مجنوں کی طرح اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔ مگر سب اپنے اپنے کاروبار میں اس قدر مصروف تھے کہ کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا تھا۔ اور اب حقیقت میں میری حیرت دیوانہ پن تک پہنچ گئی تھی۔ بازار میں کہیں کہیں برقع پوش بھی نظر آئے۔ میں جھپٹ کر اُن کے پاس پہنچا۔ اور اُن میں سے ایک سے دریافت کیا کہ یہاں کی عورتیں تو کھلے منہ پھرتی ہیں۔ اور مردوں کے سے کام کرتی ہیں۔ تم کیسی عورتیں ہو جو نقاب ڈالے پھرتی ہو۔ اُس نے مجھے اجنبی گنوار سمجھ کر بیاڑ سا منہ کھول دیا مگر میری امید کے خلاف یہ منہ کسی مہ جبین عورت کا نہ تھا، بلکہ ایک زرد و بیمار شکل ڈاڑھی والے مرد کا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر پہلے تو میں ذرا ڈرا مگر پھر ہمت باندھ کر پوچھا۔

میں۔ اے شخص! تو کون ہے جو اس طرح منہ چھپائے پھرتا ہے؟ کیا تو کوئی مجرم ہے؟

یہ سنکر وہ سب کے سب زنانے مرد اپنی موٹی موٹی آوازوں سے قہقہہ لگانے لگے۔

میں (نہایت اضطراب سے) خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی۔ یہ ماجرا

کیا ہے ؟ اور تم انسان صورت غول بیابانی ہو یا واقعی انسان ہو ؟

ایک مرد۔ ہم تمہاری طرح انسان ہیں اور ہمیں بڑی حیرت ہے کہ تم کس جنس کے آدمی ہو۔ تم عورت تو ہو نہیں سکتے کہ تمہاری مسیں بھیگ رہی ہیں مگر تم مرد بھی نہیں کہ ڈاڑھی نہیں رکھتے۔ اور کھلے عزا نے پھرتے ہو۔

میں۔ کیا۔ . . . . کیا . . . . تم نے کیا بات کہی ؟

دوسرا مرد۔ سچ تو ہے۔ تم ہو کون ؟

میں۔ کیا خوب ! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ارے ! یہاں کوئی پولیس اور تھانہ بھی ہے ؟

تیسرا مرد (ہنسکر) آؤ۔ میں تمہیں تھانہ کا راستہ بتا دوں۔ مگر دیو ہے یا پری ہے تو ؟ سچ تو بتا۔ تو کون ہے ؟

میں۔ خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کرو اور یہ بتا دو کہ تم کون ہو۔ ؟

پہلا مرد۔ معلوم ہوتا ہے۔ تم اس کوچہ سے بالکل ناواقف ہو۔ ہے نا ؟

میں۔ بھئی ! میں تو آج ہی آیا ہوں۔

مرد۔ تم کہاں کے باشندے ہو ؟

میں۔ ہندوستان اور ہندوستان میں بھی دلی شہر کا۔

مرد۔ دلی کا نام تو ہم نے بھی سنا ہے۔ وہی نا۔ شاہجہان آباد ؟

میں (متعجب ہوکر) جی ! ہاں ! وہی ! میں نے تو آپ کے ملک و شہر کا نام بھی نہیں سنا آپ کیونکر میرے شہر سے واقف ہوگئے ؟

مرد۔ تعلیم سے۔ ترقی سے۔ بحری سفر سے۔ تجارت سے۔ ہم تو گھر کے بیٹھنے والے مرد ہیں۔ ہماری عورتیں تو تمہارے ہاں کے گلی گلی کوچہ کوچہ سے واقف ہیں۔

میں۔ اچھا پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟

مرد۔ ہمارے ہاں اپنا نام بتانا تو منع ہے۔ کہو تو اپنے میاں عورت کا نام بتادوں؟

میں۔ خدا کے لئے میں کسیکا نام نہیں پوچھتا۔ تم اتنا تو کہہ دو کہ تم برقعہ پوش کیوں ہو؟

مرد۔ ہمارے ہاں کا قاعدہ ہی یہ ہے۔ یہ تو میں نے تمہیں اجنبی سمجھ کر بات چیت کرلی۔ ورنہ اپنے میاں کے بغیر اجازت ہم کسی شخص سے جو ہماری جنس کا نہ ہو بات چیت نہیں کرسکتے۔

میں۔ ایں! تو کیا میں عورت ہوں؟

مرد۔ تمہاری شکل سے تو تم نہ مرد معلوم ہوتے ہو نہ عورت۔ پھر مجھے کیا خبر کہ تم کون ہو؟

میں (زور از وٹھ کر) بس جی بس! تم نے مجھے گنوار سمجھتے ہو۔

مرد۔ تم ذرا اپنی زبان تو سنبھالو تم تو ہمیں اسطرح مخاطب کرتے ہو کہ گویا ہم عورتیں ہیں۔

میں۔ تو کیا تمہارے ہاں مرد ڈاڑھی مونچھوں سمیت ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں؟

مرد۔ تم کس قسم کی باتیں بناتے ہو؟ ماں کے پیٹ میں یا باپ کے؟

میں (ذرا سوچکر) اچھا باپ ہی کے سے سہی۔

مرد - ہمارے ہاں نوجوان لڑکوں کی مسوں کے ساتھ سبزہ بھی آغاز ہو جاتا ہے - تمہارے تو سبزہ کا آغاز بھی نہیں اور تمہاری مونچھیں نکلتی جاتی ہیں -

میں - ہمارے ہاں آج کل کے رواج کے مطابق نئے تعلیم یافتہ لوگ ڈاڑھیاں منڈواتے ہیں -

مرد - اور مونچھیں کیوں نہیں منڈواتے کہ ہمارے ہاں کی عورتوں کی پوری نقل ہو جائے - مگر معاف کرنا تمہارے ہاں تو تعلیم کم معلوم ہوتی ہے - تم سے تو ہمارے ہاں کے گھر کے بیٹھنے والے مرد اچھے پڑھے لکھے ہونگے -

میں - کیا - فرمایا ؛ جی ؟ میں گریجوئیٹ ہوں اور میں نے علی گڈھ کے مشہور و معروف کالج میں تعلیم پائی ہے -

مرد - کالج علیگڈھ کی تعریف تو بے شک ہم نے بھی بہت کچھ سنی ہے - مگر اب تو خدا کے فضل سے ہمارے ہاں کے چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کے لڑکے گریجوئیٹ ہونے لگے اور ہمارے ہاں کی عورتیں جن کی تم نقل کرتے ہو - عموماً ایسے لائق فائق ہوتے ہیں کہ پوسٹ گریجوئیٹ (گریجوئیٹ شدہ) ان سے تعلیم پاتے ہیں -

میں - اچھا - تو تم مجھے کسی تعلیم یافتہ عورت سے ملوا دو

مرد - آؤ میں تمہاری اپنے میاں ہی سے ملاقات کرا دوں - لو آؤ بوا !

وہ تینوں چاروں نقاب پوش مرد میرے ساتھ ہو لئے - تھوڑی دور چل کر ایک گلی کے قریب پہونچے - یہ گلی ایسی گلی نہیں تھی - جیسی ہمارے

اں کی ہوتی ہیں۔ جے پور کے چوپڑ کے بازار کی سڑک اُس کی فراخی کے آگے مات تھی۔ گلی میں بلور کا فرش تھا۔ اور مطلق کہیں میل کچیل کا نام تک نظر نہ آتا تھا۔ اس گلی میں سرے ہی پر ان مرو بیگم صاحبہ کا مکان تھا اندر گئیں۔ (یا ہماری بولی میں یہ صاحب گئے) پھاٹک کھلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ چھوٹا سا باغیچہ لگا ہوا ہے۔ چاندی سونے کے گملے رکھے ہوئے ہیں۔ اندر کمرے میں پُر تکلف فرش اور فرش پر چاند سونے کی کرسیاں کمخواب میں لپٹی ہوئی رکھی ہیں اور سونے کی جڑاؤ آرام کرسی پر ایک پری پیکر نازنین خاتون بڑی موٹی کتاب ہاتھ میں لیے مستغرق بیٹھی ہیں۔ میرے آنے کی اطلاع پاتے ہی سروقد کھڑی ہو گئیں۔ اُنکے چہرے سے علاوہ رعب حسن و جلالِ امارت کے علم و فضل ٹپک رہا تھا۔ مجھ سے بڑے خلق سے پیش آئیں۔ تھوڑی دیر تک شوقیہ گفتگو ہوتی رہی۔ اسکے بعد بیگم صاحبہ تو یہ کہہ کر کہ میں اپنے کام کو جاتی ہوں معاف کرنا رخصت ہو گئیں۔ اور میں نے میاں خاتون سے مختلف سوالات شروع کئے۔

میں۔ آپ کے شہر میں کتنی آبادی ہے؟ اور اس جزیرے کا نام کیا ہے؟

خاتون۔ شہر کی آبادی بیس ہزار آدمیوں کی۔ یہ شہر سب میں بڑا ہے۔ اوروں کی آبادی دس دس ہزار نفوس سے زیادہ کی نہیں ہے۔ اور اس جزیرہ کا نام "افسانہ" ہے۔

میں۔ آپ کے ہاں یہ کیسی انوکھی رسم ہے کہ عورتیں باہر پھرتی ہیں اور مرد برقع پوش ہیں۔

خاتون۔ میرے خیال میں آپ کے یہاں کا رواج الٹا ہے۔ کہ مرد کھلے بندوں باہر پھرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آپ سے ذرا کم عمر کے لڑکے تو بے روک ٹوک باہر جاتے ہیں مگر آپ کی عمر میں پردہ لازمی ہو جاتا ہے۔

میں۔ آپ کے دستور کی کیا وجہ ہے؟

خاتون: جناب! کیا میں آپ سے آپ کے ہاں کے دستور کی کوئی معقول دلیل سن سکتا ہوں؟

میں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی فلسفیانہ دلیل اس کی تائید میں پیش نہیں کر سکتا۔

خاتون۔ تو آپ مجھ سے ہمارے ہاں کے دستور کی وجہ کیوں دریافت فرماتے ہیں۔ جس کے لئے اس کی نہیں۔ آپ کے ہاں مرد قابو یافتہ ہو گئے۔ مردوں نے ملک فتح کیے۔ مردوں نے قانون بنائے۔ یہاں عورتوں کا داؤ چل گیا۔ لیکن اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ مردوں کے جائز حقوق دیں ان میں تعلیم کی روشنی اچھی طرح ڈالیں۔ انہیں میونسپلٹی کی ممبری کے واسطے انتخاب کیا کریں۔ اور رفتہ رفتہ حکومت میں مردوں کی کافی تعداد شامل کرلیں۔

میں (تعجب سے) میں آپ کے طریقہ کی وجہ؟ اس لئے دریافت کرتا ہوں کہ یہ ہمارے ہاں رائج نہیں ہے۔

خاتون۔ آپ کے ہاں کی رسم ہمارے لئے آیت و حدیث نہیں ہو سکتی آپ سے عرض کیا نا۔ ہر ملکے و ہر رسمے۔

میں۔ اچھا اس بحث کو بالفعل جانے دیجئے۔ مگر یہ فرمائیے کہ آپ کے کل جزیرے کی قانون۔ میونسپل۔ اصول گورنمنٹ تو اپنی تجارت و جنگ

بجری و بری طرزِ تعلیم وغیرہ کا لب لباب کیا ہے؟ ۔ آپ کے مذہب کے متعلق کوئی سوال کرنا واخل بے تمیزی ہے ۔ مگر آپ کے اخلاق حسنہ سے امید ہے کہ آپ میری واقف کاری کے لئے براہِ نوازش اس مضمون پر بھی کچھ روشنی ڈالینگے میں اس تکلیف دہی اور سمع خراشی کی نہایت ادب سے معافی چاہتا ہوں اور یقین ہے کہ آپ کی تقریر سے ضرور مستفیض ہونگا ۔ یہ کلام سنکر اس نیک خاتون نے جو ماہرِ علم تاریخ و فلسفہ ۔ ریاضی دان ۔ عالم علم ہیئت و جغرافیہ و مشہور بیرسٹر اور "فنون" یونیورسٹی میں مصر کالج کی ہفت زبان پروفیسر تھی ۔ اس طرح اپنی تقریر شروع کی (باقی دارد)

محمد صبیح الدین دہلوی بی ۔ اے

بابا گورو نانک

(از خواجہ دل محمد ایم اے - ایم آر - ایس اے (لندن) پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

سمبت ۱۵۲۶ میں بساکھ کے مہینے چاندنی رات پچھلی گھڑی بابا نانک پیدا ہوئے - ۳۳ کروڑ دیوتا آداب بجالائے - ۶۴ جوگنیاں - ۵۲ سورما - ۹ سنت - ۸۴ سدھ اور ۹ ناتھوں نے سر تسلیم خم کیا - کیونکہ ایک عظیم الشان دیوتا دنیا کو بچانے کے لئے آیا ہے - آپکے سامنے سبکو سر جھکانا چاہئے -

یہ الفاظ ہیں جن کے ساتھ بابا نانک کی جنم ساکھی یعنی مقدس سوانحعمری شروع ہوتی ہے بابا صاحب کا والد کالو کھتری موضع تلونڈی ضلع لاہور کا باشندہ تھا اور اناج کی تجارت کیا کرتا تھا -

کسی ریفارمر کے مشن کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ملک کی اسوقت کی حالت کو دیکھنا ضروری ہے - جس وقت وہ ریفارمر دنیا میں آئے - ہندوؤں کا مذہب اور فلسفہ جو معراج تحقیق و تخیل کا اعلےٰ ترین زینہ تھا - اور جس میں کنہ حقیقت تک پہنچنے کے لئے انسان نے گویا آسمانی مدد سے کام لے کر سے بلیغ سے کام لیا تھا - پندرھویں صدی میں اس کی یہ کیفیت تھی کہ برہمن لوگ اپنے مٹکے بھرنے کے لئے اسپر ایسا ملمع صدیوں تک چڑھا چکے تھے کہ سونا پیتل نظر آنے لگا - جات پات کے اصول نے گو ہندوؤں کے چار شیرازے باندھ دیئے تھے مگر مساوات انسانی کے دیوان کو پریشان کر دیا تھا - سنسکرت کا شلوک کسی شودر کے کان میں پڑ جانا ایسا گناہ کبیرہ تھا کہ جس کی سزا اس بیچارے کے دونو کانوں میں پگھلا ہوا سکہ ڈال کر اس کو

عالم اصوات بلکہ عالم حیات سے بدر کرنے سے کم نہ تھی۔ دو ہندو مل کر کھا بھی نہ سکتے تھے۔ جس جات میں کوئی پیدا ہوا۔ اُسی میں رہا۔ ہمت اور اچھا دونو کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ اس توحید اور سچی توحید کا سبق جسکی جھلک بھگود گیتا اور دیگر مقدس کتب میں ملتی ہے ہندوؤں کو فراموش ہو چکا تھا۔ زمین کے چپہ چپہ پر دیوتاؤں کا استھان تھا۔ اور ایک پرمیشور کی بجائے ۳۳ کروڑ دیوتا پوجے جاتے تھے۔

اِدھر بہادر اور شیر دل افغان اللہ اکبر کے نعرے لگاتے بتوں کو توڑتے ہندوستان میں آبراجے تھے اور خاندان لودی کا تسلط تھا۔ گویہ لوگ موحد تھے اور ایک خدائے لاشریک کو مانتے تھے اور انکے مذہب نے انہیں یہی سکھایا تھا کہ کل مومن اخوۃ سب سلمان بھائی بھائی ہیں۔ مگر ذاتیات کی وجہ سے یہاں بھی ہفتاد و دو ملت کا جھگڑا تھا۔ گورونانک نے ایسے وقت میں جنم لیا اور چونکہ طبیعت نہایت چھوٹی عمر ہی سے حقائق اشیا پر غور و خوض کرنے کی عادی تھی گورو صاحب نے تفرقہ ہائے مذاہب و ملل کے اس طوفانِ بدتمیزی کو جو انکو اپنے گرد و پیش نظر آیا انسانی طمانیتِ قلب اور نجات کے لئے بمنزلہ گرداب سمجھا اور شروع ہی سے بوجہ ہمدردی بنی نوع ان کو اس بھنور سے نکالنے کی فکر ہوئی۔ بھائی گوروداس اس وقت کی حالت یوں بیان کرتے ہیں اگر ہندوؤں کی چار جاتی تھیں تو مسلمانوں کے بھی چار مذہب تھے۔ خود پسندی غرور اور بے سود جھگڑے ان میں پڑے ہوئے۔ دونوں نے وید اور قرآن کو بھلا رکھا تھا۔ یہ رام کو یاد کرتے وہ رحیم کو۔ نام وہی تھے لیکن ایک دوسرے کی مخالف راہ پر چلتے تھے۔ حق کو برطرف رکھ کر برہمن اور ملا بے فائدہ انجمن میں پڑے ہوئے تھے۔"

ہندوستان میں اس وقت انقلاب عظیم ہو رہا تھا ہندوؤں کے سیاہ خانۂ مذہب میں توحید کی نورانی شعاعیں پڑ رہی تھیں اور اس لئے بعض فلسفی اور مصلح طبائع میں نئے مذہبی ولولے اور جوش پیدا ہو رہے تھے۔ مشرق میں چیتن نے لوگوں کو شکتی اور کالی کے مذہب کی طرف لانا شروع کیا اور راما نند کبیر تلسی داس سور داس جے دیو اور روی داس نے اپنے اپنے طریقوں پر روحانیت کے سبق پڑھانے شروع کئے۔ ادھر پنجاب میں ہمارے گورو نانک اوائل عمر سے ایک پاک اور بے لوث زندگی گذارتے ہوئے انسان کی نجات مالک کی توحید اور سچی توحید کو سمجھنے اور نیک اعمال کے ذریعے حاصل کرنے کا سبق دینے کی فکر میں ہوئے۔

بچپن ہی سے گورو نانک کی طبیعت ایسی حقیقت بیں واقع ہوئی تھی کہ ذرا ذرا سی بات میں اپنی طبیعت کے اصلی جوہر دکھاتے تھے جب پہلے پہل استاد سے پڑھنا شروع کیا تو خود اسی کے منبع علم کا امتحان لینا شروع کیا اور جب وہ پورا نہ اترا پھر اُسے یوں سبق پڑھایا۔

جال موہ گھس مس کر۔ مت کاگت کر سار
بھاؤ قلم کر چیت لکھاری۔ گر پچھ لکھ بچار
لکھ نام ثنا ے لکھ۔ لکھ انت نہ پار اور ار
بابا یہ لیکھا لکھ جان۔ جت لیکھے تن پڑے
تھئے ہووے سچا نسان۔

عشق کو جلا کر گھس اور روشنائی بنا۔ قلب کا صاف کاغذ لے
وفا کی قلم کے ساتھ دل سے وہ کچھ لکھا جو مرشد برحق کہے
خدا کا نام اور اس کی ثنا لکھ۔ کہ وہ ازل سے ابد تک ہے

بابا یہ لکھنا سیکھ۔ جب جسم نوشتوں کی سزا پائے گا تو اصلی نشان یہی ہوگا۔
باپ نے چار پانچ دفعہ کوشش کی کہ بیٹا کسی کار روزگار کی طرف رجوع
کرے مگر کہاں یہاں تو ایک ہی دھن تھی بیس روپے دئے کہ جاؤ کوئی ''کھرا
سودا'' کر آؤ۔ یہ کھتری باپ کی پہلی کوشش تھی کہ بیٹا بنج بیوپار کرے۔ آپ نے
سادھووں کے ایک گروہ کو جو راستے میں ملا بھوجن کروا دیا انکے نزدیک یہی
سب سے کھرا سودا تھا۔ غرض ایسی حرکات کی وجہ سے باپ بیزار رہنے لگا۔
آپ سلطان پور میں اپنی ہمشیرہ کے پاس چلے گئے اور بہنوئی کی وساطت
سے نواب دولت خاں لودھی کے مودی خانہ میں ملازم ہوگئے۔ استغراق
کا یہ عالم تھا کہ ایک دن اناج کا وزن کرتے ہوئے پنسیری کی دھارن تول
رہے تھے کہ تیرہ پر پہنچے۔ اور یک لخت تیرہ سے خدا کے دھیان میں تیرا تیرا
کرنا شروع کردیا اور ہر دھارن کو تیرہ تیرہ ہی گنتے گئے جو کچھ تھے فقرا میں
تقسیم کر دیتے کئی دفعہ نواب نے احتیاطاً حساب کی پڑتال کروائی۔ لیکن
نانک کے ہی کئی سو روپے دینے نکلے وہیں ایک بی بی سلکھنی سے آپ
کی شادی ہوئی اور اُس کے بطن سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ لڑکے کے
پیدا ہونے پر انکے گھر میں وہی سوتک کا مسئلہ عورتوں نے جگایا اور
پنڈت جی تشریف لائے گورو صاحب نے اُس کے ساتھ اس کی جہالت
اور سوتک کے بے معنے ہونے کے متعلق گفتگو کی۔ پنڈت جی بولے شاستروں
میں لکھا ہے سوتک سے گھر کی تمام چیزیں ناپاک ہو جاتی ہیں جب تک
پنڈت جی انہیں شلوک سے پوتر نہ کریں بابا صاحب نے فرمایا کہ اصل سوتک
کو تو تم سمجھے نہیں اِس جھوٹے سوتک کے پیچھے پڑے ہو اور اس کو یوں سمجھایا
من کا سوتک لوبھ ہے - جیھ وا سوتک کوڑ

اکھی سوتک دیکھنا۔ پرتریا - پرتن روپ
کنی سوتک گن پے - لاے تباری کھاتے
نانک ہنسا آدمی - بدھے جم پہ جائے

یعنی دل کا سوتک حرص ہے - زبان کا سوتک جھوٹ بولنا
آنکھ کا سوتک غیر کی عورت حسن اور مال کو دیکھنا
کان کا سوتک جھوٹی باتیں سننا۔ نانک ان بری باتوں سے انسان بندھا ہوا جہنم کو جاتا ہے۔

اسی مثال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ نانک کی طبیعت اُن خرافات اور لایعنی رسوم سے جو ہندوؤں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں کس قدر متنفر تھی اور خدا کی زبردست طاقت کے آگے وہ کیونکر ان سب باتوں کو ہیچ سمجھتا تھا۔

بابا نانک جیسی فقیرانہ طبیعت کا آدمی بھلا مودی خانہ میں کب تک بسر کرتا آخر ایک دن دریا پر اشنان کو گئے اور کئی دن کے لئے جنگل میں گیان دھیان میں مصروف رہے اس عرصے میں انکی طبیعت نے وہ عزم بالجزم قرار دے لیا جس سے وہ اپنے مشن کو پورے طور پر سمجھ گئے اور فوراً واپس آتے ہی اُس کی تعلیم شروع کر دی یہ نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان سب ایک ہیں"۔ اس قسم کے فقرے سنکر عام لوگوں میں ایک شور سا مچ گیا۔ وہ اب سمجھے کہ نانک پاگل ہو گیا ہے انہوں نے مُلا کو تعویذ کے لئے اور حکیم کو مرض کی شناخت کے لئے بلایا۔ ملا تعویذ لکھنے لگے تو بابا صاحب نے فرمایا

کھیتی جن کی اجڑے کھلواڑے کیا تھاؤں
جڑگ تناں کا جیویا جے لکھ لکھ ویچیا ناؤں

یعنی جن کی کھیتی ہی اُجڑ گئی اُنکے لئے خروار میں کیا حصہ ہے
حیف ہے انکی زندگی پر جو خدا کا نام لکھ لکھ کر بیچتے ہیں

پھر جب بابا نانک نے اپنے اصلی خیالات کو ظاہر کیا کہ وہ اگر دیوانہ ہے تو خدا کے لئے اور وہ دیوتاؤں سے بیزار اور ایک خدائے لاشریک کا قائل ہے تو نواب صاحب نے تحریک کی کہ وہ بھی ایک خدا کو مانتے ہیں انہیں انکے ہمراہ مسجد میں چل کر نماز پڑھنا چاہئے۔ چنانچہ مسجد میں گئے اور نواب صاحب اور دیگر لوگوں نے نماز گذاری پھر نانک سے پوچھا کہ انہوں نے نماز کیوں نہ پڑھی جواب میں فرمایا۔

متھا ٹھوکے جمیں پر دل اُٹھے اسمان
گھوڑے کابل کھرید کرے دولت خاں پٹھان

یعنی سر تو سجدہ میں ہے مگر خیال میں گھوڑوں کی خرید ہو رہی ہے۔ نواب صاحب قرار واقعی شرمندہ ہوئے اس کے بعد بابا صاحب نے نہایت بلیغ طریق سے بیان فرمایا کہ دراصل مسلمان ہونا کیا ہے

مسلمان کہاونا ں سکل جا ہووے تا مسلمان کہاوے
اوّل اول دین کر مٹھا سکل مانا مال مساوے
ہووے مسلم دین مہانے مرن جیون کا بھرم چکاوے
رب کی رجائے منناسر اوپر کرتا منے آپ گنواوے
تو نانک سرب جیا مہ رحمت ہووے تا مسلمان کہاوے

مسلمان کہلانا مشکل ہے۔ پہلے قابلیت ہو پھر مسلمان کہلاوے اپنے دین سے محبت کر اور غرور و نخوت مال اسوال چھوڑ فرمانبردار رہو اور نجات پر پورا یقین کر۔ خدا کی رضا مان اور اپنی ہستی کو اس کی ہستی میں دیدے۔ تمام زندہ چیزوں سے محبت کر صرف تب تو مسلمان کہلا سکتا ہے۔

پنج نماجاں وخت پنج - پنجاں پنجے ناؤں
پہلا سچ حلال دوئے تیجی خیر خدا اے
چوتھی نیت راست من پنجویں صفت ثناے
کرنی کلمہ آکھ کے مسلمان سدا اے
نانک جے تے کوڑیا رکوڑا کوڑی پاے

پانچ نمازیں پانچ وقتوں کے لئے ہیں اور اسکے مختلف نام ہیں۔ پہلی نماز سچ کی ہے دوسری حلال کمائی کی تیسری خیرات دینا چوتھی صاف نیت رکھنا۔ پانچویں خدا کی صفت کی ثنا کرنا۔ نیک اعمال تمہارا کلمہ ہونا چاہیے صرف تب تم مسلمان ہو سکتے ہو۔ ورنہ اگر برے ذرائع سے کام لوگے تو اے نانک یاد رکھ جھوٹے کو جھوٹی ہی باتیں ہاتھ لگتی ہیں۔

اس کے بعد باباگورونانک خویش قبیلہ سب چھوڑکر جنگل میں عبادت الہی کے لئے چلے گئے جہاں بالا ہندو اور مردانہ میراثی بھی آپ کے ساتھ عمر بھر کے لئے جا ملے ۳۱ سال کی عمر سے ۱ سال کی عمر تک بلکہ اس سے بھی زیادہ گروجی سیر و سیاحت اور لوگوں کی تعلیم و تلقین کے لئے پھرتے رہے اور سیام و برما تک ادھر لنکا تک اور عرب میں قندھار سے گزر کر غالباً مکہ شریف تک آپ نے سیر فرمائی اور سب جگہ خدا کی توحید اور محبت الہی اور شوق و ذوق حقیقی کا سبق دیتے رہے۔ کروچھیتر۔ ہردوار اور جگن ناتھ میں جاکر بت پرستی کے برخلاف تعلیم دی۔ قندھار میں باباولی قندھاری کے مزار کے نیچے باباگورونانک کے چلہ کاٹنے کی جگہ اب تک مشہور ہے اور وہاں کے لوگ ننانو فقیر ہندی کے اب تک نام لیوا ہیں حسن ابدال میں پنجہ صاحب اور اسیطرح مختلف مقامات پر انکی یادگاریں اب تک موجود ہیں۔

۱۵۳۲ء میں آپ کرتارپور میں جسے انھوں نے خود ہی بسایا آرہے اور یہیں مختلف

ممالک سے لوگ تحصیل فیض کے لئے انکے پاس حاضر ہوئے۔ سلطان روم اور بابر بادشاہ سے بھی آپ کا مکالمہ ہوا بابا گورو نانک کا مشن کیا تھا؟ اور اس میں انہیں کس قدر کامیابی ہوئی؟ اس کے متعلق یہ بیان کرنا ہے۔ کہ درحقیقت بابا صاحب نے توحید الہی کے پھیلانے میں بہت بڑا کام کیا۔ انہوں نے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کی بجائے ایک خالق برحق کی تعلیم ہندوؤں کے سامنے پیش کی

دوجا کاہے سمرئے جمے تے مرجائے
ایک کو سمرو نانکا جو جل تھل رہیا سمائے

بنارس میں پنڈت چتر داس کے ساتھ بت پرستی کے متعلق گورو صاحب نے بڑی بحث کی۔

باہر دیو پکھالی اے جے من لووے کوے
جوٹھ لیے جوں ناجھئے سو کھ بیایہ ہووے

ان پتھر کی مورتوں کو دھونے اور پوجنے سے کیا ہوتا ہے اپنے دل کو دھونا چاہئے تب نجات مل سکتی ہے۔ خدا کی توحید اور اس سے دلی محبت پیدا کرنے کے متعلق گرنتھ صاحب میں نہایت دلکش شلوک ہیں اور واقعی جو سچی محبت خدائے برتر کی ہستی کے متعلق آپ کے دل میں تھی وہ اپنا اثر دکھائے بغیر کیونکر رہ سکتی۔ یہی بابا گورو نانک کا پہلا مشن تھا اور اس میں انہیں بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ دوسرا مشن ان کا اخوت بنی نوع انسان کو قائم کرنا تھا۔ توحید کو پھیلاتے ہوئے انکا روئے سخن اکثر ہندوؤں اور بت پرستوں کی طرف ہوتا تھا یا اُن مسلمانوں کی طرف جو کہ سچی عبادت کا مطلب نہ سمجھ کر توحید اور عبادت حقہ کی کنہ تک نہ پہنچے۔ دوسرے مشن یعنی اخوت بنی نوع کی تعلیم دینے میں بالخصوص ہندوؤں کی ذات پات کے امتیاز کو برا سمجھتے تھے۔

جات جنم نہ پوچھئے سچ گر لیجے بتائے
ساجات ساپات ہے جیسے کرم کمائے

ذات اور جنم کی ضرورت نہیں جاؤ سنتوں سے پوچھو جیسے تیرے اعمال ہونگے ویسی تیری ذات پات ہو گی۔

وہ انسانی مساوات کے قائل تھے اور اس میں بھی ایک طرح مشن وہی تھا جو مسلمانوں کا

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

لیکن مسلمانوں کے بہتا دو دو دل اور فرقہ آرائیاں بھی گورو صاحب کو ناگوار تھیں۔ اور وہ ان کو اصل حقیقت نہ سمجھنے اور الجھیڑے میں پڑ جانے پر مبنی قرار دیتے تھے بزم کا اشتہار دیکھ کر ایک صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ اس کے متعلق آپ کیا رائے دینگے - بابا صاحب ہندو تھے یا مسلمان ؟ میں نے عرض کی کہ اگر بابا نانک خود زندہ ہوتے اور ان سے یہ سوال کیا جاتا تو وہ یوں فرماتے۔

بندۂ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

وہ تو بندۂ عشق تھے انہیں گیروپت کی ضرورت نہ تھی نہ کسی مسلمانی ظاہرداری کی۔ وہ اسلام کی اصل حقیقت یعنی توحید اور اخوت بنی نوع انسان کو دل سے سمجھ چکے تھے۔ مسلمانوں کے کلمۂ طیب کے پہلے نصف حصہ یعنی "نہیں کوئی معبود سوائے خدا کے" اُس کا تو سبق دینا انہوں نے اپنی عمر کا ایک مقصد عظیم بنایا تھا اس پر حضرت محمد صلعم کی رسالت سے بھی منکر نہ تھے بلکہ انکے نام اور کام کو عظمت سے یاد کرتے تھے لیکن ساتھ ہی گوپال ہری رام گوبند اور کرشن کے ناموں سے

بھی انکی کتاب خالی نہیں اور دسویں گرو گوبند سنگھ نے تو درگا کی پرستش اختیار کرکے بہت کچھ ہندوؤں کے مذہب کی طرف رجوع کیا بعض محققانِ یورپ انکو صوفیوں اور یوگیوں کی تعلیم دینے والا سمجھتے ہیں اور درحقیقت انکی تعلیم میں صوفیانہ رنگ بہت کچھ ہے صاحب سیرالمتاخرین کے نزدیک انھوں نے تعلیم ایک مقتدر مسلمان صوفی سے پائی تھی اور اگر اس کو نہ بھی تسلیم کیا جاوے پھر خود جنم ساکھی میں بابا فرید شکر گنج اور مسلمہ طور پر بابا ولی قندھاری اور دیگر مسلمان صوفیاے کرام سے صحبت رکھنے کا ذکر پایا جاتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا صاحب کو تعلیم اسلام سے پوری خبر تھی۔ بنارس میں بھگت کبیر سے بھی آپ کی صحبت رہی۔ غرض ہر پھول سے مٹھاس لیکر بابا صاحب نے اپنا دل پسند شہد تیار کیا مسلمانوں کی توحید اور اخوت بنی نوع انسان کی تعلیم دینا انھوں نے اپنا مسلک بنایا۔ اور اگر وہ تناسخ کے قایل نہ ہوتے جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو انکی تعلیم سراسر موافق اسلام ہوتی مگر جو لوگ بابا صاحب کو ہندو یا مسلمان ثابت کرنا چاہتے ہیں انکے آئینہ دل کو ایک خاص زاویے سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ موج دریا کو پابزنجیر کرنا چاہتے ہیں وہ بوے گل کو قفس میں بند کرنا چاہتے ہیں اور اگر وہ کسی نتیجہ پر آئے بھی تو ان ہندو اور مسلمان مریدوں کیطرح جو بابا صاحب کے انتقال پر آپس میں جھگڑے تھے اصل گورو نانک کو ہاتھ سے کھو بیٹھیں گے اور انکے ہاتھ صرف نصف نصف کفن رہ جائے گا جسے خواہ وہ دفن کریں خواہ جلائیں بابا گورو نانک کے لئے ایک جیسا ہے۔ وہ پورا خدارسیدہ اور خدا کی محبت میں متوالا شخص تھا اور اس واسطے مذہب و ملت کی قیود سے پاک تھا اور ہمیں بھی انہیں ایسا ہی سمجھنا چاہئے۔ دیکھو کیا اچھا فرما گئے ہیں:

من رے کوں چھپائیں بن پیار

گرمکھ انتر رب رما بخشے بھگت بھنڈار

رے من ایسی ہر سو پیت کر جیسی جل کملہ
لہری نال پچھاڑیئے بھی وکسے اسن نہہ
جل میں جیو اُپائیکے بن جل مرن تنہہ

رے من ایسی ہر سو پیت کر جیسی مچھلی نیر
جیوں ادکیوں تیوں سکھ گنوں من تن سانت سریر
بن جل گھڑی نہ جیوئی پرب جانے اب پیر

رے من ایسی ہر سو پیت کر جیسی چاترک مینہ
سر بھر تھل ہریاولے اک بوند نہ پوئی کے

رے من ہر سو ایسی پیت کر جیسے جل دودھ ہوئے
آوٹن آپے کھوے دودھ کیوں کھپن نہ دے

رے من ایسی ہر سو پیت کر جیسی چکوئی سور
کھن پل نیند نہ سووئی جانے دور حضور

مفہوم یہ ہے۔ اے دل خدا کے عشق کے سوا تیری نجات کیونکر ہو سکتی ہے خدا سے ایسی محبت کر جیسے کنول کو پانی سے ہوتی ہے اور جس قدر زیادہ زور سے اسے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اسیقدر وہ پانی ہی کی طرف جھکتا ہے۔ خدا نے

ایسی محبت کر جیسے مچھلی کو پانی سے ہوتی ہے جس قدر پانی بافراط ہو اسیقدر
یہ پروں کو پھیلاتی اور لطف اٹھاتی ہے اور پانی نہ ملے تو مر جاتی ہے۔

اے دل خدا سے ایسی محبت کر جیسے چاتک مینہ سے محبت کرتا ہے۔ تالاب
بھرے ہوں یا کھیت ہرے ہوں لیکن اسے لطف نہیں آتا جب تک مینہ نہ برسے

اے دل۔ خدا سے ایسی محبت کر جیسے پانی دودھ سے محبت کرتا ہے خود جل
جاتا ہے لیکن دودھ کو بچائے رکھتا ہے۔

اے دل خدا سے ایسی محبت کر جیسے چکوا سورج سے کرتا ہے اور ایک لمحہ اسکے
بغیر نہیں سوتا۔

خدا ہم سب کو ایسی محبت دے۔ آمین

خواجہ دل محمد ایم اے
سکرٹری بزم اردو

دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے — سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
نغمۂ امید تیری بربطِ دل میں نہیں — ہم سمجھتے ہیں یہ لیلےٰ تیری محمل میں نہیں
گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا تیرا — اور دل ہنگامۂ حاضر سے بے پروا تیرا
قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں — اہل محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں
اے درائے کاروانِ خفتہ پا خاموش ہو — ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش ہو

"زندہ پھر وہ محفل دیرینہ ہو سکتی نہیں"
"شمع سے محفل شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں"

"ہمنشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں — اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے — اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا — اور مجھے اسکی حفاظت کے لئے پیدا کیا
دہر میں غارت گرِ باطل پرستی میں ہوا — حق تو یہ ہے حافظِ ناموسِ ہستی میں ہوا
میری ہستی پیرہن عریانیٔ عالم کی ہے — میرے مٹ جانیسے رسوائی بنی آدم کی ہے
قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے — جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے
آشکارا ہیں میری آنکھوں پر اسرارِ حیات — کہہ نہیں سکتے مجھے مایوسِ پیکارِ حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے — ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار — فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار
ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں — اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے — میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اُس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

کلامِ اکبر

ہم بزرگ ملک و ملت حضرتِ لسان العصر اکبر دام فیضہٗ کے نہایت ممنون ہیں جنہوں نے باوجود ہجوم آلام میں گرفتار ہونے کے ہماری درخواست کو شرفِ پذیرائی بخشا اور ذیل کا معنی خیز کلام جسے بحرِ طبع اکبر کے تازہ ترین آبدار موتی کہنا چاہیئے۔ عطا فرمایا ہے۔ آپ گرامی نامہ میں رقمطراز ہیں۔

"...... اچھا نہیں ہوں۔ دیگر وجوہ سے مجموعہ خاطر نہیں ہے۔ چند اشعار ذہن میں ہیں پیش کرتا ہوں۔ زندہ رہا تو آئندہ تقاضا پر دیکھا جائے گا۔"

ہم خلوصِ دل سے دعا کرتے ہیں کہ خدا اس ساقی میخانۂ حقیقت کی محفل کو سلامت رکھے۔ اور وہاں سے شرابِ معانی بلا امتیاز مذہب و ملت خاص و عام پر تقسیم ہوتی رہے۔ (طور)

محفوظِ ذہن رکھیں ہر دور ہم کو تاکے　　اوراقِ شہری میں نقشِ قلم کہاں تک
ہر قطرہ اور ذرہ ہے مورثِ حوادث　　دفتر بڑا کہاں تک زورِ رقم کہاں تک
شخصی ہوں خواہ قومی سب حالتیں ہیں فانی　　کبر و غرور کب تک جاہ و حشم کہاں تک
دیکھیں جو کچھ تو سمجھیں باتیں جو کچھ تو جانیں　　کب تک چناں چنیں یہ قول و قسم کہاں تک
ناقص مقدمے سے نکلے ہیں جو نتیجے　　ان پر وثوقِ صحت ائے محترم کہاں تک

نعمت سمجھ بلا کو ہے لذتِ تماشا آخر یہ محزنِ اشک اے چشم نم کہاں تک
کہتے ہیں دوست اکبر کو دیکھ کر بحسرت ہے اسکا دم غنیمت لیکن یہ دم کہاں تک

برادران سے تو نکلے ہاتھ سے واللہ ٹوٹا ہے خدا ہی اُسے سمجھیگا خدا کے گھر کو لُوٹا ہے
یترے کوچے میں وہ لالاں اگر ہے دین سے مجھ کو تعجب کیا ہے اسمیں ہے توں کا ساتھ چھوٹا ہے

مزا آتا ہے گردونکو مجھے بے چین کرنے میں مصائب جان دیتے ہیں مرے حُسن کی زکاوت
جمالِ لم یزل کی معرفت کیونکر میسر ہو کہ حسن غالب ہے فانی انقلابوں کا طبیعت پر

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے قوم ہی کو دیکھئے مُردہ ہے اور موجود ہے

بگڑ جائے گی میری اس مُبت کی اک دن اُسے اصلیہ رجع کل شئے

جس طرف اٹھتی ہیں آہیں ہیں چشم بد دور کیا نگاہیں ہیں
ذرہ ذرہ ہے خضر - شوق تو ہو جینے والے کو لاکھ راہیں ہیں

وہ بت مجھے کافر جو سمجھتا ہے تو سمجھے میں حسن دوروزہ کی پرستش نہ کرونگا

نوائے اُردو

کس بلا کی کشمکش ہنگامۂ ہستی میں ہے آہ! اے امیدہ تو اے قوم! کس پستی میں ہے!
مجکو حیرت ہے کہ ہے وہ تیری جمعیت کہاں خوف سے جسکے لرز جاتی تھیں اقوامِ جہاں

سن چلے سالار وہ لشکر کے تیرے کیا ہوئے　　جو سپہدارانِ عالم کے تحیّر زا ہوئے
گم ہوئے کس دشت میں وہ تیرے مردانِ نبرد؟　　نام سے جھکے ہوئے جاتے تھے رخ شیروں کے
کچھ خبر ہے منتشر تیری صفیں کیونکر ہوئیں؟　　جن سے برہم تیرے اعدا کی صفیں اکثر ہوئیں

آج گویہ جنگ ہے عالم میں مطعون ہو رہی
اک نئی پیکار سے دنیا ہے پُرخوں ہو رہی

عرصۂ ہستی ہے اک تصویرِ میدانِ وغا　　دادِ مردی دیتے ہیں بڑھ بڑھ کے مردانِ وغا
ہستیوں کے خوں سے ہے گلپوش دامانِ جہاں　　غیرتِ فردوس ہے گویا بیابانِ جہاں

زندگی اقوام کی ہے شرحِ پیکارِ حیات
خون کے پانی سے ہے سرسبز گلزارِ حیات

ہے جو عالم میں بپا ہنگامۂ خاموش ہے　　لاکھ ہنگاموں سے لیکن اسکی پُر آغوش ہے
آج اگلے نیزہ و تیغ و سناں بیکار ہیں　　اب نئے میداں نئے غازی نئے ہتھیار ہیں

گر مٹے پیکارِ نو سے جو تپش ساماں نہیں
اسکا جینا دہر کی منزل میں کچھ آساں نہیں

داستاں اے قوم تیری سرگذشتِ درد ہے　　یاد رکھنا! تو حجازی کارواں کی گرد ہے
جنبشِ دوراں سے حرکت میں خس و خاشاک ہے　　اٹھ کہ خونِ لا الٰہ سے تیری رگ نمناک ہے

زندگانی وہ بھی کیا ذوقِ نمو جسمیں نہو!
وہ بدن بھی کیا بدن جولاں لہو جسمیں نہو!

آگہی ہر وقت دیتی ہے ہمیں اے ہمنشیں!　　آفرینش نکتہ آموزِ "بقائے بہتریں"
اسنے عالمگیر پایا ہے عجب رنگِ قبول　　ہے زمانہ کے لکھا ماتھے پہ زر سے یہ اصول

جو بڑھیگا حوصلہ اسکا بڑھایا جائیگا
جو گرے گا اپنے رتبہ سے گرایا جائے گا

حسن و عشق

ذیل کی مختصر سیک اور شگفتہ نظم ہمارے دیرینہ دوست حضرتِ نادر کاکوروی کی طبعِ رسا کا نتیجہ ہے۔ یوں تو اکثر شعراء نے حسن و عشق کے مضمون پر زورِ طبیعت دکھایا ہے مگر جو خوبی ہمارے معنی آفریں دوست کے تخیلِ فلسفیانہ نے اس نظم میں پیدا کر دی ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ کہلانے کے مستحق ہے۔ سبحان اللہ! پیارا پیارا تخیل اس پر پیارا پیارا تغزّل سونے پر سہاگہ! نظم پڑھتے ہی دل بے اختیار جذباتِ حسن و عشق سے تڑپنے لگتا ہے اور اس نادر المثال حقیقت نگاری دیکھ کر بیساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ ع

ایں سے کہ در پیاست حقیقت نہ مجاز است

(غلام محمد طور ایڈیٹر)

تیرگی صبحِ ازل پر شب کی تھی چھائی ہوئی — دفعتہً اِس تیرگی میں محفل آرائی ہوئی

رنگ آمیزیِ حسنِ اوّلی جلوہ پیرائی ہوئی — اور پھر درکار اک چشمِ تماشائی ہوئی

آفرینش عشق کی خود حسن کی تعریف تھی

ورنہ یہ بزمِ تماشا محفلِ تاریک تھی

وہ تھا زیرِ زمیں گنجینۂ اسرارِ حسن — سر بسر اندھیارے تہ خانے میں تھا طومارِ حسن

گرم تھی اندر ہی اندر محفلِ انوارِ حسن — تھا دھواں رہ رہ کے دیتا کوہِ آتشبارِ حسن

ناگہاں اِک شمع اِس محفل میں روشن ہو گئی

ہر شعاعِ جلوہ باہم جلوہ افگن ہو گئی

ہر وجود جلوہ تقاصد ایۂ جلوہ حبیب — ہر تماشہ سو طرح سے دلربا اور دل فریب
ہر اداۓ دلربائی غارتِ صبر و شکیب — ایک تو حسن اور پھر اس پر بلا کا جامہ زیب

ذرہ ذرہ سے شرارِ الفت کا پیدا ہو گیا
آئنہ میں حسن اپنا آپ شیدا ہو گیا

جلکے سوزِ شمع پروانہ لگن سے لے اڑا — مر کے بسمل جان لو چاکِ کفن سے لے اڑا
ہر گلِ تازہ کو اک بلبل چمن سے لے اڑا — ہر پری کو ایک دیو اس انجمن سے لے اڑا

ذرہ ذرہ سے تھی پیدا شانِ حسن طورِ عشق
چلگیا اس سلسلہ سے میں اک سرے سے دور عشق

عشق کیسا؟ عشق مر کر خاک ہو جائیگا عشق! — ڈوب کر دریا آہ جلکر پاک ہو جائیگا عشق!
آب و آتش پر خس و خاشاک ہو جائیگا عشق! — بحر میں اک دیدۂ نمناک ہو جائیگا عشق!

عشق کیا ہے حسن کا اک خونچکاں افسانہ ہے
عشق کا جو ظرف ہے وہ حسن کا پیمانہ ہے

(زاہد کاکوروی)

طور کی چنگاریاں

ذیل کی مختصر غزل اب سے چند سال پہلے ایک خاص عالمِ یاس میں آتشکدہ دل کے انشقاق کے وقت لکھی گئی۔ میرے بزمِ راز کا اشارہ میرے پرانے دوست بخشی حضور علی صاحب (روحی فداہ) خلف الرشید جناب بخشی غضنفر علی رضا صاحب اسسٹنٹ سٹیلمنٹ آفیسر ضلع لدھیانہ کی طرف ہے۔ بعض احباب کے اصرار سے ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

تم پیرِ بزم ہو جو مری بزمِ ناز کے
پھر جانتے ہو رازِ دلِ پاکباز کے

حسرت کا آفتاب ہے نصف النہار پر
پودے تمام خشک ہیں گلزارِ آز کے

اے اہلِ دید ہمکو ستاؤ نہ زینہار
ہم ہیں فریب خوردہ نگاہِ مجاز کے

جولانگاہ یہ کسی برقِ تپاں کی ہے
آثار کہہ رہے ہیں جبینِ ایاز کے

دیکھی تڑپ جگر کی تپش جانچی بجلی
یارب! یہ ناز ہیں تو کسی مستِ ناز کے

اے مرغِ صبح ہملے ترے بھی ہیں جانگداز
تم ہو کہ ہم امام سحر کی نماز کے؟

کشتی اسی کی آس پہ ہے، اپنی زندگی
ممنون ہم ہیں رگِ حیاتش دراز کے!

راہِ اہل میں یاس کے کانٹے ہیں منتشر
اور اس پہ ہم حریص امیدِ دراز کے!

اے برق! کیا دکھائیگی تو ناز پاشیاں
مخزن میں ہم تو سوزِ سراپا گداز کے

لیکر چمن سے پھول چلی ایک عندلیب!
کیا تھے یہی حقوق شہیدانِ ناز کے

لاکھوں کا خون بہ گیا، سر تن سے کٹ گئے
ابرو کھچے جو آج مرے مستِ ناز کے

یہ تو بتا کہ مفت میں بیکار جائینگے
وہ ولولے وہ جوش کسی عشقباز کے

وہ دن گئے کہ صحبتِ یاراں نصیب تھی
لیتے تھے لطفِ محفلِ راز و نیاز کے

اے طور! میری آنکھ سے آنسو نکل پڑے
آئے کرم جو یاد کسی دلنواز کے

سقراط کی موت

سقراطِ نامدار بڑا جو حکیم تھا
علم و حلم کے طور کا گویا کلیم تھا

لیلائے حق کے عشق میں سرگرمِ جستجو
مجنوں کی طرح پھرتا تھا بیتاب کو بہ کو

طالب تھا علم کا۔ متلاشی راستی
راہیں نکالتا تھا جو دیکھی نہ تھیں کبھی

پرسانِ راہ نیک وہ رستے دکھاتا تھا
اور سب کو سیکھنے کے بہانے سکھاتا تھا

ازبسکہ تھا رموزِ حقیقت سے آشنا
باتیں سنی نہ تھیں جو کبھی وہ سناتا تھا

تصویر علم و زہد و ریاضت کی ہو بہو
حکمت کی خامشی تھی تو دانش کی گفتگو

بادل کیطرح سے دمِ تقریر چھاتا تھا
اک سیلِ فضل تھا کہ جواہر لٹاتا تھا

وہ نورِ معرفت تھا حقیقت کا آفتاب
باطل کے دعویدار و نکے ہوتے تھے دل کباب

جو مدعی تھے صورتِ خفاش ہو گئے
یوناں کے لوگ برسرِ پرخاش ہو گئے

خاموں نے پختہ مغز کو مشہور کر دیا
گمراہ کرنے والا جوانانِ شہر کا

الزام احمقوں نے دیئے صد ہزار اُسے
اور بوڑھے فلسفی کو عدالت میں لے گئے

تجویز موت کی ہوئی سقراط کو سزا
اس فیصلہ کو سنکے فلاطوں نے رو دیا

شاگرد جمع ہو کے پکارے کہ الاماں!
ٹوٹا ہمارے سر پہ مصیبت کا آسماں؟

سقراط نے مگر انہیں تسکین بہت سی دی
اور پیار سے کہا "نہیں مرتا ہے آدمی"

زنداں میں ہوں تو اِسکا مجھے کچھ بھی غم نہیں
پیکر بھی روح کیلئے زنداں سے کم نہیں -

جب آدمی ہو - روح تن اُسکا لباس ہو
اِسکے اتارنے سے کوئی کیوں اداس ہو

جب مرغ روح کا قفسِ تن سے اُڑ گیا
آزادیاں ہیں - باغِ حقیقت کی ہے ہوا

اہلِ وفا کو موت نہیں ہے مگر فراق
دنیا میں کچھ عجیب نہیں ہے یہ اتفاق

اِس مختصر جدائی کا ناحق ہے تم کو غم
جب یہ امید ہو کہ پھر اک دن ملینگے ہم

انجام کار زہر کا پیالہ بھرا ہوا
اسطرح پی گیا کہ حقیقت میں کچھ نہ تھا

شاگرد چپ تھے گو جگر انکا کباب تھا
استاد اک کھلا ہوا حکمت کا باب تھا

جو تھا سخن لبوں پہ وہ دُرِّ خوشاب تھا
زہراب اُسکے ہاتھ میں جامِ شراب تھا

سقراط اگرچہ اب نہیں باقی جہان میں
اب تک صدائیں گونجتی ہیں سبکے کان میں

باقی ہے شہرہ آج ملک اُسکے نام کا
ہے اُسکے سر پہ تاج بقائے دوام کا

حق کے مقابلہ میں تھا گو جان کا خطر | بالغ نظر تھا تھی اُسے انجام پر نظر

گو کام کرتے کرتے وہ جان سے گذر گیا | جو کام کرنے آیا تھا وہ کام کر گیا

وقت آ پڑا تو موت کی آفت بھی سہہ گیا

مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

(صادق علیخاں بی۔ اے

از کشمیر)

تازہ غزلیں

خدارا اند کے پاسِ وفائے | بہ جورے۔ ظلمے۔ آزارے۔ جفائے

بتے دارم فراموشی ادائے | بعید بیگانگیہا آشنائے

عنانِ اختیارِ ما بیفتاد | بدستِ نالۂ صبر آزمائے

. . . .

چہ سازم من کہ در بازارِ تمکیں | بدشنامے نے ارزد دعائے

نصیبِ دشمناں آں سعیِ من باد | کہ گاہے زاں برآید مدعائے

بکوشش حیلہ خواہم نشستن | مگر خود بشکنم خارے بپائے

قرار از گیسوئے جاناں بیارد | بکوئے اضطرابِ ما ہوائے

دلم جا نرا بہ پرسش میسپارم | بہ آہے دلگدازے جانگزائے

فلک صد بار ما را سینہ بشگافت | بہ یک وا کردنِ بندِ قبائے

کشم گر نالۂ باکے ندارد | عذر از نغمۂ راحت فزائے

کسے گر بشنود خاموشیِ ما | بپردازد بہ عرضِ ماجرائے

به عفوش ہدیہ باشت زاہد ز ما دریوزہ کن جرمے خطائے
به راہ کوئے او افتادہ باشم بود من ہم رسم روزے بجائے
فغان بسمل کہ او نتواخت مارا
به جورے۔ ظلمے۔ آزارے۔ جفائے

(از جناب قیصر بھوپال)

بہت ہیں یوں تو لیلے تیرا محمل دیکھنے والے
مگر گنتی کے نکلینگے ترا دل دیکھنے والے

مرو اے ہمت پائے طلب تیرا سہارا ہے
بہت گھبرا رہے ہیں بعد منزل دیکھنے والے

کیا ہے پانی پانی آنکو سیلاب حوادث نے
بہت اترا رہے تھے اپنی ساحل دیکھنے والے

تمہیں پر منحصر کیا ہے۔ تمہارے تیر کہدینگے
بہت ہیں تیرے پہلو میں مرا دل دیکھنے والے

نگاہ رشک لڑتی ہے مرا دل چور ہوتا ہے
نہ دیکھیں میری جانب کی محفل دیکھنے والے

فقیری میں بھی قیصر سو امیروں پہ میں بھاری ہوں
تو نظر جاتے ہیں مجھکو سائل دیکھنے والے

اعلان جو صاحب وو خریدار مخزن قسم اول یا دوم کے آرڈر بھجوائینگے۔ انکا چندہ وصول ہونیپر ایک مثنویات میرحسن یا سوم دہلی یا سیرت حسب پسند انکے نذر کیجائیگی۔ مینیجر

اطلاع ع۔ جن صاحبان کی میعاد چندہ مخزن آخر جولائی تک ختم ہو چکی ہے۔ انکے نام پرچہ اگست سنہ ۱۲ء وی پی ہوگا۔ براہ مہربانی وصول فرماکر مشکور فرماویں۔ بصورت دیگر اطلاع بخشیں کہ دفتر کو بے وجہ زیر باری نہو۔

شائقین کتب ملاحظہ فرماویں

سنگلاخ کتابوں کا حل۔ مندرجہ ذیل کتابیں کوئی حل نہ کر سکا اور نہ کوئی انشاءاللہ حل کر سکتا ہے یعنی پتھروں کو پانی کر کے بہا دیا۔ دیکھنا شرط ہے۔

حل قصائد خاقانی۔ مع کورس منشی فاضل ایم اے حصہ اول عہ حصہ دوم زیر طبع ہے

حل کلیات۔ اردو مرزا غالب دہلوی رحمہ ۱۰/

حل قصائد خاقانی۔ کورس منشی عالم ۹/

حل نکات مولانا مرزا عبدالقادر بیدل رحمہ در تصوف ۱۲/

شوکت التجدید میر۔ یہ کلیات جو قصائد و غزلیات و رباعیات و سلام اور اردو اور بھاشا وغیرہ کی نظم سے مرصع ہے اور شاعری کی دنیا جس کی منتظر ہے پیشگی قیمت آ رہی ہے زیر طبع ہے۔ پیشگی عہ اور بعد طبع عہ

اعلان عام۔ جو صاحب کامل شاعر بننا چاہیں میری جانب رجوع لائیں۔ جیسا کلام ہوگا اسی درجہ کی اصلاح ہوگی۔ کلام بھیجکر آزمالیں جو صاحب کسی کتاب اردو فارسی عربی میں اصلاح لینا چاہیں فیس کے بارہ میں مراسلت کریں اکثر کتابوں کا لٹریچر ملک الملک صحیح نہیں ہوتا غلطیوں کو مجدد ہی خوب جانتا ہے۔

مجدد السنہ مشرقیہ احمد حسن شوکت میرٹھ

التماس منیجر۔ چونکہ مخزن بیشتر کرمفرمائے احباب کی روشن خیالی کا نتیجہ ہے اور کچھ عرصہ سے انکی توجہی اس حد کو پہنچ گئی کہ نہ وہ تازہ خیالات سے مخزن کی دستگیری فرماتے ہیں نہ رسالہ سے۔ لہذا التماس ہے جن اصحاب کی رقمیں پل جینہ گذشتہ ہو چکے ہیں وہ بھیجدیں اور انکی رقم مع تازہ مضامین عنایت فرماویں بلکہ دیگر ناظرین بھی مدد فرما کے ہماری [illegible] شکر گزار فرماویں۔ منیجر

طب یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب [illegible]

خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطراف ہند میں انکا نام
لے سب کی نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت
اگر کچھ امیدیں ہیں وہ انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں جناب حاذق الملک صاحب [illegible]
دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک
کی اس عظیم الشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ انکے احساس [illegible]
کا ثبوت اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمرہ ہے گو اس کی ظاہری حیثیت ایک تجارتی
حیثیت ہے۔ لیکن اگر حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں۔
طب یونانی کی بقا کا سامان ہے۔ شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اسلئے جس
غرض سے یہ قایم ہوا ہے اسکے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے
اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکی طرز ساخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا مقصد ہے
جسے یہ پورا کرتا ہے بہت سی اس قسم کی ادویات مختلف امراض کے لئے عام طور پر اطبا بتاتے ہیں لیکن
[illegible] نسخے جو صرف [illegible] کو میسر آتے تھے بالکل اصلی ہیں دواخانہ میں بنتے
رہتے ہیں۔ اور وہ اچھی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ و زنانہ شفاخانہ
کو ملتی ہے [illegible] جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور [illegible]
[illegible]

حیدرآباد دکن
بمبئی
مدراس
اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقام خلافت مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا پہلے ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ شائقین جلد منگوا لیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ۸؍

رسوم دہلی۔ مولفہ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ . . . . . ۱۲؍

اقبال دلہن۔ مصنفہ مولوی محمد بشیر الدین احمد خاں صاحب (قسم اول ۱۰؍ قسم دوم ۸؍)

خواب ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن . . عہ

ابو مسلم خراسانی۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے
مولوی محمد حلیم صاحب رودلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے بلا کم و کاست ترجمہ کیا ہے ۱؍

انتخاب مخزن۔ مخزن کی سابقہ ۹ جلدوں کا انتخاب قیمت . . . . . عہ

درد جانستاں۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کی زبان میں دہلی کا سچا واقعہ ۸؍

مثنویات میر حسن۔ مثنوی بینظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک قلمی نسخے سے شامل کر دی گئی ہے ۱؍

سیر تبت۔ انگریزی کتاب فوربیڈن ایران تبت کا بامحاورہ ترجمہ ملک تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱؍

مرقع خوش خطی۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الحق صاحب مصنف رقم الحروف نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین کے واسطے تیار کیا۔ جس کو دیکھ کر خود سے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب نے اسکے اہتمام میں ملحوظ رکھا ہے۔ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اس وقت ملک میں موجود نہیں۔ ۵؍

سوانح عمری امام سید نثار علی صاحب شہرت نے اسکو نہایت کوشش سے تیار کیا ہے قیمت ۱؍

درخواستیں بنام منیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

(یہ کتابیں خواجہ محمد یوسف عباسی دروازہ لاہور سے بھی منگوائیں)

पुणें, चित्रशाळा स्टीम प्रेस सदाशिव पेठ ८१८.
CHITRA SHALA STEAM PRESS, POONA CITY.

سیاسات

ہمارے ملک میں آج کل پولٹکس کا بہت زور ہے۔ جسے دیکھو سیاسی معاملات سے دلچسپی ظاہر کرتا ہے اور ان پر رائے زنی کا شوق رکھتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہے کہ امور سیاسی میں دخل دینا حبِ وطن کا بہترین ثبوت اور خدمتِ وطن کا بہترین طریق ہے۔ مگر اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ سیاسیات کو سمجھنا آسان نہیں اور ہر شخص کا دماغ سیاسیات کے لئے نہیں بنایا گیا۔ سیاسی آدمی کے لئے نہایت وسیع معلومات بہت طویل تجربہ اور نہایت صائب رائے کی ضرورت ہے۔ اور جو کوئی اس سامان کے بغیر سیاسی ہونے کا دعوےٰ رکھے وہ بمنزلہ نیم حکیم یا نیم ملّا کے ہے اور ملک کے لئے اور

اور اپنے لئے بجائے باعث نفع ہونے کے سبب ضرر ہو سکتا ہے۔ یورپ کے جن ممالک کی مثال دیکھ کر ہر سر میں پولٹکس کا سودا سمایا ہے اُن ممالک کی حالت جدا ہے اور وہاں معمولی آدمیوں کے دماغ بھی عرصۂ دراز کی سیاسی تعلیم سے سیاسیات کو بقدر ضرورت سمجھنے لگے ہیں اور خاص خاص آدمی تو مدت العمر کی محنت سے سیاسیات میں انتہائی قابلیت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہندوستان باایں وسعت و آبادی اپنے کروڑوں باشندوں میں سے ایک سو ایسے سیاسی شخص پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جو اگر آج ان کو موقعہ ملے۔ تو انگلستان کی پارلیمنٹ کے ممبروں کے بہتر طبقہ کے ہم پلہ شمار ہو سکیں اور انگلستان میں اس قسم کے اشخاص جو پارلیمنٹ کے فرائض بخوبی انجام دے سکیں نہ صرف سیکڑوں کی تعداد میں پارلیمنٹ کے اندر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ بلکہ پارلیمنٹ سے باہر ایسی کثیر تعداد اُن کی موجود رہتی ہے کہ کئی بار انتخاب ہو اور ہر انتخاب میں ایک نیا مجموعہ ممبروں کا لیا جائے تو بھی وہ کافی ہوں۔ ایسے قابل افراد کا اتنا بڑا مجموعہ انگلستان کی پولٹیکل زندگی کی کامیابی کا راز ہے۔ اور کوئی ملک خواہ مغربی دنیا کا ہو خواہ مشرقی دنیا کا۔ اس زندگی کی تقلید کے لائق نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ اس کی آبادی میں اسی نسبت کے ساتھ ماہران سیاسیات کی تعداد اس میں موجود نہ ہو۔ حال میں دو ممالک میں پارلیمنٹ کے اصول کو عمل میں لانے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ ایک ٹرکی۔ دوسرا ایران۔ ان میں ٹرکی گو ایشیائی نژاد ملک ہے۔ اور اس کا کثیر حصہ اب بھی ایشیائی

ہے۔ تاہم اس کا شمار دول یورپ میں ہے۔ اور اس کے مغربی حصے کے باشندے یورپ میں صدیوں تک رہتے رہتے اور یورپین اقوام سے ملتے ملاتے تعلیم اور تمدن میں کچھ کچھ اُن اقوام کے ہم قدم ہوتے جاتے ہیں۔ اسی لئے ٹرکی میں پارلمینٹ بنانے کا تجربہ نسبتاً کامیاب ہوا ہے۔ گو یہ کُلّی کامیاب نہیں ہوا۔ ایران خالص ایشیائی ملک ہے۔ اس میں پولٹیکل انقلاب ہونے کو تو ہو گیا۔ مگر تا حال وہ اسے راس نہیں آیا۔ اور ایران کی پارلمینٹ کو اب تک کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ اور ایران کی قسمت اب تک امید و بیم کے درمیان لٹک رہی ہے۔ ٹرکی اور ایران کی اس تفاوت کا کیا سبب ہے۔ وہی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ٹرکی میں بمقابلہ ایران کے بہت زیادہ آدمی پولٹیکل زندگی کے لئے تیار موجود تھے اور ہیں۔ برعکس اسکے ایران اُس تجربہ اور تربیت کے لوگوں سے قریب قریب خالی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اہل ایران قدرتی طور پر ہوشمند۔ ذہین اور طبّاع ہیں۔ اور اگر وہاں تعلیم اچھی طرح پھیل جائے اور اہل ملک کی ایک معقول تعداد سیر و سیاحت سے ضروری معلومات بہم پہنچا کر تجربہ کے موتی رول لے۔ تو ایرانی قابلیت کے اعتبار سے کسی سے کم نہ نظر آئیں۔ لیکن موجودہ حالت میں اُن کا سامان اُس اہم کام کے لئے جو انہوں نے شروع کیا۔ بہت قلیل ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ کیا ٹرکی کیا ایران دونو کی پولٹیکل مشکلات کا ایک معتدبہ حصہ اُن پیچیدگیوں سے پیدا ہوتا ہے جو بیرونی طاقتیں اُن کے معاملات میں ڈالتی رہتی ہیں اور اُن رکاوٹوں سے بچنا اُن کے بس کی

بات نہیں۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر یہ بیرونی مشکلات نہ بھی
ہوتیں تو بھی ایران کو قحط الرجال کے سبب سے دقت کا سامنا ہوتا۔
جب پارلیمنٹ ایران میں قایم ہوئی تو اس وقت میں انگلستان میں
تھا۔ میرے ملاقاتیوں میں دو ایرانی صاحبان تھے جو باعتبار سیاسی
واقفیت اور تعلیم کے بہت متوسط درجہ کی قابلیت رکھتے تھے۔
اُن کے پاس ضروری پیغام اہل وطن سے آئے کہ آپ ایران
میں آئیں۔ ہم آپ کو نئی پارلیمنٹ کا ممبر مقرر کرتے ہیں۔ کیونکہ آپ سے
بہتر آدمی یہاں ملنے محال ہیں۔ چنانچہ وہ چلے گئے اور ممبر ہو گئے۔
بے شک اُن کی قابلیت کے ممبر اور پارلیمنٹوں میں بھی ہونگے۔ مگر اس
سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایران میں لایق لوگوں کا بے انتہا قحط ہے۔
میں نے ایک دوست سے اس کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اسی زمانے
میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ اگر ٹرکی کو پارلیمنٹ نصیب ہوئی تو ٹرکی
والے ایران سے بہت بہتر اس کل کو چلا سکیں گے کیونکہ اُن کے
پاس اگر زیادہ نہیں تو سو دو سو ایسے سیاسی دان نکل آئیں گے
جو یورپ کے اچھے اچھے پارلیمنٹ والوں کے مد مقابل ہوں۔
اس معیار کو مد نظر رکھ کر دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان ابھی اصلی پولیٹکل
زندگی سے کتنا دور ہے۔ اور اس کو کتنے مرحلے طے کرنے ابھی
باقی ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان کو اس زندگی کی آرزو
نہیں کرنی چاہئے۔ بیشک کرنی چاہئے۔ مگر اس آرزو کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ پہلے اس زندگی
کی تیاری کرنی چاہئے اور پھر اُس میں قدم رکھنا چاہئے۔ اور تیاری کا پہلا زینہ یہ ہے کہ بجائے پولیٹکل
لیڈری کے دعویداروں کے ہم ایک کافی تعداد ایسے اشخاص کی مہیا کریں جو پولیٹکس کو طالبعلمانہ [illegible]

اور سیاسیات کا ماہر کہلانے کی بجائے سیاسیات کا طالب علم کہلانا اپنا فخر سمجھیں اور عمریں اس فن کے حاصل کرنے میں صرف کردیں۔ وہ عمریں جو اسطرح صرف کی جائیں گی۔ ہرگز رائگاں نہیں ہونگی۔بلکہ پھل لائیں گی اور ملک کی سیاسی ترقی کی اصلی بنیاد ہونگی۔ فی الحال تو سیاسیات کا اصلی مفہوم نہ جاننے کے سبب سیاسی زندگی عجب غلط فہمیوں کا شکار ہو رہی ہے۔ اور ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

کا مصداق بنی ہوئی ہے کوئی تو یہ سمجھتا ہے کہ گورنمنٹ کے افعال پر جا و بے جا نکتہ چینی کرنے کا نام پولٹکس ہے۔ اور جو شخص دلیرانہ نکتہ چینی شروع کرے وہ فوراً پولٹیکل لیڈروں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ بغیر اس لحاظ کے کہ اس کی رائے صحیح ہے یا نہیں۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ اگر ہندو ہیں تو مسلمانوں پر حملے کرتے رہنا۔ اور مسلمان ہیں تو ہندوؤں کی خبر لیتے رہنا بڑی پولٹیکل خدمت ہے۔ حالانکہ پولٹیکل لحاظ سے یہ خدمت کا بالکل الٹ ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دماغ میں یہ سما گئی ہے کہ تحریر و تقریر سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور عملی طور پر فتنہ و فساد کی طرف مائل ہیں اور اس دھوکے میں ہیں کہ وہ اپنے دیس کو بہت نفع پہنچا رہے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ اس سے زیادہ نقصان وہ اپنے ملک اور اہل ملک کا نہیں کر سکتے۔ لیکن جو اصلی چیز حاصل کرنے کی ہے۔ اس سے اکثر بے خبر اور عموماً بے پروا ہیں۔ سارے ہندوستان میں مسٹر گوکھلے گنتی کے چند آدمیوں میں ہیں۔ جو علم پولٹکس میں مستغرق ہیں اور جو اس سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اس نمونہ کے

اور اس قابلیت کے سینکڑوں آدمی ملک میں موجود ہو جائیں تو اصلی پولیٹکل زندگی کا آغاز ممکن ہے۔ اور اس سے پہلے ساری ہمت اور قوت بجائے بے خبرانہ رائے زنی اور قبل از وقت تخیلات میں صرف ہونے کے علم سیاسیات کی باقاعدہ تحصیل اور مطالعہ میں صرف ہونی چاہیے۔ جب سیاسیات کے مستعد طالب علموں کی کافی تعداد تیار ہو جائے تو آن فارغ التحصیل طلبہ اور ان کے پختہ کار استادوں کے سامنے سیاسیات کا سب سے اہم مسئلہ یہ پیش ہوگا کہ وہ اس علم کو جو انھوں نے حاصل کیا ہے۔ ایسی عملی صورت دیں جو اس ملک کے حالات کے مناسب ہو۔ کیونکہ کئی سیاسی تجربے جو یورپ میں مفید ثابت ہوئے ہیں وہ ہندوستان میں مضر ہو سکتے ہیں اور کئی چیزیں جو ہندوستان میں مقبول عام ہو سکتی ہیں۔ وہ ممکن ہے کہ یورپ میں نامقبول ہوں۔ سیاسیات کا اصل اصول یہ ہے کہ وہ کام کرو جو مناسب وقت ہو۔ جس میں نفع یقینی اور نقصان کا احتمال کم سے کم ہو۔ اور جس سے اہل ملک کو کوئی حقیقی اور دیرپا نفع پہنچے۔ عملی پولیٹشن یا ماہر سیاسیات وہ شخص ہوگا جو محض کتابی اصول کی واقفیت یا پابندی سے آگے بڑھ کر خود ہر ملک۔ ہر وقت اور ہر قوم کے حالات خاص کے مطابق اصول سیاسی وضع کر سکے۔ سیاسیات ایک ایسی چیز ہے جسکے بالکل سخت اصول منضبط کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور جس میں عملی فائدہ سب سے بڑا اصول معلوم ہوتا ہے اور یہ وہ راہ ہے جس کی طرف موجودہ متمدن دنیا اپنے طرز عمل سے بے طرح جھکی آتی ہے۔

عبدالقادر

پوچھتے ہو حال کیا میرا قمارِ عشق میں
جھاڑ بیٹھا ہاتھ میں نقدِ دل و دیں ہار کے

(کھڑپنچ[1]) حضرت میں کوئی ایکا ڈھکا نہیں ہوں کہ تم ایسیوں سے دب کر چلوں اور دبوں بھی تو کیوں؟ میرا خاندان - میرا کنبہ - میری عظمت میری شوکت کس سے کم ہے؟

(سنتوکھی) سبحان اللہ! سانجھ سویرے کس سے پالا پڑا! کوئی خدا کا نام لیتا ہے - کوئی پرمیشر کا - خود بدولت ہیں کہ اپنے خاندان - اپنے کنبہ - اپنی عظمت اور شوکت کا گیت گا رہے ہیں -

ع سانجھ سویرے مل کر چڑیاں چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں

(کھڑپنچ) چوبارے کے دریچہ سے سر نکال کر

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

تم کون ہو جو بن بلائے ہی بول پڑے ہو ـــ

اور باتوں کا اب پیام ہوا   مینڈکی کو بھی لو زکام ہوا

---

[1] سرپنچ کو پنجابی زبان میں طنزاً کھڑپنچ کہتے ہیں -

محلہ بھر تو مارے ڈر کے دم بخود رہتا ہے اور خود بدولت ہمارے مقابلہ میں باتیں چھانٹتے ہیں خدا کی قدرت یہ حوصلہ اور یہ تعلّی۔ کان تو بجتے ہی تھے آنکھوں پر بھی پردہ پڑ گیا۔ ؎

اِن جاہلوں کی ضد پہ سر دار اُڑ گیا
کیوں پردہ آنکھ پر تیری منصور پڑ گیا

کالے مُنہ اندھیرے لگے ملّا جیاں سُنانے۔

رشتو کھی) سعید! سُنتے ہو؟

صبح ہی سے آپ ساری دنیا کو کوس رہے ہیں نے خدا لگتی بات کی تو حضرت آگ بگولا ہو گئے۔

(سعید) قبلہ! یہ ہیں کون صاحب! اِن کا تو روز کام ہی یہ ہے۔

رشتو کھی) کیا بتاؤں یہ کون ہیں سنا ہو گا یہاں خدائی فوجداروں کا ایک خاندان ہے خدائی فوجدار بڑا بھائی ہے اور اُس سے چھوٹے ہوائی مجسٹریٹ اور خواہ مخواہ ہیں۔ یہ حضرت چوتھے درجہ پر ہیں اِن سے چھوٹے ایک اور صاحب وکھی پتیہ نامی بھی ہیں نہ کلکٹر ہیں نہ مجسٹریٹ ہیں۔ نہ تحصیلدار نہ تھانہ دار۔ خود بخود ہی سب اختیارات برت رہے ہیں سارے شہر کی جان عذاب میں ہے۔ رہنا اسی شہر میں ہوا۔ جائیں تو کہاں جائیں۔

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

(سعید) میں تو سمجھتا تھا کہ یہ کوئی بڑے مجسٹریٹ ہیں۔ کیونکہ انکے ہاں تو کوڑیوں مقدمات والے صبح و شام بیٹھے رہتے ہیں اور یہ آن کے

سلہ پنجابی زبان [illegible] ۔ سلہ [illegible] یا رشا طرز کہتے ہیں جو گھر نا لگا کر پیلی [illegible]

فیصلے کرتے ہیں۔ آپ بھولتے ہیں انہیں سرکار سے ضرور کوئی اعزاز حاصل ہے۔

(نعیم) سنتو کھی نے جو کچھ کہا ہے درست کہا ہے۔ انہیں سرکار سے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ خود بہ خود ہی بن بیٹھے ہیں۔ ان کا نام کھڑپینچ ہے۔

(سعید) یہ نام ہی عجیب ہے۔ پنچ تو سنا کرتے تھے۔ یہ کھڑپینچ کیا؟

(نعیم) پنجابی زبان میں پینچ نمبردار کا مترادف ہے
کھڑپینچ وہ جو سرکار سے تو نمبردار نہ مقرر کیا گیا ہو مگر خود بہ خود ہی دخل درمعقولات سے نمبردار بن گیا ہو۔

(سعید) اس زمانہ میں لوگ ایسے خودساز لوگوں کی کس طرح مان سکتے ہیں۔ اصلی نمبرداروں کی تو کوئی سنتا ہی نہیں روز انہیں مار ہی کھاتے دیکھتے ہیں۔

(نعیم) یہ بالکل درست ہے ایسے لوگ اپنا اُلّو سیدھا کر ہی لیتے ہیں۔

(بدن سنگھ) بالکل درست ہے بمقابلہ نمبرداروں کے ان کھڑپینچوں کی چاندی ہی چاندی ہے۔ ہمارے علاقہ میں بھی ان کا بہت کچھ زور ہے۔ تعجب ہے کہ عدالتوں محکموں میں بھی ان کی قدر و منزلت ہے۔ اور انکی کرتوتوں سے کوئی واقف تک نہیں۔

(نعیم) خیر ! مارا چہ ازیں قصہ ؟ خدا پناہ میں رکھے !

(سعید) یہ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں ؟

(انعیم) پڑھے تو واجبی ہیں۔ لیکن گھُنے بہت ہیں۔ دو تین الماریاں قانونی کتب کی بھی بھر رہی ہیں۔ انہیں باتوں سے تو محلہ والے انکا کلمہ پڑھتے ہیں۔

(کھڑپنچ) اچھا معلوم ہوا کہ یہ لالہ ستو کی صبح ہی صبح چرغے تھے۔ خوب۔ اب یہ دوکاندار بھی بولنے لگ گئے۔ شریفوں کی بات پکڑتے ہیں۔ پکڑتے ہی نہیں بلکہ منہ سے توڑتے ہیں۔ اچھا صبح تو ہووے۔

(زنانہ) کھڑپنچ سے مخاطب ہوکر۔

یہ کیسا شور ہے؟ کس کی شامت آئی ہے جو آپ کے منہ آئے۔ اُن کے سایہ سے بھی کوئی نہیں گذر سکتا۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

(کھڑپنچ) تم تو خوب جانتے ہو کہ اس شہر ہی میں کیا اس علاقہ میں بھی کس قدر عزت و آبرو ہے۔ کرسی ملتی ہے۔ کرسی؟

کارونیشن دربار پر ہمارے سوائے اور کون بلایا گیا تھا؟ اس اعزاز و احترام کی وجہ سے کون ہے جس کی آنکھ نہیں کھل جاتی؟ اور کون ہے جو اپنا سا منہ لے کر نہیں رہ جاتا؟ ؎

مجال کس کی ہے اور حوصلہ ہے یہ کس کا

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

(زنانہ) مہاراج! آپ کی بڑھتی دولت۔ طالعمندی۔ خوش اقبالی کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ اس وقت جو تمہیں احترام و اقبال پرمیشر نے دے رکھا ہے ہمارے شہر میں تو وہ کسی خاندان کے نصیب نہیں ہوا۔

(کھڑپنچ) ناتھو جی! تم ہمارا رتبہ جانتے ہو۔ یہ آنکھ والوں کا کام ہے۔ یہ لوگ کیا جانیں ہے

خاک ہوں پر توتیا ہوں چشم مہر و ماہ کا
آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا۔

(سعید) واہ! اپنے منہ سے میاں مٹھو۔

(لالہ سنتوکھی) ابھی کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ انہیں دربار کارونیشن میں کس نے بلایا تھا چھ مہینہ کی کوشش کے بعد انہیں ٹکا سا جواب ملا۔

(سنتوکھی) یہ تو ایک تمغہ بھی لئے پھرتے ہیں۔

(سعید) چاندی کا یا سونے کا؟

(سنتوکھی) منسی سمجھتے ہو؟

(سعید) اجی کسی طالب علم سے اڑا لیا ہوگا۔ یہ تو گئے بھی نہیں۔ اور اگر جاتے بھی تو یہ کس قطار و شمار میں نہ تھے نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

کوئی ۹ بجنے کو ہونگے کہ کھڑپنچ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

کون ہے؟

(نادو) میں ہوں نادو چودھری خراسی محلہ والا۔

(کھڑپنچ) زور سے کھانس کر۔

خیر تو ہے؟ اس وقت کیا ضرورت پڑی؟

(نادو) اجی! وہی مکان والا مقدمہ ہے آپ نے کہا تھا کہ دو چار گواہ بناوینگے۔ تمہیں یاد ہوگا میں ۵ روپے بھی دے گیا تھا۔

(کھڑپنچ) اچھا یہ بات ہے!

بھئی! سچ کہوں؟ دو مسلمان اور ایک ہندو گواہ تیار کئے ہیں ہندو ۵ روپے مانگتا ہے اور مسلمان دو دو للہ روپے اور چار آنے۔

(نادو) واہ! یہ بھی خوب کہی! اجی! انھوں نے عدالت میں اپنا حق رکھا ہے۔ رام رام کہنا اور کلمہ پڑھنا ہے دو حرفی گواہی ہوگی۔ میں تم پر رنا ورنہ یہ تو عدالت ہی میں مل سکتے تھے اور یہ ہندو ۵ روپے کیوں مانگتا ہے؟ کیا مسلمان گواہوں سے وہ کوئی زیادہ گواہی دے گا؟ وہی ایک بات ہے۔

(کھڑ پنچ) ہندو گواہ تو دوکاندار ہے۔ آخر آن کا کچھ حصہ اُسے دوکان سے غیر حاضر رہنا پڑے گا اور مسلمانوں کو تو کوئی کام نہ ہوا۔ ۵ روپے بھی غنیمت ہیں۔ اچھا۔ میں تمہاری خاطر پھر کوشش کروں گا۔ کل صبح خبر لینا۔

نادو رخصت ہوا اور در دولت پر میاں کریم آ حاضر ہوئے۔

(کریم) مولوی صاحب!

خود بدولت کھڑ پنچ محلہ میں مولوی کے نام سے بھی مشہور تھے۔ تسبیح ہمیشہ ہاتھ میں رہتی تھی اور حضرت کی لمبی داڑھی اس خطاب کی ڈگری کے واسطے صحیح سند شمار ہوتی تھی۔

(کھڑ پنچ) میاں کریم! کس طرح آنا ہوا؟

(کریم) اجی مولوی صاحب! آج نیم والی مسجد میں مباحثہ ہوگا۔ آپ کا تشریف لانا ضروری ہے۔

(کھڑ پنچ) کان کھڑے کرکے۔

یہ کیسا مباحثہ ہے!

(کریم) مولوی صاحب چند روز سے آئے ہوئے ہیں ان کا مباحثہ ہے ایک طرف اسی محلہ والے لائیں گے اور ایک بوہڑ دروازے والے مباحثہ یہ ہوگا کہ

گھوڑی کی سویاں کھانی درست ہیں یا ہاتھ کی سویاں۔ زنگی والے مولوی صاحب کا یہ فتوےٰ ہے کہ گھوڑی کی سویاں حرام ہیں اور گڑھی والے جائز قرار دیتے ہیں۔

(کھڑپنچ) یہ تو پرانا مسئلہ ہے۔

تم کس طرف ہو؟

(کریم) میری تو ابھی کوئی رائے قایم نہیں ہوئی۔ کچھ فضول سی بحث ہے اب وقت نہیں ہے کہ مسلمان اس قسم کی بحثوں میں وقت رائگاں گنوائیں آج مسلمانوں کو عام اتفاق کی ضرورت ہے۔

(کھڑپنچ) ضرورت کیوں نہیں؟ شریعت ہر صورت میں مقدم ہے۔

(کریم) میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔ کیا آپ دل سے کہتے ہیں کہ علمائے اسلام کے واسطے یہی کام رہ گیا ہے مسلمانوں کی تمدنی حالت روز بروز گر رہی ہے۔ کوئی عالم فاضل اس طرف تو غور نہیں کرتا۔ ایک دوسرے کو کافر بنانے میں زور لگا رہے ہیں۔

میں تو نہیں جاؤں گا۔

ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ میاں نادو پھر واپس آ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کھڑپنچ خانۂ شریعت میں آئے ہوئے ہیں اس نے آتے ہی خبث سے کہہ ہی تو دیا۔

حضرت دو صد روپے واپس کیجئے اگر گواہ نہیں بنتے ہیں تو نہ سہی ۔ مجھے قادر نے راستہ میں کہا ہے کہ آپ اس کے بھی عہ روپے ہضم کئے بیٹھے ہیں۔ اگر جھوٹے ہی گواہ بنانے ہیں تو میں خود بنالوں گا۔

(کھڑپینچ) ہیں! ہیں! یہ کیا بکتے ہو۔

(نادو) اجی حضرت! روپیہ دو۔

(کریم) چودھری جی! روپیہ کیسا؟

(نادو) میاں! چار گواہ بنانے تھے۔

(کریم) مولوی صاحب! جھوٹے گواہ بھی بنایا کرتے ہو

(نادو) اس کو کس نے مولوی بنایا ہے یہ تو ایک ٹھگ ہے مسٹنڈا۔ ہٹا۔ کٹا۔

(کریم) نعوذ باللہ! توبہ!! توبہ!!!

(نادو) اور تم مولوی کے نام سے یقین لائے ہو اس گلی میں کوئی چالیس مولوی ہیں نہ پڑھے نہ لکھے۔ نام محمد فاضل۔ آج کل مولویوں کا کال ہے۔ جس نے کارڈ پڑھ لیا۔ وہی مولوی ہوگیا۔ جس نے رمضان کے مہینے میں دو چار سورتیں سنادیں وہی قاری۔

(سنتوکھی) سعید! سنا یہ سرگزشت ہے۔ حضرت کی

(کھڑپینچ) آنکھیں لال کرکے،

سنو سنتوکھی! تم صبح ہی سے ہم سے چھیڑ بیٹھے ہو۔ ہمیں بھی تم جانتے ہو کہ کیسے رسائی والے آدمی ہیں۔ اگر بھلا چاہتے ہو تو معافی مانگو۔ ورنہ دو چار ہی دن میں جلاوطنی دہ پڑی ہے۔

(سنتوکھی) معافی تو حضرت سو دفعہ مانگ لیتا ہوں۔ گریہ تو فرمایا ہوتا

کہ کس جرم میں۔ قدر میں تمہاری جانتا ہوں،

رکھڑ پنچ) غصہ سے۔ میری قدر تم کیا جانو؟ مجھے لوگ آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں سے

میں وہ ہوں رند اگر دیر و حرم میں جاؤں
گبر آنکھوں پہ بٹھائیں تو مسلماں سر پر

ناتھ جی! کیا یہ پاجی سر پر ہی چڑھتا جاوے گا؟

(ناتھ) مہاراج! آپ کی نرمی۔ آپ کی بردباری کا یہ نتیجہ ہے ورنہ ایسے دوکانداروں کا کیا حوصلہ؟

اور بھی کچھ سنارات ابرو کے ہاں چوری ہو گئی ہے۔ سب انسپکٹر آیا ہوا ہے۔ تفتیش شروع ہے۔

رکھڑ پنچ) مجھے تو اطلاع نہیں دی۔

(ناتھ) اب چلئے نا۔

ناتھ جی اور کھڑ پنچ دونوں موقعہ واردات پر جا ڈٹے۔ ابراہیم سارجنٹ نے دیکھتے ہی سب انسپکٹر کو کہہ دیا کہ ایک محلہ دار بھی آتے ہیں انہیں بھی تفتیش میں شامل کر لیجئے۔ واشتہ آید بکار۔

(سب انسپکٹر) آپ کا نام کیا ہے؟

رکھڑ پنچ) میں محلہ دار ہوں۔ یہ سنکر آیا ہوں کہ ابرو کے ہاں چوری ہوئی ہے۔ شہد آدمی تو عیال دار ہے یہ کسی بھیدی کا کام ہے۔ ورنہ اس غریب کو کون جانتا ہے؟

(سب انسپکٹر) پھر کچھ بتاؤ۔

رکھڑ پنچ) ذرا میری بات سنئے۔

خود بدولت نے منٹ بھر میں سب انسپکٹر پر کچھ ایسا جادو چلایا کہ کلمہ پڑھتے پڑھتے رام ہی تو ہو گئے۔ حقہ پینے کو دیا۔ اور چارپائی منگوا دی۔ اب کیا تھا، کھڑپنچ کا جادو چل گیا۔ فرماتے کیا ہیں۔ صاحب اس محلہ کے لوگ بلانے چاہئیں۔ یہ کسی ہمسایہ کی شرارت ہے۔

(سب انسپکٹر) سارجنٹ! جنہیں میاں صاحب کہتے ہیں انہیں فوراً بلایا جائے۔

(سارجنٹ) کہو۔ میاں صاحب

(کھڑپنچ) نادر چودہری۔ سعید۔ نعیم۔ سنتوکھی۔ کنسٹبل گیا اور جھٹ پٹ ان لوگوں کو لے آیا۔ انہیں جگہ زمین پر ملی اور خود بدولت چارپائی ہی پر براجتے رہے۔ دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں کہ سب کا چالان ہو رہا ہے

آنے والے حیران ہیں کہ انہیں بلایا ہی کیوں گیا ہے۔ خود بدولت معتبر ہو کر وہاں بیٹھے ہیں۔ سب انسپکٹر نے چپکے سے اشارہ کیا کہ ان لوگوں سے کچھ پوچھو تو سہی۔

(کھڑپنچ) آہستہ سے۔

لالہ سنتوکھی! ذرا ادھر تو آنا۔

(خدا کی شان سانجھ سویرے لالہ سنتوکھی کس رنگ میں ہے اور اب کس حالت میں ہیں)

سنتوکھی) تڑ و بک ہو کر۔ کیا ہے؟

(کھڑپنچ) تھانہ دار بڑا بیٹھا ہے۔ کچھ تجویز کر لو۔

(سنتوکھی) میں کیا تجویز کروں؟ چور نہیں۔ چکار نہیں۔ یہ سب تمہاری

سازش ہے۔

(کھڑ پنچ) غصہ سے آخر پتہ دینا پڑے گا تم بھی ساز باز رکھتے ہو۔

(سب انسپکٹر) دیکھو سنتوکھی سمجھ کر قدم رکھو۔

(کھڑ پنچ) سنتوکھی ۱ روپیہ صد لگتا ہے ورنہ خیر نہیں۔ غریب سنتوکھی بھولا بھالا مجلس کا رنگ دیکھ کر صد روپیہ مان گیا۔ کھڑ پنچ نے ضمانت دی روپے کی پوٹلی آگئی؛ ۵۰ خود رکھ لئے اور ۵۰ تھانہ دار کی نذر ہوئے۔ سنتوکھی نے رخصت پائی اور قسم کھائی کہ کھڑ پنچوں سے بگاڑنا سنو کا گھاٹا ہے۔

کام بننے پر کھڑ پنچ سلام علیکم کرکے اٹھ کھڑے ہوئے ؎

آوارگی نصیب میں ہے اپنے ناصحا

میٹھنگے دل لگا کے کہاں دلربا سے ہم

(ناتھو) استاد! کیسی اچھی تجویز بتائی۔ مٹھی بھی گرم ہوگئی اور دشمن بھی مارا گیا۔

(کھڑ پنچ) خدا کار ساز ہے کم بخت اگر صبح ہی صبح متر لکھاتا تو یہ کیوں ہوتی؟

راستہ میں ایک غریب عورت مل گئی۔

میاں! میاں! تیری بھانجی بیمار ہے نبض تو دیکھنا۔

(کھڑ پنچ) بڑھی! مجھے فرصت نہیں۔

خود بدولت کو دعوے طبابت ہی تھا اگرچہ جانتے بوجھتے کچھ بھی نہیں تھے مگر دوا دارو کرتے ضرور تھے

(ناتھو) آپ طبابت بھی جانتے ہیں؟

(کھڑپنچ) میں کیا نہیں جانتا؟ طبابت تو میرے گھر کی غلام ہے بڑے میاں صاحب اس میں کمال رکھتے تھے۔ بچے کچے ٹوٹکے میں بھی جانتا ہوں۔

(ناتھم) ویدک یا یونانی یا ڈاکٹری؟

(کھڑپنچ) سب ایک ہی ہیں۔ بمصداق۔

وہی بین مینڈکی وہی ساٹھ

ناتھم جی آؤ ذرا قادر بخش کو دیکھتے چلیں۔ یہ بھی ایک اکڑ فوں والا بندہ ہے اسے بھی کچھ سناتے جایئے۔

داشتہ آید بکار

(ناتھم) ہاں ہاں ذرا اس کی بھی خبر لینا۔

قادر بخش دور ہی سے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور دل میں سوچنے لگا کہ آج یہ حضرت کہاں سے اور کیوں آ گئے؟ خداوند کریم اپنی پناہ میں رکھے!

(کھڑپنچ) میاں صاحب! سناؤ کیا حال ہے ایک ضروری خبر دینے آیا ہوں ورنہ تم جانتے ہو۔ مجھے اپنے کاروبار ہی سے فرصت کہاں؟ تم لوگوں سے محبت اور ہمدردی ہے۔ کبھی کبھی آ جاتا ہوں۔

(قادر) کچھ فرمایئے تو سہی۔

(کھڑپنچ) آج صاحب سیشن مجسٹریٹ نے بلا کر پوچھا تھا قادر بخش کی نسبت کچھ شکایات سنی جاتی ہیں اُسے کمیٹی کا ممبر نہیں ہونا چاہیے۔

میں تو یہ سنکر ہکا بکا بھی رہ گیا قادر بخش اور یہ کیفیت! جو کچھ میرے دل میں آئی میں نے کہی۔ خفا تو ہو گئے۔ لیکن مسنا

سب کچھ دیا- یہ بات کیا ہے- دشمن وار کرنے سے ٹلتے نہیں- کیوں ناتھ جی! صاحب بہادر کو کیسا ٹھنڈا کیا اور پھر کس حکمت سے-

(ناتھ) سبحان اللہ! یہ آپ ہی کا کام تھا ورنہ صاحب بہادر تو آگ بگولا ہو رہے تھے- خدا کی پناہ! ان چٹے منہ والوں کا غصہ بھی کیا بلا ہوتا ہے-

(قادر) میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا- کل تو میں انہیں مل کر آیا ہوں مجھ سے تو کوئی ذکر نہیں آیا-

(کھڑپنچ) زور سے-

میں تو اس سے چند روز پہلے کی بات کرتا ہوں ٹھنڈا تو میں کر ہی آیا تھا- تمہیں کیا کہتے-

ناتھ قادر کی گفتگو سے بھانپ گیا کہ راز کھلنے کو ہے چپکے سے کھسک گیا تاکہ مزید پوچھ گچھ نہ ہو-

کھڑپنچ بھی سلام علیکم کرکے رخصت ہوئے-

(ناتھ) مہاراج! قادر کو خوب پہنچا آخر پرانا گرمچھ ہے فوراً ہی بھانپ گیا-

(کھڑپنچ) واہ! تم بھی تو بڑے تھڑ دلے ہو- ابھی دو چار روز خوانیں کسی پچھلی تاریخ کی دلا دیتا ہوں- سٹی مجسٹریٹ کی عقل و فراست بھی چکرا جائے گی- یہ ہے ہی کیا؛ اب تو قادر سے بدلا لینا ہوا-

(ناتھ) بات تو تب ہی ہے-

(کھڑپنچ) اس کم بخت نے ہمیں منتری سمجھا اور جھٹ اعتراض کر دیا نخشی کا دودھ نہ اگلوا دوں تو کہنا- یہ بھی کوئی بات ہے-

گھر میں آ کر خود ہی دو تین شکایتی عرضیاں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں لکھی اور ڈاک میں ڈلوا دیں۔ کوئی چوتھے روز ڈسٹی مجسٹریٹ نے میاں قادر بخش کو بنچ کی کوٹھی پر بلایا اور درخواستوں کی بابت پوچھا۔

(صاحب) ویل! یہ کیا بات ہے؟

(قادر) حضور میں کیا جانوں۔ پرسوں کھڑپنچ آیا تھا اُس کی زبانی سنا تھا کہ حضور مجھ پر ناراض ہیں۔

(صاحب) ویل! کھڑپنچ کون؟

(قادر) حضور! وہی چوہدری چوہڑ خاں۔

(صاحب) وہ تو کوئی ایک سال سے ہمیں نہیں ملا ہے۔ وہ بڑا بدمعاش ہے۔ ہم سمجھ گیا رخصت۔

کھڑپنچ کو بھی خبر لگ گئی کیونکہ وابستگان کچہری سے اُسکی گانٹھ سانٹھ تھی۔ صبر کیسے ہو؟ دوسرے ہی روز فوراً ہی تو صاحب بہادر کی کوٹھی کو گئے اردلی کی مٹھی گرم کی اور اندر سے بلاوا آ گیا۔

(صاحب) ویل! چوہڑ خاں! تم کیسے آیا؟ قادر بخش تمہاری شکایت کرتا ہے ہم نے کب تمہیں اُس کی نسبت شکایت دیا؟

(کھڑپنچ) چھت کی طرف منہ کر کے۔ کچھ وقفہ کے بعد۔
حضور! کون سے قادر بخش؟

(صاحب) ویل! چوڑی مہری والا۔

(کھڑپنچ) آج دس روز ہوئے ہیں کہ یہ شخص میرے پاس آیا تھا اس غرض سے کہ میں محلہ داران سے اُس کی صفائی کرا دوں۔ کوشش بہت کی۔ مگر لوگوں نے نہ مانا۔

(صاحب) کیا جھگڑا تھا؟

(کھڑ پنچ) کیا بتاؤں ہم ویسی جو ہوئے طمع خراب کرتی ہے۔ بہتیرا سمجھایا سمجھتا نہیں۔ ؏

طمع را سہ حرف است وہر سہ تہی

بڑا کھانے والا ہے۔ گلی کوچہ میں شور غل ہے کبھی حضور شہر والوں سے پوچھنا تو سہی۔ ساری بات کھل جائے گی۔ یہ بھی کوئی چیز ہے۔

(صاحب) اچھا سلام!

(ناتھ) صاحب بہادر نے کیا کہا؟

(کھڑ پنچ) کیا کہنا تھا۔ بیچارہ منتظر ہی تھا۔ سر وقدًا ٹھ کھڑا ہوا ہاتھ دیا۔ مزاج پوچھا اپنے ہاتھ سے چوکی دی۔ بھائی صاحب اور والد صاحب کا حال پوچھتا رہا۔ والدہ کی وفات کا افسوس کیا۔ بہت شریف انگریز ہے ایسے ہی انگریزوں سے حکومت چل رہی ہے۔

(ناتھ) قادر بخش کی بابت بھی کوئی بات چیت ہوئی۔

(کھڑ پنچ) ہنس کر۔

ایک بات؟ گھنٹہ بھر اسی کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچا چٹھا کھول کر سنا آیا ہوں۔ خدا نے چاہا تو اب کے ہیری و میری بھسم ہو جائے گی ہم سے اَڑ انگانا اور پھر عزت پانا ؏

ایں خیال است و محال است و جنوں

(ناتھ) قادر بخش کا دوسرا جوڑی دار بھی دیکھا ہے؟

(کھڑ پنچ) کون؟ گلزاری لال؟

(ناتھ) ہاں!

(کھڑپنچ) اس کی بھی فکر میں ہوں۔ دو تین مقدمات میں جھوٹی گواہی
دے چکا ہوں آئندہ بھی وقت کا منتظر ہوں۔
ایسی ٹھوکر دو نگا کر سسرے کو نانی یاد آ جائے گی۔
یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے گلزاری لال بھی آ گیا ناتھ اور
کھڑپنچ نے جھک کر سلام کیا۔ مزاج پوچھا۔
(گلزاری لال) کہو کھڑپنچ! آج کل کوئی مرغی زبردست ہے؟
(کھڑپنچ) مہاراج! اب تو نظر آپ ہی پر ہے تاور بخش تو جیتنی ہوا
چاہتا ہے۔
(گلزاری لال) دیکھنا! کہیں خود ہی مرتبہ نہ ہو جانا۔
(کھڑپنچ) سنو! لالہ! میرے مقابلہ میں ایسی گفتگو! اپنی حیثیت دیکھو۔
میں کون؟ اور تم کون؟ ع
چہ نسبت خاک را با عالم پاک
کم بخت ناتھ سے نہ رہا گیا۔ جھٹ ہی گلزاری کی پگڑی اتار دی۔ کھڑپنچ
نے دیکھا کہ معاملہ بڑھ گیا جھٹ پگڑی زمین سے اٹھا ادب کے ساتھ گلزاری لال
کے سر پر رکھی اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ مہاراج! یہ بے وقوف آدمی ہے۔ نہ
میرا واقف۔ نہ آپ کا واقف۔ معلوم نہیں اس کم بخت کو کیا سوجھی۔
ناتھ نے بھی رخ بدلا دیکھ کر منت سماجت سے گلزاری کے چرن پکڑ
لئے اور معافی مانگی۔
غریب گلزاری حیران و پریشان۔ پگڑی سر پر رکھ چلتے ہوئے۔ کسے
گواہ بنائیں اور کسے شہادت میں طلب کرائیں۔

ـــــہ

گلزارِ محبت سے کبھی خوش نہیں ہوتے
وہ کہتے ہیں ہم ناک میں ہے بوئے وفا سے

(کھڑ پنچ) واہ! ناتھ جی! آج تو عزت رکھ لی۔ خوب لگائی لپک جھپک پھرتی شتابکاری اسی کا نام ہے۔

(ناتھ) آخر آپ کا شاگرد ہوں۔ کہیں نالش نہ کر دے۔ ہے یہ بھی بری بلا۔

(کھڑ پنچ) مرغی کی بانگ کون سنتا ہے۔ میرے سامنے کس کی چلتی ہے؟

(شہامت) چودھری چوہڑ خاں! تمہاری ساری عمر انہیں ہتھکنڈوں میں گزر گئی۔ آخر خدا کو جان دینی ہے۔ کب تک یہ داؤ گھات چلیں گے؟

(کھڑ پنچ) غضب ناک آنکھوں سے۔ تیور بدل کر۔

شہامت! تم کیا جانو؟ دنیا کے کام یوں ہی چلا کرتے ہیں۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے سوائے پالسی کے دنیا میں گزارہ ہی کب چل سکتا ہے؟ تم نے بھی خوب مزے کی بات کہی۔

(شہامت) اچھا تمہاری مرضی۔ تمہاری ڈاڑھیوں۔ تمہاری تسبیحوں۔ تمہارے مصلوں۔ تمہارے فیشن اور تمہاری تہذیب پر کیا اعتبار کیا جائے؟ تمہاری زندگی بھی گرگٹ ہے۔ ہر لمحہ رنگ بدلتی ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

(کھڑ پنچ) یاد رکھو۔ گلزاری کا حال دیکھ لیا۔ تمہاری بھی پھر کبھی کیا لگتے ہاتھ نکال دونگا۔ ناعاقبت اندیشی!

ہمارے ساتھ ایسی بات! چیت سمجھ اور سوچ!
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں!

(ناتھ) مہاراج جانے ہی دیجئے، ایسے لوگوں سے بات کرنا بھی اُنکی عزت بڑھانا ہے۔ یہ لوگ دنیا کی باتیں کیا جانیں؟

چہ داند بوزنہ لذات ادرک؟

قبلہ! اگر اب سنتو کھی معافی مانگے اور آپ کے چرن پکڑے تو کوئی صفائی ہو سکتی ہے؟

(کھڑ پنچ) احمق!

"ہاتھی کے دانت نکلے ہوئے بیٹھنے مشکل ہیں"

تیر چھوٹا ہوا کبھی کمان میں واپس آ سکتا ہے۔

(شہامت) غرور آخر شکست کھاتا ہے بڑا ماتھا پھوٹتا ہے گو تم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور گو تمہاری کھوپری افلاطونی کھوپری ہے لیکن مشیت ایزدی سے تمہیں بھی گریز نہیں۔ وقت تمہارے انتظار میں ہے۔ ان روباہ بازیوں اور ان خرمستیوں سے کب تک کامیاب رہوگے؟ یاد رکھو قدرت کا ایک ہی ہاتھ سارا معاملہ ختم کر دیگا۔

(کھڑ پنچ) ان نخروں تلّوں پر میں ایمان لا چکا۔ تمہاری باتیں میاں شہامت! محض نخل موم ہیں۔ آتش حمیت کے سامنے اُنہیں بقا نہیں چاہیے چاہئے۔

نسوے بہائیے نہ میرے آکے سامنے

یہ نخرے کیجئے۔ میاں! جورو کے سامنے

(ناتھ) چلو میاں صاحب ان لوگوں کی کیا سنتے ہو۔

میاں شہامت ہوش کرو! "تم بھی ہاتھی کے ساتھ گنے" چوستے رہو۔

چودھری چوہڑ خاں کا اقبال دیکھو اور اپنی ننھی سی ہستی خدائی فوجدار اور ہوائی مجسٹریٹ اگر کہیں سن پائیں تو مزا چکھا دیں۔

(شہامت) تم ایسوں ہی نے تو خود بدولت کی مٹی خراب کی ہے۔
سچ ہے زبردست کے خوشامدی سب سے اوّل دوزخ کا ایندھن بنتے ہیں۔ اگرچہ آج ان کی دھاک بندھی ہوئی ہے مگر یقین رکھو کل تم ہی انکے دشمن ہو گے۔

انگریزی راج میں ایسے لوگ ذرا دیر سے پکڑے جاتے ہیں۔ مگر جب گرفت ہوتی ہے تو ایسی سخت کہ خدا کی پناہ ع

دیر گیر و سخت گیر د مر ترا

شہامت کا سلسلہ گفتگو ابھی بند نہ ہوا تھا کہ ایک عورت روتی چلاتی کھڑپنچ کے قدموں پر آ گری۔

(عورت) میاں! میرا بیٹا ایک عورت نکال کر لایا ہوا ہے۔ اب پولیس دروازے پر آ ڈٹی ہے کوئی تجویز کرو۔ یہ عـہ روپے حاضر ہیں۔

(کھڑپنچ) یہ رقم تھوڑی ہے۔ کام بڑا ہے۔ خیر منظور ہے۔ مغویہ عورت کو میرے گھر بھیج دو۔ میں چھپا رکھونگا۔ دیر نہ کرو ابھی بھیج دو۔

(عورت) خوشی خوشی۔

خدا سلامت رکھے۔!

(کھڑپنچ) ہنس کر۔ ہمارا وجود بھی اس شہر میں غنیمت ہے۔ آخر ہم بھی کچھ ہیں۔

(ناظم) میاں جی! عورت مغویہ کہاں رہے گی۔؟
(کھڑپنچ) کم بخت! کیا پوچھتے ہو ہمارے پاس رہیگی۔

(ناتھ) اگر کسی پولس والے نے سراغ لگا لیا اور پوچھا تو بہتر؟

(کھڑپنچ) چشم ما بسیار ایں خواب پریشاں دیدہ است

ناتھ۔ اب تو یہ کوشش ہے کہ پراونشل کرسی مل جائے خطاب خان صاحب کے واسطے سفارش تو امسال ہو ہی جائے گی۔

(ناتھ) اور قبلہ! اگر یہ ہماری تمہاری کرتوتیں معلوم ہو گئیں تو پھر؟

(کھڑپنچ) یہ بھی کوئی بات ہے۔

میرا بار بار کلمہ پڑھنا اور تیرا رام رام رٹنا تھوڑی ضمانت ہے۔ لمبی داڑھی اور لمبا فرغل اس پر مزید کفالت! دیکھو میں دن میں کتنی دفعہ لاحول پڑھتا ہوں۔ کتنی دفعہ چشم پرآب ہو جاتا ہوں۔ یہ میرے اور تیرے محافظ ہیں۔ جب میں چھاتی پر ہاتھ رکھ کر ملتا اور سلام کرتا ہوں تو اپنے اعمال کا کفارہ کرتا ہوں۔

یہی انداز تو ہیں دل کے اڑانے کے لئے
میری تم نیچی نگاہوں پہ نہ جانا ہرگز

حکام کو اپنی پاک باطنی صداقت کا ایسا یقین دلا چھوڑا ہے کہ کسی اور کا جادو کیا چلے گا۔ تم میرے ساتھ رہو تمہیں بھی اپنا سا بنا چھوڑوں گا۔ جہاں جاؤ میری تعریف کے گن گاؤ۔ شاباش میرے شاگردو! بیٹھو! سے

قاتل نمک لگا میرے دل کے کباب کو
مرچیں لگیں گی حاسدِ خانہ خراب کو

سلطان احمد۔ از بہاول پور

قدیم مصر کا نظارہ

کچھ عرصہ گذرا مصر کے مشہور عربی اخبار المؤید کے کارخانہ والوں نے قدیم مصری تاریخ پر ایک قصہ بنام وردہ شائع کیا ہے۔ دراصل یہ ایک جرمن ناول کا ترجمہ ہے، اور جرمنی کے مشہور پروفیسر زبانِ ھرا گلافی (قدیم مصری زبان) ڈاکٹر جارج ایبرس اس کے مؤلف ہیں۔

میں وردہ کے پہلے باب کا کچھ حصہ مع دیباچہ مترجم عربی مخزن میں شائع کرنے کی غرض سے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ اگر ناظرین کو پسند آگیا تو انشاءاللہ اس کا بقیہ حصہ بھی روانہ کروں گا۔

خادم العلما۔

محمد بدیع الدین الفاروقی شاگرد استاد

مولانا محمد حسین آزاد دہلوی مرحوم

——— از مدراس

ناظرین مخزن کو شاید یہ معلوم ہو گا کہ سب سے پہلے تہذیب انسانی نے وادئ نیل کے کنارے پر کے اُن عظیم الشان محلوں ہی میں جنم لیا۔ جہاں فراعنہ رہتے تھے۔ ان ماماؤں کے ماروں نے اسے پوتڑوں میں پالا، گودیوں میں کھلایا، ساتھ ساتھ لئے پھرے، آخر پروان پڑھے

کے دن آئے۔ چار طرف سے اس چاند کے ٹکڑے پر بدنگاہیاں ہونے لگیں ہندوستان کے مہاراجے، ایران کے تاجدار، یونان کے شہریار ڈورے ڈالنے لگے۔ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ماں باپ کا سایہ بھی سر پر سے اٹھ گیا اور ادھر پری کو دیوے اڑے۔ چندے مہارانی بن کر رہنا پڑا۔ ایران میں شہر بانو کا لقب ملا۔ پھر یونانیوں نے اپنا گھر بسایا۔ آخر عربوں نے کلمہ پڑھایا۔ وہ کہاں رہی جو اسکے یہاں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس گھر سے بھی نکل بھاگی، یوروپ میں نئے یاروں سے رشتہ گانٹھا۔ یہ بھی اس طرار پر نثار ہو گئے اور اسے سوبلیمایشن کے خطاب سے مخاطب کیا۔ آئندہ خدا معلوم اب کون آتے اور کدھر اڑا لے جائے۔

اس تحقیق کا انجام دینا قبطیوں کا فرض تھا جو فراعنہ کی زندہ یادگاریں ہیں مگر ان قبطیوں نے تو مذہب کے ساتھ آبائی زبان بھی کھو ڈالی۔ تحقیق کریں گے کیا خاک، صرف فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں کہ ہم فرعون ابن فرعون ہیں۔ اس فرعون بے سامان بننے سے حاصل؛ مسلمانوں کو بھی اس امانت سے بری الذمہ ہونا واجب تھا جو دیانت کے ساتھ اس کو یوروپ پہنچانے والے ہیں، لیکن انہیں اور ضروری شغلوں سے کب فرصت جو اس لایعنے کام کی جانب متوجہ ہوں۔ آخر یوروپ والے ہی اس پتہ کو پتال سے نکالنے لگے۔ یہ مضمون جو میں آج پیش کر رہا ہوں اس تلاش و کاوش کا نتیجہ ہے۔ جرمنی کے ایک زبردست قلم سے ٹپکا اور مصر کے راستہ سے ہو کر اب ہندوستان پہنچا ہے۔ پہلے میں عربی مترجم کا دیباچہ لکھونگا کہ ناظرین کو ناول اور اس کے مولف کا کچھ سرسری حال معلوم ہو جائے پھر اصل مضمون تحریر کروں گا۔ عربی مترجم صاحب اس طرح

اپنا دیباچہ شروع فرماتے ہیں۔

مصر کی قدیم زبان مردہ، اور اس کے حروف نیچرل ہسٹری کے سارے جانور، پڑھنے پڑھانے والے کم۔ اب کوئی پڑھے تو کیا پڑھے اور سمجھے تو کیا خاک سمجھے؛ ہاں البتہ یوروپ میں چند خدا کے بندے اس دھندے میں لگے ہیں۔ ان میں سے فرانس کے مشہور پروفیسر مسیو ماسپرو کو خاص امتیاز حاصل ہے اور جرمنی کے لایق ڈاکٹر جارج ایبرس بھی اس باب میں مسیو ماسپرو سے کچھ کم نہیں۔

۱۸۶۲ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب مصر میں وارد ہوئے۔ اس لئے نہیں کہ اس پر فضا ملک کی خوشگوار ہواؤں اور اس کے خوشنما منظروں سے محظوظ ہوں بلکہ اس واسطے کہ یہاں کے قدیم کھنڈرات میں جستجو کر کے کوئی نئی بات پیدا کریں۔ چنانچہ انہوں نے سارا جاڑوں کا موسم قدیم شہر "طیبہ" پایہ تخت فراعنہ اولین کے ویرانوں کے اندر فراعنہ کی قبریں کھودنے میں گذار دیا ان قبروں میں انہیں بہت سی قدیم یادگاریں اور بہت سی تحریریں جو بہتیرے تاریخی حقائق پر روشنی ڈالتی ہیں ہاتھ لگیں اب انہیں خیال ہوا کہ ان واقعات کو جو ان قدیم یادگاروں اور تحریروں سے حاصل ہوئے تھے ایک ایسے عشقیہ ناول کے قالب میں ڈھال دیا جائے جو کیا باعتبار لطف قصہ کے اور کیا بہ لحاظ لغت فائدہ کے اور کیا بہ حیثیت برجستگی عبارت کے، اپنی نظیر آپ ہو۔ اگرچہ یہ ایک نہایت ہی بھاری کام تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کو بخوبی ادا کیا۔ وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک مشہور فلاسفر ہونے کے علاوہ جرمنی زبان کے لایق بلیغ البیان فصیح اللسان شاعر بھی ہیں چنانچہ اس امر نے آپ پہ یہ مشکل حل کر دی۔

ناول کا مضمون، اُس کے اشخاص کے اسماء اور اس کا پلاٹ مصر ہی میں ڈاکٹر صاحب کے خیال میں جم چکا تھا صرف اس پر تحریر کا رنگ چڑھنا باقی تھا۔ اور یہ بات جرمنی میں واپس جانے پر اٹھا رکھی تھی۔ مگر جب وہ وطن پہنچے اس وقت انکے جسم میں ضعف اور قوے میں اضمحلال پیدا تھا۔ ڈاکٹروں نے دماغی محنت سے منع کر دیا۔ چنانچہ آپ برابر تین برس بیکار بیٹھے رہے۔ اس مدت میں اگر کوئی چیز ان کے دل و دماغ پر جلوہ گری کر رہی تھی تو وہ گل اندام، پری تمثال، حور وش "وسادہ" کے حسن و جمال کا سین رسمان تھا۔ جسے انھوں نے ناول نویسوں کی عادت کے مطابق، جو ایک شخص کو اپنے قصہ کا رکن اعظم ٹھیرا کر قصہ کے سارے واقعات کو اس کی جانب منسوب کر دیا کرتے ہیں جس کو آج کل کے مصنف قصہ کا "ہیروؔ" کہتے ہیں، اپنے ناول کا ہیرو بنا دیا۔

۱۸۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب کی صحت پھر بحال ہو گئی اور وہ ناول لکھنے بیٹھے اس کام کے لئے انھوں نے ایسے مقام میں سکونت اختیار کی جو اپنی نیچرل سرسبزی، اپنے سدا بہار فطرتی پر فضا گلزاروں، قدرتی قد آور درختوں اور طبعی آبشاروں کے لئے جرمنی بھر میں مشہور و معروف ہے، وہ ان منظروں کی کیفیت سے مدد حاصل کر کے اس ناول "وسادہ" کو زیب قرطاس کرنے لگے جو اپنے مطالعہ کرنے والوں کو آج سے پچاس صدی پیچھے لے جاتا اور ان کا ہاتھ پکڑ کے اسکندریہ سے دریائے نیل کے قدرتی آبشاروں تک

؎ جدید عربی زبان میں ہیرو کو بطل الروایۃ کہتے ہیں ۱۲

پھیلے ہوئے مصر کے اس عہد کے کل جزو وکل حالات کی سیر کرتا، پیشوایان مذہب کے اعمال و عبادات اور انکے معتقدات سے واقف بناتا، طوق وزنجیر میں گرفتار قیدیوں کو اپنے آگے لئے ہوئے دشمن کے ملک سے واپس آتے والی فتحمند افواج کے استقبال کی دھوم دھام کو دکھلاتا، محلوں میں بیٹھی گاتے اور ناچنے والیوں اور ریگستان میں رہنے والی ساحرہ عورتوں کے طلسم وجادو کے منظروں کو زیر نظر کرتا، فلسفہ، طب، شاعری، علم ادب اور دیگر کارآمد فنوں کے علماء کی اعلےٰ دستگاہ ظاہر کرتا اور یہ دکھلاتا کہ کس طرح شاہنشاہان مصر فراعنہ اولین جنگ میں لڑتے اور ملکداری کرتے۔ اور حزم واحتیاط، غور وخوض کو، جس کے باعث ایک شاہنشاہ۔ رعمسیس اعظم" نے ایک عہدہ دار کی نیت کو دریافت کرنے کے لئے اپنا سارا دن کھپا دیا تھا، اپنا دستور العمل سمجھتے تھے، اور دیگر ان جملہ امور کو ظاہر کرتا ہے جو ایک بہت ہی بے نظیر اعلےٰ درجہ تہذیب و تمدن پر پہنچے ہوئے عظیم الشان قوم کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے قبضۂ قدرت میں خطِ استوا سے لے کر حدود ایران تک کے ایشیا اور افریقہ دونوں اقلیموں کے بسنے والے انسانوں کی گردنیں مقبوض تھیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ناظرین جب ان تمام حالات کو جان جائیں گے اور زمانۂ ماضی کا موجودہ زمانہ سے مقابلہ کریں گے اور پھر ان دونوں عہدوں کی ترقی وتنزل اور تقدم وتاخر کے باہمی بُعد مسافت کو پہچان لیں گے تب ضرور بول اٹھیں گے کیا اچھا ہوتا کہ ہم بھی ان لوگوں کے زمانہ میں ہوتے جن کی ہڈیاں اب بوسیدہ

ہوگئی ہیں اور جو آج اپنے آثارِ کہنہ کی زبان سے کہہ سکتے کہ

سے تلك آثار نا تدل علینا + فانظر وا لبعد نا الی الآثار

اس دیباچہ کے بعد اصل ناول اسطرح شروع ہوتا ہے۔

پہلا باب

۲۵۰ء قبل ولادت مسیح ع کی ایک جاڑوں کی رات میں شہر طیبہ کی حالت۔

سو پھاٹکوں والے شہر طیبہ کے قریب میں نہر نیل دو بہت ہی اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان سے، جن کی بلند چوٹیوں اور جھکی ہوئی چٹانوں کا عکس اس کے نقرئی پانی میں پڑ رہا ہے، گزر رہی ہے۔ اور اس وادی کے وسط میں جسے یہ دونوں پہاڑ گھیرے ہوئے ہیں اس کی اٹھلاتی روانی ٹھیک ایک دلہن کی اس قیامت خیز

سلہ یہ ہماری یادگاریں ہیں جو ہمیں ظاہر کر رہی ہیں اس لئے اے لوگو! تم ہمارے بعد ہمارے ان آثار و یادگارات ہی کو دیکھا کرو ۱۲۔ فاروقی۔ ٹلہ یہ تشبیہ یوروپین طریقۂ شاعری کے مطابق ہے ۱۲ فاروقی

رفتار کا سماں پیش نظر کر رہی ہے جو وہ شب عروسی کو اپنے کم سن گل اندام ساتھ والیوں کے درمیان کیا کرتی ہے۔

اور جبل مشرق کے قریب سے ایک ریگستان اس مقام تک کہ جسکے کناروں کو بحر احمر کی موجیں تھپیڑے دے رہی ہیں پھیلتا چلا گیا ہے، اور جبل مغرب کے پیچھے سے مختلف بنجر میدان، کہ جن پر روئیدگی کا کچھ نام و نشان بھی نہیں ہے۔ حد نظر کی درازی تک اپنا دامن وسیع کئے ہوتے ہیں، اور ان دو ننگا ہواؤں کے بیچوں بیچ جو ریگستان کے بالو کو یہاں تک پہنچنے نہیں دیتے۔ دریائے نیل کا پانی جو فی الحقیقت زر خالص ہے سرسبزی اور شادابی کے عناصر اور بے انتہا خیر و برکت کو جسپر ہزارہا انسانوں کی زندگی موقوف ہے اپنے ذرات میں لئے ہوئے بہ رہا ہے۔

اور اس دریا کے دائیں اور بائیں دونوں کناروں پر زمین کے دو مسطح تختے جو ان کناروں ہی سے شروع ہوتے ہیں، جنہیں نیچر نے اپنے ہاتھوں سے ہموار کیا ہے، پھیلے ہوئے ہیں اور دریا کے خوشگوار پانی میں جو عذوبت و لطافت ہیں آب فرات کو مات کر رہا ہے، سمندر کے مختلف الاشکال اور مختلف الانواع حیوانات ادہر ادہر پھر رہے ہیں جنمیں سے ڈراؤنی شکل والے گرمچھ نے تو ہمیشہ اپنا منہ پھاڑ رکھا ہے اور جنگلی کھجور کے درختوں پر پرندوں نے اپنے آشیانے بنا رکھے ہیں جن میں بیٹھ کر اطراف و اکناف کی فضا کو اپنے خوش آیند نغموں سے معمور کر رہے ہیں۔ کنارے کے دونوں مسطح تختوں پر مزروعات، نرم نرم روئیدگی کے گچھے اپنے گانٹھ دار ڈنٹھلوں پر لئے لہرا رہے ہیں انکے باہمی اتصال سے دور کے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سبز مخمل کا فرش ہے کہ نظر کی انتہا تک بچھتا چلا گیا

ہے۔ اور مختلف جگہوں پر اشجار جھیتا کے نیچے جن کے سایہ میں جسم کو خنک پانی کی سی برودت وترا بت جو دل کو مسرور آنکھوں کو پر نور اور غم کو دور کر دیتی ہے، محسوس ہوا کرتی ہے، اچھل کود کرنے والے گوسالے کلیلیں کر رہے ہیں۔

چودھویں صدی قبل میلادی میں جو انسان ان جادو کا سا اثر ڈالنے والے منظروں کو شہر طیبہ پایہ تخت ممالک فراعنہ[1] اولین کے حوالی میں دیکھتا وہ فراعنہ کی ان پوری توجہات پر جو وہ اس ملک کی جانب رکھتے تھے۔ بھچک رہ جاتا۔ بات یہ تھی کہ یہ شاہنشاہ اس شہر کو نہایت پیار کرتے تھے۔ انھوں نے شہر اور دریائے نیل کے درمیان مضبوط بندھ بندھوا دیا تھا۔ کہ سیلاب کے دنوں میں اگر دریا میں طغیانی ہو تو شہر کو اس آفت آسمانی سے کچھ صدمہ نہ پہنچنے پائے۔ شہر چند محلّوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ پہلا محلّہ جو دریا کے بندھ کے قریب تھا۔ خوب صورت خوب صورت معبدوں اور ہیکلوں کے لئے خاص تھا۔ دوسرا شاہنشاہوں کے فلک شکوہ محلوں اور امراء کی عالیشان عمارتوں کے لئے مخصوص تھا اور تیسرا محلّہ عام باشندگان شہر کے مکانات کے واسطے مقرر تھا۔ ان تینوں محلوں میں

[1] فراعنہ فرعون کی عربی جمع ہے مگر خود فرعون اگلی مصری زبان کا لفظ ہے۔ اصل اس کی "بر ایا" ہے جس کے معنے ہیں "باب عالی" قدیم زمانوں میں یہ لفظ محل شاہی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ پھر خود بخود اس میں پادشاہ کے معنے پیدا ہو گئے اور بعد میں رفتہ رفتہ فرعون بن گیا ۱۲ فاروقی۔

ہمیشہ نیل کا پانی بصد آب و تاب چھوٹی چھوٹی نہروں میں ہو کر کہ جن کی شاخوں کے وصف اور شمار عدد میں عقل حیران رہ جاتی تھی بہتا رہتا تھا۔ اور رستے جن پر یہ عالیشان عمارتیں اور سر بہ فلک شاہی محل تعمیر تھے کبھی بھی آدمیوں کی آمد و رفت سے خالی نہ رہتے تھے۔ اور یہ دائمی حرکت اس بات کی دلیل تھی کہ اس خوشنما شہر میں مدنیت و تہذیب کے اسباب و وسائل کثرت سے مہیا ہیں۔

شہر طیبہ کے مقابل نیل کے مغربی کنارے پر بہت سے عالیشان محل جو ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلہ پر تعمیر ہوئے ہیں، واقع ہیں، اور ان میں سے ہر ایک محل کو چند ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے اسی طرح گھیرے ہوئے ہیں جس طرح بچے اپنی ماؤں کو گھیرے رہتے ہیں۔ اگر کوئی جبل مغرب کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ان پر نظر دوڑاتا تو اس کو یہی معلوم ہوتا کہ امراء اور اہل ثروت کے محل جو مزارعین کے جھونپڑوں کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہیں، یا کوئی میدان کی جانب سے انہیں مشاہدہ کرتا تو اسے یہی دکھائی دیتا کہ متعدد پھاٹک ہیں کہ خطوط مستقیمہ متوازیہ پر ایک دوسرے سے لگے ہوئے چلے گئے ہیں۔ غرض مکانات کا وضع قطع راستوں کی وضع اور باشندوں کے حرکات و سکنات، سب کے سب شہر طیبہ کی قطع اور اس کے راستوں کی وضع اور وہاں کے باشندوں کے نقل و حرکت غرض ہر ایک بات سے بالکل مغایر ہے۔ وہاں طیبہ میں ایک عام رونق اور شگفتگی کا سماں بندھا ہوا ہے، وہ اپنی اپنی ضرورتوں کے لئے لوگوں کا ادھر ادھر پڑے پھرنا، وہ مختلف پیشہ وروں کا ہر طرف چلتے پھرتے نظر آنا، وہ کاروبار کی کثرت، وہ ہنسی ٹھٹھا، وہ راگ رنگ، وہ اسباب تمدن کا بافراط موجود

ہوتا، وہ ہر طرح کے وسائل آرام و آسائش کا از حد پایا جانا، یہ سب ایسی باتیں ہیں جو دل کو سرور اور خیالات میں اطمینان پیدا کرتی ہیں۔ مگر یہاں برخلاف اس کے ویرانی اور بے ربطی اور کم معموریت پائی جاتی ہے جس سے سارے شہر پر ایک عام نحوست کا سماں سا چھا رہا ہے جو انسانی طبیعت کو نہایت ہی کامیابی کے ساتھ متنفر کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہی باعث ہے کہ جس سے اول الذکر حصۂ شہر کو "زندوں کا طیبہ" اور اس ثانی الذکر کو "مُردوں کا طیبہ" کہا گیا ہے۔

یوں تو مُردوں کے طیبہ پر ایک غمناک سکون چھایا ہوا ہے تاہم کوئی لحظہ ایسا نہیں گزرتا جس میں دور دور تک گونج پیدا کر دینے والے نغموں کی آواز گوش زد نہ ہوتی ہو، اور ایسے سینکڑوں بجرے جو ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ہوں، جن پر نظر کر دہ لینے والی گلکاری اور آرائش کی گئی ہو اور جو بڑی ہی سوگوارانہ وضع سے جبل مغرب کا رخ کئے چلے جاتے ہوں، دریا میں ہر طرف نظر آ جاتے ہوں۔ دراصل وہ نغمے مردوں کے پس ماندگان کی آہ وزاری کی آوازیں ہیں، اور یہ کشتیاں، وہ کشتیاں ہیں جو مردوں کو اس مقام کی طرف لے جایا کرتی ہیں ۔ جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو آنکھوں سے پوشیدہ کر دئیے جاتے ہیں۔ سچ ہے کہ مردوں کے طیبہ کا منظر طبیعت کو غمناک اور دل کو مایوس و حزین کر دیتا ہے کیونکہ خاموشی ہمیشہ کے لئے اس پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہے۔ تاہم وہ مردوں کے تجہیز و تکفین اور انکے ضروری رسوم سے خاص تعلق رکھنے والی اشیاء کی تجارت کی چہل پہل سے خالی نہیں ازمنۂ گزشتہ میں اہل مصر موت کو بھی ایک طرح کی زندگی سمجھتے تھے۔

اور مردوں کو یقینی طور پر زندہ جانتے تھے۔

جب کوئی ان کا عزیز یا رشتہ دار مر جاتا تو یہ لوگ اُس کی نعش مردوں کے طبیب کو لے جاتے پھر بڑے ہی صبر کے ساتھ اُس کو محنطؔ[1] کے حوالہ کر دیا کرتے۔ جب وہ ہر طرح کے فساد سے محفوظ رکھنے والے مصالح لگا دیتا۔ تب وہ اُسے دریائے نیل کے کنارے لے جاتے اور یہاں سے اُس دخمہ[2] میں لا رکھتے جو جبل مغرب میں اس میت کے لئے تیار رہتا اور سارے رسوم تدفین ادا کر کے اپنے مکانوں کو واپس چلے آتے۔ مگر پختہ طور پر یہ اعتقاد انکے دلوں میں جاگزین رہتا کہ اگرچہ ہمارے اس عزیز کے جسم سے روح زائل ہو گئی ہے تاہم وہ ایسا ہی زندہ ہے جیسا کہ موت سے پیشتر تھا لہذا ضرور وہ کوشش کر کے عنقریب ہی اپنے آپ کو متعدد شکلوں اور مختلف صورتوں میں منتقل کر دے گا یا اوزریس کی طلبی کو قبول کر کے اسکے حضور میں جا پہنچے گا اور آفتاب کی کشتی میں سوار ہو کر اس کے ہمراہ رہیگا یا زمین پر اتر پڑے گا اور اجسام کائنات میں سے کسی جسم میں وجود پذیر ہوئے

---

[1] قدیم زمانہ میں مصر میں ایک قسم کے پیشہ ور لوگ ہوتے تھے جو مرنے گلنے سے محفوظ رکھنے کے لئے مردوں کو ایک قسم کا مصالحہ لگا دیا کرتے تھے۔ اس پیشہ کو حنوط اور اُن پیشہ وروں کو محنطین کہتے ہیں اور یہ لوگ ساری قوم میں سب سے ارذل شمار ہوتے تھے جیسے ہندوؤں میں "مسنودھی" جو شخص بھولے سے بھی انکے گھر میں چلا جاتا یا جسے انکے جسموں سے مس ہو جاتا وہ قطعی ناپاک سمجھا جاتا تھا ایسے پاپیوں کو کاہنوں کی جانب رجوع کرنا پڑتا تھا۔ جو اپنے منتروں سے انکا پراشچت کر کے پھر ذات میں ملا دیتے تھے چنانچہ اسکا ثبوت قصہ میں خود آئندہ چل کر آتا ہے ۱۲ فاروقی [2] اس خانہ نا سبزہ کو کہتے ہیں جہاں اہل مصر مردے رکھ آتے تھے اور آجکل یہ عادت پارسیوں میں جاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصر والوں کا نقال ہے ۱۲ فاروقی

کے لئے اور ارواح سے مناقشہ کرے گا۔ یہ خیال انکے دلوں میں ایسی
مضبوط جڑ پکڑ گیا تھا کہ یہ لوگ ایک تو ہمیشہ ہمیشہ کو برابر جیسے کے تیسے
رکھنے اور دوسرے اپنے مقررہ تیوہاروں میں ان پر پختہ لذت دار گوشت، خوشبودار
پھول اور خوش ذائقہ پھل چڑھانے کے لئے اپنے مردوں کی لاشوں
کو بڑے ہی غور پرداخت سے حنوط کرنے لگ گئے۔

دفن میت کی کارروائی اور وہ قربانیاں جو متوفی کے گناہوں کے کفارہ
میں چڑھائی جاتی تھیں سب کی سب کاہنوں اور انکے مذہبی مددگاروں کے
وسیلے سے ادا ہوتی تھیں چنانچہ اس باعث سے مردوں کا طیبہ مصر کے سب
مذہبی علماء اور طالبان علوم مذہبی کا مرکز ہو رہا تھا کاہنوں کے فرقے
کی بود و باش کے لئے اس شہر میں ہیکلوں کی اطراف میں متعدد مکانات
بنے ہوئے تھے اور محنطین کے طائفہ کی رہائش کے واسطے جو پیشۂ حنوط
کو اپنے باپ دادوں سے سینہ بسینہ حاصل کرتے چلے آتے تھے، انہیں
کے کارخانوں کے آس پاس جن میں وہ بیٹھ کر مردوں کو حنوط کیا کرتے
تھے خاص خاص سکونت گاہیں تھیں۔ ان کارخانوں میں پتھر اور لکڑی کے
تابوت تیار ہوتے اور مردوں کے لفافے بنے جاتے تھے۔ انکے سوا ایسی
تصاویر اور ایسے طلسم بھی لکھے جاتے تھے جو پاس رکھنے والوں کو ہر طرح
کی آفات سے بچاتے تھے۔ شہر کی دکانوں اور اس کے عام راستوں پر
قسم قسم کے پھولوں اور پھلوں اور عطریات اور ترکاریوں اور مقدس گوندھے
ہوئے آٹے کی تجارت ہوتی تھی۔

اس زمانہ میں مصروالوں میں یہ عادت تھی کہ جو لوگ قبروں کی زیارت
کو جاتے وہ اپنے اپنے عزیزوں کے ارواح پر چڑھانے کے لئے ہزاروں

حیوانات ہمراہ لے جاتے۔ کاہن لوگ آتے ہی انہیں دیکھ بھال کرتے اور جو جو قربانیاں ان کی نظر میں پاک ٹھیرتیں ان کو اور جانوروں سے الگ کر لیتے پھر مقدس لاکھ سے اُن پر مہر بناتے اس کے بعد قربانی کی کارروائی کو تکمیل کرنے کے لئے ان جانوروں کو معبدوں کی طرف کھینچ لے جاتے۔ جن مفلس زوّار میں ایسے زندہ جانور چڑھانے کی استطاعت نہیں ہوتی تھی ان کے لئے یہ اجازت تھی کہ قصاب سے گوشت کا ایک ٹکڑا خریدیں اور اپنے مردوں پر چڑھائیں یا گیہوں کے آٹے کے بنے ہوئے حیوان نما پتلے کہ جن پر ہر طرح کے شوخ رنگوں سے رنگ آمیزی کی رہتی تھی، مول لیں اور عزیزوں کی قبروں پر نذر چڑھائیں چنانچہ ان غریبوں کی یہ نیازیں اہلِ مقدرت کی اُن زندہ قربانیوں کے برابر سمجھی جاتی تھیں جنہیں وہ اپنے مُردوں پر چڑھایا کرتے تھے۔

کاہنوں کے چیلے اپنی اپنی آراستہ و پیراستہ دکانوں میں موڑ کر تہ در تہ کئے ہوئے وہ کھجور کے پتے، کہ جن پر خوشنویس کاتبوں کے ذریعہ طرح طرح کی مقدس دعائیں لکھی رہتی تھیں، فروخت کیا کرتے تھے کہ قبروں میں مردوں کے نزدیک رکھ دیں تو وہ اپنی تاریکیوں میں شیاطین کے پھندوں سے نجات پائیں اور اُن پر زمینی آسمانوں کے دروازے کہ جہاں "اوزریس" اپنے دائیں اور بائیں چالیس چالیس قاضیوں کو، کہ جن سے زمین کے اندر ایک مجلس عدالت مرتب ہوتی ہے، لیے ہوئے اپنے تختِ عدالت پر جلوس فرما رہتا ہے۔ کھل جائیں۔

ہیکلوں کے اندر جو کچھ مذہبی رسوم ادا ہوتی تھیں ان کی عام باشندگان شہر کو ذرہ بھی خبر نہ تھی کہ کیا ہیں اور کیسے ہوتی ہیں۔ ان ہیکلوں کے

چو طرف محوطہ دار اونچی اونچی دیواریں کھنچی ہوئی تھیں ان میں اگرچہ بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے پر وہ صرف کاہنوں ہی کے لئے اُسی وقت کھلا کرتے تھے جب کہ وہ طلوع وغروب آفتاب کے وقت ھوروسس اور طوم[1] دیوتاؤں کی تعظیم کے لئے مذہبی راگ گاتے جوق جوق اپنی اپنی خلوت گاہوں سے نکلا کرتے تھے۔

جب غروب آفتاب کے بعد کاہن لوگ اپنے مذہبی نغمے الاپ کر خاموش ہو جاتے تب قبرستان زوار سے خالی ہو جاتا تھا۔ عادت یہ تھی کہ جب یہ نغمے موقوف ہو جاتے اس وقت قبروں کے زائرین بہت ہی جلد جوق جوق دریا کے کنارے، جہاں ان کے لئے سینکڑوں کشتیاں منتظر کھڑی رہا کرتی تھیں، جا پہنچتے اور وہاں ان پر سوار ہو کر زندوں کے طیبہ کی طرف روانہ ہو جاتے اور اکثر ایسا ہی ہوتا کہ جب کبھی واپس ہونے میں دیر ہو جاتی تو مردوں کے محافظ۔ چوکیدار ان زوار کو جبراً قہراً قبرستان سے باہر دھکیل دیا کرتے۔ اس وقت یہ لوگ چوروں کی لوٹ مار کے خوف سے جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے دریا کے کنارے آتے اور عجلت کے ساتھ کشتیوں پر سوار ہو کر دریا کے اس پار جا

[1] قدمائے مصر آفتاب کی روزانہ گردش کو انسانی زندگی سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ اس کے طلوع کو طفولیت سمجھتے تھے یہ اسکو "ھوروسس" نام دیتے تھے۔ اور اس کے خط نصف النہار پر پہنچنے سے جوانی مراد لیتے تھے اس کو "را" کہتے تھے اور غروب کو بڑھاپا جانتے تھے۔ اور اسے "طوم" سے موسوم کرتے تھے۔ مؤلف

پہنچتے۔

ادھر شہر میں تجار اپنی اپنی دکانیں بند کر دیتے۔ محنطین اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کو واپس جاتے اور کاہن ہیکلوں کے پھاٹکوں پر اندر سے بلیاں چڑھا دیتے۔ دور و دراز شہروں سے اپنے مردوں کی زیارت کو آئے ہوئے مسافر۔ جونہیں عبور کر کے رات بھر کرنے کے لئے زندوں کے طیبہ کو، جہاں کے دنیاوی شور و شغب اور چہل پہل سے اس عمدہ تاثیر کے زائل ہو جانے کا ڈر ہوتا تھا جو قبروں کی زیارت کے وقت انکے دل پر پڑی تھی۔ جانے کی نسبت یہیں قبرستان ہی کے قریب رہنا مناسب سمجھتے تھے۔ ہوٹلوں اور مہمان خانوں میں فروکش ہو جاتے جو نیل کے کنارے تعمیر تھے۔

اس وقت مذہبی نغمہ خوانوں کی آوازیں موقوف ہو جاتیں اسوگواروں کے غم والم کا جوشش و خروش مدہم پڑ جاتا اور ان بجروں اور کشتیوں کا سلسلہ آمد و رفت منقطع ہو جاتا جو اپنے نالہ و فریاد و نالغموں سے اس مقام میں ایک ہماہمی پیدا کر رکھتے تھے۔ اس کے بعد بھی باقی رہتا کہ خوشگوار ہوائیں دور دور کی آوازوں کی گونجوں کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے لاتیں اور لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیتیں اور یہ حالت بھی تھوڑے سے وقت کے لئے باقی رہتی پھر ایک عام سکون چھا جاتا اور سب طرف رات کی عملداری ہو جاتی

اس سنسان وقت میں مردوں کا طیبہ بالکل ہو کا مکان ہو رہتا اور بجز ان چمگادڑوں کے سایہ کے جو فضا کی بلندی پر چڑھ چڑھ کر دریائے نیل کے کناروں پر جھک جھک پڑتے اور پھر نیل کا خوشگوار پانی پی پی کر

اپنا اپنا آشیانوں کو، جو قبروں کے سوراخوں اور چٹانوں کے گوشوں میں ہوتے تھے، واپس جایا کرتے، پاک وصاف آسمان کے منظر میں دیکھنے والے کو اور کچھ دکھلائی نہیں دیتا۔ ہاں کبھی کبھی کوئی بہت ہی جلد گزر جانے والے جسم کا سایہ آنکھوں کو زمین پر نظر آ جایا کرتا، یہ مشہور جانور بھیڑیے کا سایہ ہوتا تھا۔ یہ خونخوار جانور اپنے اپنے بھٹوں سے نکل نکل کے پہلے دریا کے کنارے پہنچتے پھر وہاں سے لوٹ کر ان بھیڑوں رغوں اور مینڈھوں وغیرہ حیوانات پر ٹوٹ پڑتے جنہیں مردوں کے خویش واقارب دیوتاؤں کے تقرب اور اپنے اپنے مردوں کے کفارے کے لئے قبروں کے قریب لالاکر باندھ رکھتے تھے۔

اگرچہ یہ بھیڑیئے ان بے زبانوں پر حملہ کرتے مگر کوئی ساعی انسان اس سے انہیں باز رکھنے کے لئے جرأت نہیں کرتا۔ کیونکہ مصری مذہب ہی ان درندوں کی اس خونخواری سے باز رکھنے ہی کو یہ کہہ کر منع کر دیا کرتا تھا کہ یہ جانور دیوتا "انوبلیس" کی تربت سے ممتاز ہیں جو قبروں کا نگہبان، مردوں کا چوکیدار اور انہیں غارت گروں اور کفن چوروں سے بچانے والا اور دوسرے عالم میں انکی روحوں کا رہنما ہے۔ دراصل اس ممانعت میں یہ خیال ملحوظ تھا کہ جب بھیڑیے قبروں کے نزدیک رکھے ہوئے گوشتوں اور قربانیوں سے جنہیں مردوں کے وارث دیوتاؤں کی بھینٹ کے لئے رکھ دیا کرتے ہیں شکم سیر ہو جائیں گے اس وقت طیبہ کے کسی انسان کو بھی اذیت پہنچانے کا انہیں مطلق ارادہ نہ ہوگا۔

مردوں کے خویش واقارب جب قبروں کو جاتے اور دیکھتے کہ

قربانیاں قبروں کے پاس سے چپٹ ہیں تو وہ مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہ سماتے اور سمجھتے کہ ہمارے مُردوں کی روحیں ان کو ہضم کر گئیں۔ اب پھر وہ دوسری قربانیوں کے پیش کرنے میں سرگرم ہو جاتے۔ غرض ہمیشہ کے لئے یہی سلسلہ جاری رہتا۔ اور یہ بھید کاہنوں اور انکے مذہبی مددگاروں کے سوا جو بھیڑیوں کو قربانیوں کے کھنچا منگوانے کا واسطہ اور قبروں کے سارقوں سے قبروں کو بچانے کے لئے باوفا چوکیدار بنا رکھے تھے۔ اور کسی کو معلوم نہ تھا۔

اس باب کی ابتدا میں جیساکہ ہم بیان کر آئے ہیں ۱۳۵۲ء قبل ولادت مسیح کی ایک جاڑوں کی رات کا قصہ ہے کہ کاہن لوگ اپنے مذہبی راگ موقوف کر چکے تھے۔ مُردوں کے طلبہ پر معمولی سکون عام پھیل چکا تھا اور قبرستان کے چوکیدار بھی شہر کی گشت لگا اور قبروں کو دیکھ بھال اور اپنے دلوں کو مطمئن کر کے کہ اب قبروں کی آڑ واڑ میں کوئی دبا چھپا نہیں ہے۔ اپنی اپنی چوکیوں کو واپس ہو چکے تھے اور ان کو واپس ہوئے ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ قبرستان کی شمالی جانب سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی پھر لحہ کے لحہ میں بجائے ایک کے دو کتے بھونکنے لگے اور چند لحظوں میں دو سے تین اور تین سے چار، پانچ، چھ، سات کی عوعو ہونے لگی۔ چوکیداروں کے جمعدار نے اپنے زیردست جوانوں کو آواز دی۔

ارے آٹھو، چلو، دیکھیں کہ کیا ماجرا ہے جب سب تیار ہو گئے تو آپ یہ غور کرنے لگا کہ آواز کدھر سے آرہی ہے جب ایک سمت مقرر ہو چکی تو جمعدار اور چوکیدار سب بڑی تیزی سے اُسی کی سیدھ میں پڑ لئے،

جوں جوں اس مقام سے کہ جہاں سے کتوں کی آواز آرہی تھی قریب ہوتے جاتے تھے ووں ووں عوعو کی گرج اور بڑھتی جاتی تھی۔ جاتے جاتے آخر یہ لوگ پہاڑی کے نزدیک پہنچ گئے۔ اب معلوم ہوا کہ آواز پہاڑی پر سے آرہی ہے۔ اُس وقت جمعدار اور چوکیدار سب کے سب تیزی کے ساتھ پہاڑی پر چڑھ گئے اور یہاں "سبتی اول" کے ہیکل کے ستونوں کے قریب جو باجبروت فرمانروائے وقت "نکسیبس ثانی" کا باپ تھا، بھونکنے والے نے اپنی تقریر

اس وقت چاند پورے طور پر افق سے بلند ہو چکا تھا اور اُس کی نقرئی شعاعیں ہر طرف پھیل رہی تھیں اور اس مضبوط ہیکل کا تھوڑا سا حصہ اعلےٰ بھی روشن ہو چکا تھا۔ اب چوکیداروں کو نظر آیا کہ غلاموں کی ایک جماعت ہیکل کی ضخیم دیواروں کے نیچے کھڑی ہے۔ ہاتھوں میں مشعلیں ہیں ان سے کثیف دھواں اُٹھ رہا ہے اور اس دھوئیں میں سے آگ کے شعلے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور ایک زریں لباس لحیم وشحیم مہیب المنظر پست قامت شخص اپنے تازیانہ کے دستے سے ہیکل کے پھاٹک کو دھمدھما رہا ہے بہت سے خدمت گار اور ملازم اُس کی ہر طرف کھڑے ہیں، ایک سکھپال چند آدمیوں کے کندھوں پر دھری ہے اُس میں ایک عورت سوار ہے۔ ایک گاڑی کھڑی ہے جس میں دو بہت ہی اصیل گھوڑے جتے ہوئے ہیں اور اس پر ایک سرو قامت چھریرے سے قد والی گل اندام بیٹھی ہوئی ہے اور اُس کے بازو لگا ہوا ایک مرد متمکن ہے جس کے بشرے سے شرافت اور امیرانہ پن برس رہا ہے اور سب کے سب خاموش ہیں۔ ہیکل کے پھاٹک پر کھڑا ہو کر یہ شخص اپنے تازیانے کے دستے سے پھاٹک کو برابر دھمدھما رہا ہے اور اس کے دھمدھمانے کی گونج ہوا میں پھیل رہی ہے۔

چونکہ ان سب کا رخ ہیکل مقدس کی جانب ہے اور مشعلوں کی روشنی بھی ایک حالت پر برقرار نہیں، اس لئے چوکیداروں کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کون لوگ ہیں اور ان میں باہم امتیاز کیا ہے۔ مگر جب ہیکل کے دربان نے پھاٹک کے اوپر والے روشندان کو کھولا تو چاندنی اور مشعلوں کی روشنی کے ذریعہ پھاٹک کو دھمدھانے والوں کے بارے میں اتنی شناخت ہو سکی کہ ہونہ ہو یہ بلند حیثیت صاحب ثروت لوگ ہیں اور یہ بھی تعجب نہیں کہ شاہی خاندان کے ممبر ہوں۔ اُس وقت دروازہ دھمدھانے والے سے پوچھا گیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس سوال پر دروازے کے لحیم و شحیم شخص نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا اور بڑی گرج کے ساتھ جس سے پھاٹک پر کے کھڑے ہوئے سب لوگ تھرا اٹھے اور سکھپال مین کی عورت کانپ گئی، بولا: "وہ بہت وقت سے پھاٹک پر منتظرانہ حالت میں کھڑا ہوا ہے تو پہلے اوپر سے نیچے آ اور پھاٹک کھول پھر باتیں کبھار تجھے ہماری پہچان ولانے کے لئے اگرچہ مشعلیں بے نور ہیں تو اس تازیانہ کی زبان، اُس وقت جب کہ اس سے تیری پیٹھ پر ہمارے نام لکھ دئے جائیں گے، تجھے ہمارے نام بتلاتی ہوئی یہ سمجھا دے گی کہ امراء کا کس طرح استقبال کرنا چاہئے"

اس جواب کے ساتھ ہی سوال کرنے والے شخص نے اپنے آپ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے کہ جس کا مفہوم کچھ بھی معلوم نہ ہوتا تھا اوپر سے نیچے اترنا شروع کیا۔ اُس وقت گاڑی مین کی خاتون اپنے دروازہ دھمدھانے والے ہمراہی کی جانب متوجہ ہو کر ایک مہین اور پُر معنی آواز میں بولی:- اے بعالکو (یہ اُس شخص کا نام تھا) تو بھول گیا ہے کہ تو مصر میں ہے۔ تو شازوشش* کے وحشیوں سے خطاب نہیں کر رہا ہے بلکہ تیرا خطاب کاہنوں سے

* ان قبائل کا نام ہے جو مصر کے شمال میں رہتے تھے۔ اسیوقت بہ اگر نہری اور رادشتیں مشہور رہتے۔ مہرحت

ہے۔ مجھے اُن کی تعظیم و تکریم کرنی ضرور ہے خاصکر اس وقت میں جب کہ ہم انہیں سے اعانت لینے یہاں آئے ہوئے ہیں، لوگ تیری سنگدلی اور تندمزاجی کی بار بار شکایت کرچکے ہیں، فی الحقیقت اگر تندمزاجی ہی تیری عادت ہے تو تم اُس کو تھوڑے وقت کے لئے اپنے سے دور پھینک دے تاہم اپنی اُس غرض کو کہ جس کے لئے یہاں پر منتظرانہ حالت میں کھڑے دروازہ دھمدھمارہے ہیں حاصل کرلیں۔"

شاہزادی نے اس تقریر کو کچھ اس انداز سے کہا کہ بجا کرکے دل پر اسکی بہت ہی نقش زن تاثیر واقع ہوئی۔ تاہم وہ اپنی اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے شاہزادی کے سامنے جھک گیا مگر اس کے غصہ کا یہ حال تھا کہ گویا سینکڑوں سانپ پڑے اُس کے دل کو ڈس رہے ہیں۔ اس جوش کو ہلکا کرنے کے لئے اس نے اپنا کوڑا اٹھایا اور ایک حبشی غلام کو جو اُس کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا اس زور سے لگایا کہ اُس کے جسم میں پیوستہ ہوگیا۔ اس پر بھی اُس سے کوئی آواز نہ نکلی کیونکہ وہ بخوبی اپنے مالک اور سردار کی عادت کو جانتا اور سمجھتا تھا کہ اگر وہ میں کرونگا تو ضرور اس سے بھی بڑھ کر اور مار پڑے گی۔ تاہم اُس کے دل کی جو کیفیت ہوگی اُس کو یا تو وہی کچھ خوب جانتا تھا یا وہ ذات جو سب کائنات کی پیدا کرنے والی ہے (باقی آئندہ)

المور کہا ریا) مرقع اردو

ہوالناصر

یہ مضمون آویختہ قلم جواہر رقم حضرت میر نذیر صاحب فراق دہلوی کا ہے جو علم ادب اردو کے مانے ہوے استاد ہیں۔ اس مضمون کی ابتدا کو تاریخی حالات سے ہوئی ہے لیکن حضرت فراق کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام میں عجیب عجیب خیالات با محاورہ شستہ زبان اردو میں تین بابوں میں تقسیم ہوکر آئندہ اشاعت میں یکے بعد دیگرے ختم ہونگے۔ ——

پہلا باب

——

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

اسلامی سطوت نے عرب میں قدم رکھا اور عجم کو نوٹس دیا کہ تاج کیانی اور درفش کاویانی میرے حوالہ کرو اپریل ۵۶۹ء کی رات کو **نوشیرواں** مداین کا فرماں روا اپنے دل کش قصر پر جڑاؤ چھپر کھٹ میں لیٹا ہوا نیند کے مزے لے رہا تھا جو ایک ہولناک آواز نے اُسے چونکا دیا جب در و دیوار کی لرزا اور دل کی دھڑکن کم ہوئی تو اُس نے کنیزوں سے جو اُس کی پاچی

کر رہی تھیں پوچھا یہ آواز کیسی تھی اور در و دیوار کیوں ہلے تھے کنیزوں
نے عرض کی جہاں پناہ اِن چین آیا تھا اسیں ایک خواجہ سرا دوڑا ہوا آیا
اور نوشیرواں کی جناب میں گذارش کی خداوند حضور کے محل کے چودہ
کنگورے بھونچال نے پاش پاش کر دیے۔

نوشیرواں دوسرا ہونا پکار کیا مژدہ ہے کہ میرے پاس دوڑا آیا ہے
ناشدنی تو کنگوروں کے نیچے دب کر نہ مر گیا نوشیرواں کو اپنا محل بہت پیارا
تھا لاکھوں کی لاگت اور برسوں کی محنت میں تیار ہوا تھا اُس کے ٹوٹنے
سے اُس کا دل بھی ٹوٹ گیا صبح کو دربار میں جب ساری موبد اور حکیم حاضر ہوئے
تو نوشیرواں نے اُن سے رات کے بھونچال کا سبب دریافت کیا اور حکیم
اور سب موبد تو چپ بیٹھے رہے مگر بزرجمہر نے کہا یہ ایک علامت عربوں
کے اقبال اور ایرانیوں کے ادبار کی معلوم ہوتی ہے غالباً رات کو مکہ میں
وہ آخری پیغمبر پیدا ہوئے جن کی تشریف آوری کی خبر آسمانی کتابیں
دے رہی تھیں وہ خود یا اُن کے جانشین ایران کی پرانی سلطنت کو خاک
میں ملا دیں گے۔ ژند و آوستا آگ میں جلا دی جائے گی اور آتشکدان کی
آگ پر پانی پڑ جانے کا اور در حقیقت ہوا بھی ایسا ہی نوشیرواں کے
دل پر تو مسلمانوں کی آمد کا ایسا ہول بیٹھا کہ وہ تو اس خبر سننے کے چند روز
بعد ہی سسک سسک کر مر گیا مگر پارسی سلطنت کا چراغ کچھ دنوں تک
ٹمٹماتا رہا نوشیرواں کے بعد اُس کا پیارا بیٹا ہرمزد ابن کے تخت پر
بیٹھا مگر بد اقبالی چنڑ بن کر اُس کے سر پر چھا گئی اور اُس نے بادشاہ
بنتے ہی ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا بے گناہوں کی جان کا لاگو ہو گیا باپ کے
وقت کے بڑھے وزیر اور پرانے امیر جن کی عقلیں جوان تھیں خرچ

فوج کے سردار جو اپنے وقت کے رستم وافراسیاب بنتے تھے چن چن کر مروا دیئے - رعیت تباہ کر دی ملک اُجاڑ دیا آس پاس کے بادشاہ جرار فوجیں لیکر ایران پر چڑھ دوڑے خاص کر سادہ شاہ اور اُس کی بہادر سپاہ نے توہرمز کے نتھنوں میں تیر چلا دیئے ایرانی فوجیں جو بے سری ہو رہی تھیں شکست کھا کر بھاگیں اور بھاگ بھاگ کر اپنی کو آنے لگیں - خبرداروں نے خبر دی کہ سادہ شاہ دارالسلطنت کی طرف بڑھتا چلا آتا ہے اب توہرمز کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے سٹ پٹا کر بغلیں جھانکنے لگا کوئی وزیر امیر ہوشیار تجربہ کار باقی نہ رہا تھا جو اس اڑی بھیڑ میں کام آتا اور نیک صلاح بتاتا خلوۃ خانہ میں بیٹھا آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا اور کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی اس سے وارثے دفتت کا ایک بوڑھا چوبدار چلمن کے باہر کھڑا ہرمز کی بے قراری اور دو زاری کا تماشا دیکھ رہا تھا نمک حلال اور پرانا آدمی تھا اس سے تاب نہ ہوئی اس کا جی بھر آیا اور چلمن اٹھا کر کمرے میں آ ہاتھ باندھ کر ہرمز کے سامنے کھڑا ہو گیا -

ہرمز - نستوہ تمہیں کچھ کہنا ہے -

نستوہ چوبدار - جی خداوند فدوی کو کچھ عرض کرنی ہے -

نستوہ - جناب عالی یزدان پاک حضور کو صد وسی سال سلامت رکھے آپ کا پیر غلام یعنے فدوی کا باپ اب ڈیڑھ سو کی پیٹھ میں پہنچ گیا ہے اس عمر میں اس نے دنیا کے عجیب وغریب تماشے دیکھے ہیں سینکڑوں موبد اور پیر مغاں اور درویش اور دانشمند بستے ہیں اسے کئی بادشاہ اور انکی حکومت کے دور آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے حضور کے دادا جان اس کی دانائی اور تجربے کاری کی بڑی قدر کرتے تھے مہم اور دشواری

کے وقت اُسے بُلا کر مشورہ لیتے اور اُس کی بات اُنکے دل کو لگ جاتی تھی بُودہ کہتا کرتی اور جب تدبیر اُس کی کارگر ہو جاتی تو خوش ہو جاتے اور انعام اکرام سے مالامال کر دیتے حضور کی پریشانی اور سادہ شاہ کی شوخی کا حال میں نے اُس سے کہا تو کہنے لگا تمہارے بادشاہ کی تو کیا حقیقت ہے اگر رستم اور سہراب بھی اپنی اپنی گور سے نکل کر آئیں اور اپنی ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیں تو بھی سادہ شاہ سے جیت نہیں سکتے۔

میں۔ اسکا سبب

پیر غلام۔ اس کا سبب یہی کہ سادہ شاہ کو نیچا دکھانے والا کوئی اور شخص ہے۔

میں۔ وہ کون شخص ہے۔

پیر غلام جو ہے اُسے میں ہی خوب جانتا ہوں۔

میں اُسکا اتہ پتہ

پیر غلام تجھ جیسے لونڈے کو تو میں نے اُس کا اتہ پتہ ضرور بتایا

میں پھر کسے بتائیے گا۔

پیر غلام بادشاہ کو اور وہ بھی اُس وقت جب اُسے گوں ہو اور مجھے بلا کر پوچھے

اب اگر حضور کا جی چاہے تو پیر غلام کو بلا کر دو دو باتیں کر لیجئے شاید وہ بندگان عالی کے مفید مطلب کچھ عرض کرے۔

ہرمز چونکہ گشتوہ میں تمہاری اس ہمدردی سے بہت خوش ہوا اچھا یہ بتاؤ تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔

گشتوہ حضور پیر غلام کو مہران شاہ کہتے ہیں۔

ستورہ کی بات ہرمز کے دل میں اثر کر گئی اور اس نے ایک خواص کو بلا کر حکم دیا کہ ہمارے خاصہ کی پینس اور دس سوارے کر جاؤ اور مہران شاہ کو بڑی تعظیم کے ساتھ ہمارے پاس لے آؤ حکم کی دیر تھی آدمی گئے اور مہران شاہ کو لے آئے ہرمز کو مہراں شاہ کی صورت دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی بڑھاپے کے مارے اس کے منہ کا کانسہ سوکھ کر نکل آیا تھا آنکھیں بیٹھ گئی تھیں کان گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح سوکھ کر منڈا ہو گئے تھے اور ان پر چار چار انگل لمبے بال بڑھے ہوئے بہت برے معلوم ہوتے تھے بدن کی ایک ایک ہڈی ایک ایک رگ پچھا گنا جاتا تھا تمام چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور میر صاحب کے اس شعر کو یاد دلا رہی تھیں ؎

یہ جھریاں نہیں اعضا کی ضعف پیری نے
چنا ہے دامن ہستی کی آستینوں کو

ہرمز نے بوڑھے ایرانی کو مسند کے قریب بٹھا لیا اور حکم دیا کہ مہراں شاہ کی کمر کے پیچھے گاؤ تکیہ لگا دیا جائے۔

ہرمز مہراں شاہ سے آپ بہت بوڑھے ہو گئے بقول شخصے نہ منہ میں دانت رہا نہ پیٹ میں آنت۔

مہراں شاہ ؎

عیش دنیا را بقائے نیست دیدی غنچہ را
یک تبسم کرد و عمرے در پریشانی گذشت

اس شعر نے ہرمز کا دل ہلا دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

ہرمز۔ آپ کا قد جھک کر کمان ہو گیا۔

مہراں شاہ ؎

جان من ہر چیز را با اصل خود باشد رجوع
ما چو از خاکیم ما را خاک می باید شدن

ہرمز نے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے مہران شاہ کو اپنی رام کہانی سنائی اور جواب کے انتظار میں بہت غور کے ساتھ مہران شاہ کا منہ دیکھنے لگا۔

مہران شاہ۔ میں آپ کے سامنے ایک پرانا قصہ بیان کرنا چاہتا ہوں مگر آپ اسے ذرا التفات کے ساتھ سنیے گا کیونکہ آپ کی عقدہ کشائی اس کے سننے پر منحصر ہے۔

ہرمز فرمائیے میں دل و جان کے کانوں سے سنوں گا۔

مہران شاہ۔ جب آپ کے والد بزرگوار نوشیروان عادل جوان ہوئے تو آپ کے دادا جان بادشاہ قباد کو اُنکی شادی بیاہ کی فکر ہوئی اور چونکہ چاند سورج کی جوڑی ملانی تھی ملک ملک کی شاہزادیوں کی در پردہ چھان بین ہونے لگی اور اس ٹوہ میں سینکڑوں نوکر ختا ختن ہندوستان تلخ۔ تو شاد بھیجی گئی مگر ایک زگاہ باز خبر دار نے سچی سچی خبر دی کہ فغفور چین کے محل میں اس وقت پانچ بیٹیاں ایسی حسین مہ جبین بن بیاہی ہوئی بیٹھی ہیں جن کے آگے جنت کی حوریں اور پرستان کی پریاں بھی بے حقیقت ہیں اگر ان میں سے کسی کے ساتھ نوشیرواں کی شادی ہو جائے تو آپ کی مراد بر آئے آپ کے دادا جان اس مژدہ کو سنکر شاد ہو گئے۔ کیونکہ فغفور سے اُنکی دانت کاٹی روٹی تھی اُسی وقت نسبت کا پیغام لے کر قاصد چین کو گیا فغفور نے اس کے جواب میں لکھا کہ بھائی قباد میرا آپ کا معاملہ واحد ہے آپ کی اولاد کو میں اپنی اولاد جانتا ہوں اور میری اولاد آپ کی اولاد ہے نوشیرواں کے لئے ایک چھوڑ پانچ پانچ بیٹیاں موجود ہیں

آپ اپنے کسی تمیز دار معتمد کو بھیج دیں تاکہ وہ چین آئے اور پانچوں لڑکیوں میں
سے جو اُسے پسند آئے نوشیرواں کے نامزد کر جائے اس خدمت کے لئے
شاہ قباد نے مجھے تجویز کیا اور میں بڑی شان و تزک کے ساتھ چین بھیجا گیا
فغفور نے مجھے ایوان شاہی میں ٹھیرایا زنانہ محلسرا ایوان سے ملی ہوئی
تھی لڑکیوں کے دکھانے کے لئے نیک دن نیک تاریخ نیک ساعت
مقرر ہوئی اور فغفور کی بادشاہ بیگم نے مجھے محلسرا میں طلب کیا جب میں نے
محلسرا کی انگنائی میں قدم رکھا تو میری عقل دنگ ہو گئی کیونکہ سرتا سر
چاندی کی اینٹوں کا فرش ہو رہا تھا اور مکانوں کی در و دیوار بالکل سونے
کی بنی ہوئی تھی جن میں چینی کاریگروں کی میناکاری اپنی بہار دے رہی
تھی صحن چبوترہ پر زمرد کی مرصع چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر چار
نوعمر لڑکیاں شاہانہ لباس پہنے ہیروں کے جگمگاتے ہوئے تاج سروں
پر دھرے بڑے غنج و دلال کے ساتھ بیٹھے ہوئے گل کھلا رہی تھیں۔
انکی رخسار کی سرخی اور نزاکت گلاب کے پھول سے کہیں زیادہ تھی بھویں
کیا تلواریں تھیں جن کو دیکھ کر آدمی تڑپ جاتا تھا کٹورہ جیسی بڑی بڑی
آنکھیں نرگس شہلا کو شرماتی تھیں سر سے پاؤں تک حسن کے سانچے میں
ڈھلی ہوئی تھیں مشک ختن سے زیادہ سیاہ چوٹیاں کمر سے نیچے پڑی
تھیں ان چاروں پری پیکر لڑکیوں کی کرسیوں سے چند قدم کے فاصلے
پر چاندی کی ایک کرسی اور بچھی ہوئی تھی جو زمرد کی مرصع کرسیوں کے
سامنے بہت ہی حقیر معلوم ہوتی تھی اور اس کرسی پر بھی ایک لڑکی بیٹھی
ہوئی تھی اُس کا لباس بھی کرسی کی طرح معمولی حیثیت کا تھا تاج کے
بدلے اُس کے سر پر ایک سادہ ریشمی دوپٹہ تھا خدا جانے وہ دوپٹہ کھسک کر اُسکے

منہ پر آ گیا تھا یا اُس نے خود اپنا منہ چھپا لیا تھا اس لئے یہ بھی اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ لڑکی خوبصورت بھی ہے یا نہیں مگر غالب گمان یہی تھا کہ وہ شکل کی اچھی نہیں ہے اور اسی سبب سے اوڑھے لیئے اپنی عیب کو ڈھانکے بیٹھی ہے سامنے جڑاؤ تخت پر فغفور چین کی بیوی ملکہ زمانی بڑے ٹھسّے کے ساتھ تشریف رکھتی تھیں اس وقت انکی عمر چالیس سے کم نہ تھی مگر پھر بھی حسن و جمال کے شعلے انکے آبدار چہرے سے اُٹھ رہے تھے اور لباس و زیور کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں میں بادشاہ بیگم کی خدمت میں آداب بجالایا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا بادشاہ بیگم نے آکے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں دوسرا سلام کرکے کرسی پر بیٹھ گیا اور چاروں لڑکیوں کی پیاری شکلیں غور سے دیکھنے لگا یہ چاروں لڑکیاں اپنی ماں سے بہت مشابہ تھیں اور ماشاء اللہ چاروں کی چاروں طاؤس طناز بن رہی تھیں میں نے ان چاروں میں سے ایک لڑکی کو اپنے دل میں انتخاب کر لیا مگر مجھے یکایک خیال آیا کہ مہراں شاہ پانچویں لڑکی کے دور بیٹھنے اور منہ چھپا لینے سے یہ گمان کر لینا کہ وہ اچھی صورت کی نہیں ہے دور اندیشی کے خلاف ہے خریداری کی نظر سے ایک دفعہ اُسے بھی ضرور دیکھنا چاہیئے مجھے معلوم تھا کہ بادشاہ چین کی چار بیٹیاں ہیں مگر میں نے چند راکر ملکہ زمانی سے کہا کہ یہ لڑکی جو چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے آپ کی صاحبزادی نہیں ہے۔

ملکہ جی ہاں یہ میری بیٹی نہیں ہیں مگر ہیں شاہزادی -

میں - انکی ماں بھی شاہی خاندان میں سے ہیں

ملکہ ہیں نہیں مگر تھیں شاہی خاندان میں سے

میں کیا ان کا انتقال ہو گیا۔
ملکہ جی ماں وہ ملک عدم کو سدھار گئیں
میں - یہ شاہزادی اپنی بہنوں سے الگ کیوں بیٹھی ہیں -
ملکہ منہ بگاڑ کر الگ کھڑی ہیں اپنے تئیں ذرا دور ہی کھینچتی ہیں بہنوں کے پاس آکر بیٹھتیں تو شان میں حفت نہ پڑ جاتے بہنیں تو بہنیں وہ تو میری بھی حقیقت نہیں سمجھتیں آج میں نے قدرے کی کہ بیٹی نہا دھو کر کپڑے بدل ڈال مگر اس اللہ کی بندی نے سنی ان سنی کر دی اور ہٹی کے مارے کپڑے نہ بدلتی تھی اور نہ بدلے اس کا کیا بگڑا بدنامی تو میری ہوئی آپ اپنے گھر جا کر میرے ہی جنم میں تھوکیں گے کہ سوتیلی ماں ایسی بے رحم ہے کہ آئے گئے کے سامنے بھی بیٹی کو دو نئے چیتھڑے پہننے کے لئے نہیں دیتی -
میں ابھی ناسمجھ ہیں خدا رکھے ہوش آنے کا تو آپ کے پاؤں دھو دھو کر پئیں گی -
ملکہ زمانی انہیں ناسمجھ کون کہتا ہے خدا رکھے چودھویں برس میں ہیں دنیا کی اونچ نیچ سب کچھ جانتی ہیں -
میں - حضور مجھے جو کچھ منصوبہ کرنا تھا وہ میں نے اپنے دل میں کر لیا ہے مگر ایک نظر ان صاحبزادی کی بھی صورت مجھے دکھا دی جائے تاکہ مجھے اپنے آقا کے سامنے یہ بات کہنے کو ہو جائے کہ میں نے پانچوں شاہزادیوں کو دیکھ بھال کر انتخاب کیا ہے -
ملکہ زمانی - مناسب ہے یہ کہہ کر ملکہ زمانی نے ایک لونڈی کو حکم دیا کہ نامیہ کے منہ سے دوپٹہ سرکا دے دوپٹہ کے سرکتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ چودھویں رات کا چاند - چاندی کی کرسی پر بیٹھا چمک رہا ہے گر چاند نے یہ بڑی بڑی

مخمور آنکھیں لمبی لمبی پلکیں خوب صورت ناک پتلے پتلے یاقوت کے رنگ کے ہونٹ اور سلک مروارید سے زیادہ آب دار دانت اور ناگن کی طرح لہرانے والے کالے گیسو کہاں پائیے۔ جو خدانے ناہید کو دئے تھے حیا کے مارے اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور شرم کے پسینہ میں ڈوب رہی تھی ناہید کے جمال کے سامنے اس کی چاروں بہنوں کا حسن مجھے اتنا مدہم دکھائی دینے لگا جتنا آفتاب کے سامنے شمع کا نور پھیکا ہوتا ہے حسن و خوبی کے علاوہ ناہید کے بشرہ سے خوش خوئی خوش مزاجی حیا عفت عصمت کے جوہر بھی عیاں ہو رہے تھے جو اونچے گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے لئے درکار ہیں نوشیرواں کی زینت پہلو کے لئے میں نے ناہید کو چن لیا اور چڑھاوے کے طور پر پانچ لاکھ روپے کی قیمت کی ایک موتیوں کی مالا اپنی جیب سے نکال ناہید کے گلے میں ڈال دی ملکہ زمانی اور اسکی چاروں بیٹیاں میرا منہ دیکھتی رہ گئیں چونکہ میں نے ملکہ زمانی کی امید کے خلاف اُنکی سوکن کی بے زبان اور باحیا لڑکی کو پسند کر لیا اس لئے وہ مجھ سے ناخوش ہو گئیں غصے کے مارے اُن کا چہرہ تمتما گیا اور وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں شاہ ایران نے اچھا سفیر بھیجا ہے جسے برے بھلے اور کھرے کھوٹے کی بھی تمیز نہیں ملکہ کے اُٹھتے ہی میں بھی اپنی کرسی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا اپنے اُس ایوان کو چلا آیا جہاں میں ٹھیرا ہوا تھا میرے آئے کے بعد ملکہ زمانی نے فغفور کو محل میں بلا کر یہ سمجھایا کہ ایران سے جو سفیر آیا ہے بڑھاپے کی وجہ سے اُس کے حواس میں خلل معلوم ہوتا ہے اُسکی آنکھوں سے بھی غالباً کم دکھائی دیتا ہے بے تمیز نے نوشیروان کے لئے ناہید کو پسند کیا ہے جو نہ صورت کی اچھی ہے نہ سیرت کی نوشیروان کی تو اُسکی

ساتھ دو دن بھی نہیں نبھے گی اور ناحق کا فضیحتہ ہوگا آپ اُسے بلاکر سمجھایئے
کہ بادشاہ بیگم کی بڑی لڑکی تمہاری شاہزادہ کے لایق ہے اُسی کو تم لپسند
کرو اور اُسی کو نشان پہناؤ - غضنفر کا بیوی کے ڈر سے دم بند ہوتا تھا اُس نے
بہت اچھا کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا میرے پاس چلا آیا اور جو کچھ بیگم نے
کہا تھا وہ میرے سامنے دوہرا دیا مگر میں نے اُسے یہی جواب دیا کہ میں اپنے
آقا اور آقازادہ کی مزاج اور طبیعت سے خوب واقف ہوں اس لئے
میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے انتخاب کیا ہے وہ اُسکے منشاء اور مذاق
کے موافق کیا ہے اور اگر میں اُس کے خلاف کروں گا تو گنہ گار اور خطا،
ٹھیروں گا اس لئے میں اپنی راے کسیطرح نہیں بدل سکتا ہوں غضنفر
میری اس تقریر کو سنکر چپ ہو گیا مگر چونکہ ملکہ نے اُس کے دل میں
وسوسہ ڈال دیا تھا اس لئے اُس کو قسم قسم کی دور اندیشی اور طرح طرح
کے وہم نے گھیرا اور اُس نے حکم دیا کہ شاہی منجم حاضر ہوں شاہی منجم
فوراً حاضر ہوے غضنفر نے اشارہ کیا کہ ناہید کا زائچہ طالع غور سے دیکھیں
چینی منجموں نے جو سچ مچ اپنے فن میں کامل تھے ناہید کے زائچہ طالع
پر نظر ڈالی اور ایک زبان ہو کر عرض کی کہ خداوند یہ لڑکی بڑی بھاگوان اور
صاحب نصیب ہے اس کی شادی شاہ ایران سے ہونے والی ہے شادی
کے بعد ناہید کے پیٹ سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کا یہ نام رکھا جائیگا
جب وہ آپ کا نواسہ جوان ہوگا تو شاہ ایران فوت ہو جائے گا اور آپکا
نواسہ اپنے باپ کی جگہ ایران کے تخت سلطنت پر قدم رکھے گا مگر افسوس
ہے کہ آپ کے نواسہ کو جہانداری اور شہریاری کا ڈھنگ نہ آئے گا سلطنت
کے نظم ونسق کو خراب کر ڈالے گا ملک اور رعیت اُس کے ظلم وستم سے

برباد ہو جائیگی توران کا بادشاہ جسکا یہ نام ہوگا فوج لیکر ایران پر چڑھ آئیگا آپکے نواسہ پر بڑی تباہی آئیگی۔ اسوقت فلاں شہر سے فلاں شخص کہ جسکا حلیہ اور نام یہ ہوگا آپ کا نواسہ طلب کر کے اپنی فوج کا سپہ سالار کریگا اور وہ سپہ سالار خدا کے حکم اور اپنے بازو کی طاقت سے آپ کے نواسہ کے حریف کو زیر کرے گا اور اس نوجوان سپہ سالار کے اقبال اور انتظام سے ایران کی سلطنت پر زور پکڑ جائے گی فغفور نجومیوں کے اس بیان سے بہت خوش ہوا اور اس نے میرے انتخاب کو دل و جان سے منظور کر لیا بادشاہ بیگم پشپاتی رہ گئیں میں چین سے ایران آیا اور شاہ قباد کی خدمت میں سارا حال عرض کیا شاہ قباد نے میری اس کارگزاری پر بہت تحسین و آفرین کی اور آخر کار اسی چینی کے ساتھ نوشیرواں کی شادی ہوگئی نجومیوں کی پیشینگوئی کے بموجب برس دن بعد اسی کے پیٹ سے آپ پیدا ہوئے اور آج خدا کے رشتے سے اس کی جگہ تخت سلطنت پر رونق بخش ہیں اور ساوہ شاہ کے ہاتھوں سے زچ ہو رہے ہیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ دشمن پر آپ کو فتح نصیب ہو تو اس شخص کو اس مقام سے بلوائیے اور فوج کا سپہ سالار بنائیے۔

ہرمز۔ مہران شاہ آپ کی دل آویز اور عجیب و غریب تقریر نے مجھے دنگ کر دیا میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا کیا شکریہ ادا کروں یزدان پاک کی مہربانی تھی جو اس مشکل میں آپ میرے کام آئے اور تقدیر کے بھید سے مجھے آگاہ کیا اب یہ فرمائیے کہ اس شخص کا نام کیا ہے اور وہ کس شہر کس قریہ میں رہتا ہے۔

مہران شاہ نجومی نے اسکا نام بہرام چوبینہ اور اس کا وطن دیبل بتلایا تھا وہ کیانی نسل کا شاہزادہ ہے اور اپنے وطن میں مرزبانی کرتا ہے۔

مگر اس کے بلانے میں تملق سے کام لیجئے گا نہیں وہ ادھر قدم بھی نہیں دھرے گا۔

ہرمز۔ میں اُسے بہت عزت اور آبرو کے ساتھ بلواؤں گا۔

مہران شاہ۔ ہاں یہی مناسب ہے اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔

ہرمز۔ بہت خوب۔ مہران شاہ ہرمز سے رخصت ہو اپنے گھر گیا اور ہرمز نے دربار عام کیا اور اہل دربار سے کہا میں نے سنا ہے اردبیل میں ایک شخص اس صورت اور اس حلیہ کا رہتا ہے تم لوگوں میں سے اگر کسی نے اُسے دیکھا ہو یا اس کا نام سنا ہو تو مجھے اس کا پتہ بتاؤ درباریوں میں سے جو لوگ کبھی اردبیل گئے تھے اُن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور عرض کی کہ حضور ہم نے اس صورت کا کوئی شخص وہاں نہیں دیکھا اتفاقاً اسی وقت اصطبل کا داروغہ جس کا نام فرخ زاد تھا دربار میں آیا اور بادشاہ کا یہ کہنا اس نے بھی سنا۔ سنتے ہی اس نے ہاتھ باندھ کر بادشاہ سے عرض کی جہاں پناہ جس حلیہ کے آدمی کو حضور دریافت فرماتے ہیں فدوی نے اردبیل میں دیکھا ہے وہ چھوٹا سا ایک مرزبان ہے اور اس کا نام بہرام ہے۔ چونکہ ذرا لمبے اور چھریرے بدن کا آدمی ہے اس لئے لوگ اسے چوبینہ چوبینہ کہتے ہیں۔

ہرمز۔ خوش ہو کر فرخ زاد تمہارا بیان بالکل صحیح ہے تم نے ٹھیک پتہ دیا بیشک اس شخص کا نام بہرام چوبینہ ہے اچھا تم اردبیل جاؤ اور بہرام چوبینہ کو ساتھ لے کر ہمارے پاس آؤ۔

فرخ زاد۔ جو حکم

منشی نے ہرمز کے اشارہ سے بہرام چوبینہ کے نام اس کے طلب میں فرمان

لکھا اور فرخ زاد فرمان کے ساتھ ماہی مراتب اور خلعت لے کر بہرام چوبینہ کے لانے کے واسطے اردبیل کو چل دیا۔ بہرام چوبینہ خود ایک مدت سے اس فکر میں تھا کہ کسی طرح شاہ ایران تک رسائی ہو اس لئے بادشاہ کے بلانے کو غیبی تائید سمجھا اور فوراً فرخ زاد کے ساتھ مداین چلا آیا ہرمز نے بہت تعظیم کے ساتھ اُسے اپنے دربار میں جگہ دی اور اُس کی صورت شکل اور خال وخط کو مہران شاہ کے بیان کے موافق پاکر پھولا نہ سمایا اور دوسرے ہی روز اپنی ساری فوج کا سپہ سالار کر دیا بہرام کا ستارہ سامنے تھا اور آدمی تھا بھی تلوار کا دھنی پہلی ہی لڑائی میں اُس نے سادہ سادہ شاہ کو نوک دم بھگا دیا اب کیا تھا بہرام چوبینہ کی چڑھ بنی اور وہ سلطنت کے سب کاروبار میں دخل دینے لگا اور چند ہی روز میں اُسنے اپنی کارگذاری اور لیاقت دکھاکر بادشاہ کو اپنا فریفتہ کر لیا اور ہرمز بن نوشیروان ایران کی عظیم الشان سلطنت کو بہرام چوبینہ کے ہاتھ میں سونپ کر عیش و نشاط میں پڑ گیا بہرام چوبینہ پہلے سے بھی طباع اور ذہین تھا اب کلیلہ ودمنہ جیسی کتاب اُس کی نظر سے گذری اس لئے وہ پورا دو فنون اور مدبر بن گیا اُس کے نفس نے کہا جب تک سر پر تاج اور پاؤں کے نیچے ایران کا تخت سلطنت نہو حکومت کا مزہ کچھ نہیں اسلئے اُس نے چند روز میں ایران کی رعایا اور سلطنت کے امیروں وزیروں سے سانٹھ گانٹھ کر لی اور ہرمز کو مداین سے نکال باہر کیا اور آپ بادشاہ بن بیٹھا بہرام چوبینہ نے ایران میں کئی برس تک بڑے دبدبہ کے ساتھ سلطنت کی اور ہرمز بدنصیب ملکوں ملکوں ٹپہ ٹوئیاں مارتا پھرا آخرکار پھر اُس کا نصیب جاگا اور اُس نے بہرام چوبینہ کے قبضہ سے ایران کو نکال لیا مگر بہرام

چوبینہ بھی ایسا خوش اقبال شخص تھا کہ وہ بغیر ملک کے بھی عمر بھر بادشاہ بنا رہا اور مرتے دم تک اس کے رکاب میں دس پانچ ہزار آدمی موجود رہا اور مرنے کے بعد اپنا اقبال اپنی اولاد کو دے گیا چنانچہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ایران توران کی سلطنت برباد ہوگئی آتشکدہ ٹھنڈے ہوگئے مگر بہرام چوبینہ کی نسل کی حکومت کو زوال نہ ہوا ان لوگوں نے ہوا کا رخ پہچان لیا اور اسلام کا عروج دیکھ کر ایک دم سے سب کے سب اسلام کے سانچہ میں ڈھل گئے اسد بن سامان بہرام چوبینہ کی ہی نسل کا جوان بخت امیرزادہ تھا جسے خلافت عباسی میں ایک خاص درخور حاصل کیا اور خلیفہ مامون رشید نے اسد بن سامان کے ایک بیٹے کو جس کا نوح نام تھا سمرقند کا گورنر اور اس کے دوسرے بیٹے کو جس کا نام احمد تھا فرغانہ کا گورنر اور اس کے تیسرے بیٹے کو جس کا نام یحییٰ تھا شاس کا گورنر اور اس کے چھوٹے بیٹے کو جسکا نام الیاس تھا ہرات کا گورنر کر دیا تھا اسد کی اولاد ہونہار اور دوسرے بزرگوں کی اسیر تھی اس لئے گورنری کے فرائض خوب بجالائی اور ان چاروں کا اقبال روز بروز آفتاب کی طرح چمکنے لگا اور ان کا لقب آل سامان پڑ گیا آل سامان نے حکومت کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی اپنے دادا بہرام چوبینہ کے ہتھکنڈے برتنے شروع کئے اور عباسیہ کی اطاعت سے آزاد ہوکر شہر بخارا کو اپنا دارالسلطنت بنالیا اور بادشاہ کہلانے لگے اور اپنی سلطنت کے دائرے کو انہوں نے خراسان سے کر ماوراءالنہر اور افغانستان تک وسیع کر لیا آل سامان میں چودہ پشت تک برابر فرمان روائی قائم رہی اور انکی شاہانہ شوکت و جلال کے قصے ایک سو اٹھائیس برس تک

سنہری حرفوں میں اسلامی تاریخ کے نقرئی صفحوں پر مرقوم ہوتے ہیں۔ آل سامان کا آخری بادشاہ **عبدالملک بن نوح** تھا جو دار السلطنت بخارا کے محلوں میں بیٹھ کر حور وش پری تمثال نازنینوں کے ساتھ عیش منایا کرتا تھا عبدالملک کے محلسرا میں ہونے کو ایک چھوڑ پانچ پانچ خاندانی بیگمیں تھیں مگر اس کا دل ایک چرکس کی لونڈی پر آ گیا تھا جس کو **تاجدار محل** کا خطاب دیا تھا جب آدمی کے دن بنتے آتے ہیں تو سارے کام سنورتے چلے جاتے ہیں خدا کی شان تاجدار محل حاملہ ہوئی اور نویں مہینہ اس کی کوکھ سے سنہ ۳۰۹ھ میں ایسا خوب صورت لڑکا پیدا ہوا جس کے آگے چاند سورج بھی ماند تھے۔ بادشاہ بے اولاد تھا لڑکے کا ہونا غنیمت سمجھا اور مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا لڑکے کا نام **اسمٰعیل** رکھا اب کیا تھا تاجدار محل کی چوٹی چڑھی اور میاں کے وہ منہ چڑھی وہ منہ چڑھی کہ اس کی کھولی کھلتی تھی اور اس کی باندھی بندھتی تھی شاہزادہ اسمٰعیل خدا کے فضل سے چودہ برس کا ہو لیا اور اس عمر میں اس نے علم اور فن جو شاہزادوں کو درکار ہوتے ہیں حاصل کر لئے۔ مگر خاص کر تیر اندازی کے ساتھ اسے دلی شوق تھا اور شوق کے سبب سے اس کو اس فن میں ایسی دستگاہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنے باپ کے ساری قلمرو میں یکتا تیر انداز گنا جانے لگا گرچہ اسمٰعیل کا ابھی لڑکپن تھا اس لئے وہ تیر کمان ہاتھ میں لے کر کبھی کبھی قلعہ سے باہر نکل جاتا اور شہر کے جس کونے میں پرنگاہ پڑے تاک لگا بیٹھتا۔ (باقی آئندہ)

خانہ برباد قمری

امن اور آسائش کی قمری — کیا میں بتاؤں کیسی پیاری
اُجلی جیسے روئی کا گالا — آنکھ کی ٹھنڈک دل کا اُجالا
اوجِ فضا میں تھی منڈلاتی — میں نے پوچھا کیوں او قمری ؟
تو نے قصد کیا ہے کہاں کا ؟
کس گلشن کا ؟ کس بستاں کا ؟
باغِ جہاں کا ہر ہر بوٹا — ڈالی ڈالی - پتّا پتّا
پیارے طائر! تیرے لئے ہے — تیری خاطر تیرے لئے ہے
ہمکو چھوڑ کے آہ! نہ جا تو
اور کہیں بیتہ! نہ جا تو
سنکر میری منت و زاری — بھر کے اک آہ وہ قمری بولی
تجھ سے کہوں کیا اپنا ارادہ — ہجرت کو تھی میں آمادہ
ہجرت کیسی ؛ جاؤں کہاں میں ! — دنیا پر ہوں بار گراں میں
مجکو یہاں اب چین نہیں ہے — مجھ سے زمانہ برسرِ کیں ہے
ہوتے ہیں اب ایجاد فراواں — روز نئے خونریزی کے ساماں
دنیا اب پیکار طلب ہے — [illegible]
جرمن اب ہے مخالف میرا — [illegible] سکتی واں ہے بسیرا
دشمنوں کا اب زور وہاں ہے — جنگ و جدل کا شور وہاں ہے
کان ہوئے جاتے ہیں بہرے — ایسی جگہ کوئی کیسے ٹھہرے !

اسپیں میرے ہوش اڑا دے — رکھ کر بارود آگ لگا دے
بیٹھوں گریں میں کیا میں جم کے! — مغز اڑا دیں گولے بم کے
کوئی ایسی جگہ کیا جائے — مجکو تو دم بھر چین نہ آئے
پرتگال تو گرم بہت ہے — میری طبیعت نرم بہت ہے
اٹلی کا کچھ حال نہ پوچھو — اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہو
اس کی برکت کیا وہ سمجھائیں — مجکو تو سب تو سمجھائیں
دیکھ رہے ہو روس کی حالت — پوچھو نہ اس منحوس کی حالت
ترک تو میرا انکدم کر دیں — ٹکڑے بوٹی کر کے دھر دیں
دنیا کا احوال نہ پوچھو — صورت دیکھو حال نہ پوچھو
بڑھتی جاتی ہے خونخواری — دشمن ان ہے دنیا ساری
کرۂ ارض کا کوئی حصہ — قابل میرے نہیں القصہ
کیا کہوں کس حیرانی میں ہوں — سخت پریشانی میں ہوں
قسمت میں ہے دشت نوردی — میں ہوں اور آوارہ گردی

چکر ہوں میں ہوا پہ لگاتی
اوج فلک پر ہوں منڈلاتی
یعنی میں پروازگزیں ہوں
دنیا میں ہوں اور نہیں ہوں

(ماخوذ) — (نادر علیخاں کاکوروی)

تصویر یار

ہم اپنے دیرینہ دوست منشی دیدار الدین صاحب قیصری پلیڈر کے بدل ممنون ہیں جنھوں نے عرصہ کی خاموشی کے بعد پھر مخزن سبھا میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ جناب قیصری مخزن کے ابتدائی معاونین سے ہیں مگر افکار دنیوی کے باعث مدت سے قطع تعلق کئے ہوئے ہیں۔ آج تصویر یار کی جھلک دکھا کر پھر پرانے یارانہ کی تجدید کرتے ہیں اور وعدہ فرماتے ہیں کہ آئندہ بھی پرچہ کی ترقی میں نیاز مند ایڈیٹر کی دستگیری کیا کرینگے (طور)

تصویر ہے تری ستم ایجاد سامنے
شیریں کے آج بیٹھا ہے فرہاد سامنے!

رخسار سرخ رہزنِ تمکین ہوش ہے!
دامن مری نظر کا کفِ گلفروش ہے!!

زیبے دہن ہے اور یہاں گفتگو نہیں!
دیں بات کا جواب حسینوں کی خو نہیں!!

لب سرخ پیچ زلف گرہ گیر میں بھی ہے
جو بات تجھ میں ہے تری تصویر میں بھی ہے!

دھوکے میں تیرے اس سے ہم آغوش ہو گیا!
میں آج بے پئے ہوئے مدہوش ہو گیا!

مثلِ کلیم غش میں دل ناصبور ہے
کاغذ میں بند برقِ سرِ کوہِ طور ہے!!

فکرِ زوالِ حسن سے تو بے قرار ہے!
یہ باغ وہ کہ جس میں ہمیشہ بہار ہے!

کیا بے نیازِ رحمتِ چین جبیں ہے یہ
جلوہ دکھا کے پردے میں چھپتی نہیں ہے یہ!

جز اس کے ذکرِ حسن کے کوئی بیاں نہیں!
برگِ نہالِ طور ہے میری زباں نہیں!

مانندِ شعلہ رنگ قبا اسکی بر میں ہے!
سوزِ جحیم میرے دلِ نوحہ گر میں ہے!

اس کی طرح اگرچہ ہوا سرخ پوش گل
رکھتا کہاں ہے جلوۂ آتش فروش گل!

ہے روئے بے حجاب ہماری نگاہ میں
آنکھیں لگی ہوئی ہیں تماشائے ماہ میں

اے وہ کہ قیصری تیرا مدحت نگارِ حسن ! — ہے حسن یوسفی ترا آئینہ دارِ حسن !
یہ حسن کیا ہے مرغِ محبت کا دام ہے — اور ایک طاقتِ کششِ دل کا نام ہے
ہوتا کنارِ بام ہے یہ جلوہ گر کبھی — چلمن کی آڑ سے ہے جلاتا جگر کبھی
سرخی میں شفق ہے سحر میں چمک ہے یہ — غنج و دلالِ لیلیٰ ہے میں نمک ہے یہ
خوشبو اسی کی نافۂ مشکِ تتار میں — جلوہ اسی کا سروِ لبِ جوئبار میں
منقارِ عندلیب سے ریزاں یہی تو ہے — بو بنکے گل میں ہوگیا پنہاں یہی تو ہے
مستی شراب میں ہے یہ لالے میں رنگ ہے — تازہ اسی کے دم سے لبِ شوخ رنگ ہے

ظلمت بنا ہے یہ ترے گیسو کی شام میں
اور آکے درد ہوگیا میرے کلام میں

(صدرالدین قیصری ایڈیٹر)

یارِ بیوفا

اے یارِ بیمروت ! اے سنگدل ! ستمگر ! — مہر و وفا کے دشمن ! جور و جفا کے خوگر !
بے وعدہ ! بیمروت ! بیباک اور خودسر ! — اے دل پھنسانیوالے ! دلدار ! میرے دلبر !
قسمت سے میری نکلا تو چرخ سے بھی بڑھکر

ظاہر میں گو ہے بظاہر بیمثل خوشخصالی — انداز جو ہے بانکا جو ہے ادا نرالی
ہر دلعزیز ہے تو ! کیا کم ہے بانکالی — صورت بھی دیکھنے میں کیسی ہے بھولی بھالی

پر بات کیا ہے پیارے ! کیوں دل ترا ہے پتھر ؟

سو جان سے ہوں قرباں صد تھے نثار تجھ پر — جائیگا دھیان تیرا مرقد میں بھی نہ مر کر
اپنے کے بستر ے ونکو ترا ہوں لاکھ چچکر — رو رو کے کاٹتا ہوں فرقت کی شب تڑپ کر

آجاتی ہے لبوں پر جانِ حزیں بھی اکثر

دل کی لگی کا اپنے وہ تجھ سے حال کہنا — ہنگام گفتگو وہ آنکھوں سے اشک بہنا
لیکن غضب تھا اسپر یہ اور ظلم سہنا — تیرا بگڑ کے کہنا "بس بس! خموش رہنا!!"

مجھ سے فضول شکوہ! یہ ہے ترا مقدر

برسوں کیا ہے تو نے وعدے پہ حیف وعدہ — لیکن ہوا نہ اک بھی قسمت سے اپنے پورا
رو رو کے تجھ سے کہہ دوں اک روز جی میں آیا — سمجھا بھی میں نے ظالم! پیماں شکن دیکھا

لیکن پڑی مصیبت، بگڑے جو دیکھے تیور

دیکھا جو تجھ کو دل سے نالے نہیں نکلتے — بر لاؤں کیسے میرے ارماں کہیں نکلتے
سن لی جو تیرے منہ سے میرے نہیں نکلتے — پاؤں تلے سے پائی اپنے زمیں نکلتے

غش کھا کے گر پڑا میں وہ سر کو آیا چکر

"میں نے کہا گئے تھے کیا دشمنوں سے ملنے؟" — پھر پوچھا میں نے ہنسکر "اغیار میں تو پوچھے؟"
غصہ سے مجھ کو دیکھا، پھر یوں بگڑ کے بولے — "گئے تو ہیں گئے تھے، ہاں ہاں وہاں گئے تھے"

"پھر پوچھنا نہ مجھ سے یہ بات یوں مکرر"

اک روز گھر پہ تیرے میں یونہی جا کے پہنچا — بیٹھیں دل لگی کی باتیں، عدو تھے اور تو تھا
اثنائے گفتگو میں پھر میرا نام آیا - — پوچھا جو تجھ سے میں نے "یہ میرا ذکر کیسا؟"

"واللہ! کچھ نہیں تھا" کہنے لگا تو ہنسکر

پوری کی ساری تو نے ظالم! ستم شعاری — پہلو کوئی جفا کا رہنے دیا نہ باقی
جور و ستم کی اپنے باتوں پہ انتہا کی — میں نے کہا جو تجھ سے دیدونگا جان اپنی

فرمایا تو نے ہنسکر "جیسی خوشی ہو بہتر"

یادِ اجل

اے اجل! اے سببِ راحتِ جانِ ناشاد — قیدِ ہستی سے تو کرتی ہے ہر اک کو آزاد

تیرا مشتاق ہوں ہر وقت تری رہتی ہے یاد — تیری چاہت نہیں ہوتی کبھی کم اور زیاد

تجھکو آنے میں بتا دے یہ تساہل کیوں ہے؟

تجھکو مشتاق سے اپنے یہ تجاہل کیوں ہے؟

آ مری موت! امیر اور د مٹانیوالی — محنت و درد سے آفت سے بچانے والی

رنج و غم سے مجھے ہر آن چھڑانے والی — مشکلوں میں مجھے تسکین دلانے والی

زندگی دہر میں انسان کی ہے لاحاصل

آ لپٹ جا میری چھاتی سے مجھے کر واصل

مرغِ بسمل ہوں مرے زخمِ جگر آرے ہیں — آگ سینے میں لبوں پر مرے تبخالے ہیں

دل کے ٹکڑے نہیں آتش کے یہ پرکالے ہیں — یاد میں تیرے کبھی آہ کبھی نالے ہیں

سوزِ فرقت سے مرے دل میں ہیں چھالے آ جا

اے مری موت! تو دامن میں چھپا لے آ جا

اشک جاری ہے پڑا کام ہے اب آٹھ پہر — ناتوانی نے تسلط کیا اپنا آ کر

کر مرے حال پہ اب لطف و عنایت کی نظر — جان آئی ہے لبوں پر مری جان لے تو خبر

ہے مسلّم جو یہاں ایک دن آنا تیرا

کب تلک یاد میں تڑپا کرے شیدا تیرا

زیست کے ہاتھ سے دنیا میں ہوں میں خوار و زبوں — شک نہیں اس میں سراپا ہے جہاں مکر و فسوں!

زندہ در گور ہوں کب تک یونہی اے محزوں — جان جائے تو کہیں رنج و الم سے چھوٹوں

زندگی میرے لئے سخت عذاب جاں ہے
میرے اس درد کا اے موت! تو ہی درماں ہے

عیش و عشرت سے مجھے کام نہیں ہے واللہ ہوں خفا زیست سے اپنی ہے خدا اس کا گواہ
نہ کسی سے مجھے الفت نہ کسی کی ہے چاہ نہ یگانے سے مجھے رسم نہ بیگانے سے راہ

نہیں دیوانۂ دنیا - ہوں میں شیدا تیرا
ڈھونڈنے والا ترا چاہنے والا تیرا

بے کسی نے کیا پامال مرا خرمن دل ہے مجھے بیت حزن عیش و طرب کی محفل
تنگ دستی نے مرا کام کیا ہے مشکل تیرے آنے کے لئے ہوں میں بہت مستعجل

اے اجل! بادۂ عشرت کے پلانے والی
تو ہے آغوش مسرت میں سلانے والی

کون کہتا ہے تماشائے جہاں سے سروکار؟ کس کو معلوم چمن میں ہے خزاں یا کہ بہار؟
دل افسردہ نے چھوڑے ہیں رسوم بیکار یہ تمنا ہے کہ ہو جائے کہیں جان نثار

ہے شب و روز میرے دل میں خیال محبوب
موت آ جائے تو ہو جائے وصال محبوب

کب تلک صبر کروں؟ صبر کی طاقت نہ رہی تا کجا ضبط؟ کہ اب ضبط کی قوت نہ رہی
زندگی تلخ ہے باقی کوئی لذت نہ رہی سیر ہوں زیست سے جینے کی حلاوت نہ رہی

لطف باقی کسی شے میں نہیں اب غیر ممات
شربت مرگ ہے نامی کے لئے آب حیات

(سید شاہ محمد نامی از حیدرآباد)

تازہ غزلیں

(از جناب ہنر عازی پوری)

چھوڑی ہے دل نے کونسی طرز اضطراب کی ... ہجر کی ؟ یا زوال کی ؟ یا التہاب کی ؟

کیا کشمکش میں جان پڑی ہے نقاب کی ... عادت ہے تجھ کو دید کی ۔ اُن کو حجاب کی

راس آگئی کچھ اسکو ہوا انقلاب کی ... ڈوبی نہیں اُلٹ کے بھی کشتی حباب کی

تصویر ہے تمہارے رخ بے نقاب کی ... قلعی کھلیگی یہ حشر کے دن آفتاب کی !

کی توبہ ختم جب ہوئی محفل شراب کی ... کیا صاف میں نے راہ نکالی ثواب کی !

میرے گناہ ۔ تیرے کرم ۔ دونو بے شمار ! ... رکھدے کہیں لپیٹ کے فردیں حساب کی

چل محتسب ! کرامت پیر مغاں دکھائیں ... خشکی میں آج دوڑے گی کشتی شراب کی

اہل جناں کے واسطے تجویز ہو چکی ... اب اور کیا دکھاؤں فضیلت شراب کی

تم سیر کو چلو تو یہ جوشش سرور ہو ... دریا اوچھالنے لگے ٹوپی حباب کی

آنکھوں میں پھر دیکھ کے بھاگے ہیں طفل اشک ... ارمان دید کے ہیں تمنائیں خواب کی

جب بے نقاب آؤگے تم سب کے سامنے ... محشر میں دھوم ہوگی میرے انتخاب کی

بے لطف کرچکی تھی جو پہلی شب وصال ... شرمندگی انہیں ہی برسوں حجاب کی

ہاں ہاں ! حضور غیر سے بگڑے ۔ بجا درست ! ... پہچانتا ہوں میں بھی نگاہیں عتاب کی

کیا چیز رک گئی ہے دم نزع سینے میں ... کوئی امید ہے دل حسرت مآب کی ؟

مدت قیام دہر کی کتنی بتاؤں میں ؟ ... بس یوں سمجھ لو عمر طبیعی سراب کی

کم ظرف سرچڑھیں تو عجب کیا ہے دیکھ لو ... دریا کے آگے خاک تھی ہستی حباب کی

آئی بہار گلشن امید میں ہنر ... یا ذوالجلال ! آندھی چلے انقلاب کی !

مجھ سے خفا تھے دل کو مرے کیوں جلا دیا — غصہ میں اپنے گھر کی بھی مٹی خراب کی

یارب وہ آپ ہی ہمیں چھیڑیں شبِ وصال — زک دے غرورِ حسن کو شوخی شباب کی

میں خاکسار ہوں تو مجھے اسکا فخر کیا! — اولاد بوتراب میں ہے بوتراب کی

غصہ سے آگ ہوتے ہیں سیماب دیکھ کر — بارے انہیں خبر ہے مرے اضطراب کی

آنکھوں میں پھر گیا ہے شبِ وصل کا سماں — گنجائش اس میں کیا ہو شبِ ہجر خواب کی

کیا جانے اس گلی سے کہاں لے گئی صبا! — ناحق مرے غبار کی مٹی خراب کی!

آخر ہوں گے خلد میں اک روز زاہدو — پہلے سے کچھ تو چاہئے عادت شراب کی

تاریکی اتنی صبحِ شبِ غم تھی میرے گھر — گر گر پڑی جو آئی کرن آفتاب کی

بحرِ فنا میں ہیں کوئی دم۔ گھر کہاں بنائیں؛ — چھوٹی سی چھولداری لگا لیں حباب کی

روتی ہے بیکسی وہ جہاں آس توڑ کر
تربت ہے اے ہنر کسی ناکامیاب کی

نہایت مسرت کا مقام ہے کہ لندن کی رائل سوسائٹی آف آرٹس مینوفیکچرس اینڈ کامرس۔ (انجمن ترقی اشاعت صنعت و حرفت و تجارت) نے اپنے اجلاسِ سالانہ منعقدہ ۲۶۔ جون گزشتہ میں مولوی سید مقبول محمد صاحب رئیس مح گڑھ کو اپنا ممبر منتخب فرمایا ہے۔ ممدوح اردو کے نامور انشاء پرداز السنہ مشرقیہ کے وسیع النظر عالم اور فنونِ لطیفہ مغربیہ کے بڑے ماہر ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کی سب سے بڑی ادبی و علمی مجلس رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو بھی آپ کی شرکت و رکنیت کا افتخار حاصل ہے۔ ناظرینِ مخزن عرصہ سے مولوی صاحب کے زورِ قلم سے روشناس ہیں

(غلام محمد طور ایڈیٹر)

اطلاع۔ چونکہ پچھلے پرچہ میں باکر رونانک صاحب کا مضمون تو چھپ گیا تھا لیکن تصویر نہ چھپی تھی لہٰذا اب پرچہ ہذا میں شامل کی گئی۔ منیجر

पुणें, चित्रशाळा स्टीम प्रेस सदाशिव पेठ ८१८.
CHITRA SHALA STEAM PRESS, POONA CITY.

مخزن

آزادی

راوی روایت کرتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے لاہور کے ایک کالج میں دو طالب علم تھے مسلم اور مصطفےٰ نامی، ماشاءاللہ! ابھی نئے نئے ہی کالج کی اس معزز و ممتاز جماعت میں رونق افروز ہوئے تھے جسے کالج کے عرف میں فسٹ ایر کلاس کہتے ہیں، اور جس کے ارکانِ ذی شان سے بقولِ راوی (جو اکثر چشمدید حالات سناتے ہیں) نفرت کرنا، مگر ہمارے نزدیک جن کی عزت و توقیر کرنا گویا کالج کے چپراسیوں سے لے کر پرنسپل صاحب تک کے ایمان میں داخل ہے۔ چونکہ جب سے یہ نونہال آغوشِ مادر سے جدا ہوئے اور مدرسہ کے معلموں کی نگرانی میں سپرد ہوئے، کسی نہ کسی ڈاکٹر بسبی* (Busby) کے

---

* ڈاکٹر بسبی انگلستان کے ایک مشہور و معروف استاد گزرے ہیں جو ادب آموزی کیلئے عصائے ادب کا بے محابا استعمال کرنے کے باعث انگریزی لٹریچر کے ساتھ شہرۂ آفاق ہو چکے ہیں (طلوع)

مہمان رہے اور صبح و شام مادر و پدر کے دستِ شفقت کی بجائے ایسے ایسے ڈاکٹر صاحبان کے عصائے تادیب کی زیارت کرتے رہے۔ جونہی یونیورسٹی میں انکی اپیل دربارہ ترحم مسموع ہوئی اور انہیں کالج کی چار دیواری میں قدم رکھنے کا موقعہ ملا اور کالج بھی لاہور کا کالج جس کی نسبت پنجابی ضرب المثل کے مطابق کہا جاتا ہے کہ جب تک کوئی پنجابی لاہور کو نہیں دیکھ لیتا گویا وہ ابھی دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔ خوشی کیسی؟ دو باتوں کی خوشی۔ ایک تو دنیا میں اپنی پیدائش کی تصدیق کی اور دوسرے مشفقانِ مدارس کے مظالم سے رہائی کی۔ پھر کیا تھا لگے اِدھر اُدھر لاہور میں گھومنے۔ انارکلی، عجائب گھر، چڑیا گھر، لارنس گارڈنز، لارنس ہال، منٹگمری ہال، گورنمنٹ ہاؤس، چیفس کالج، ٹھنڈی سڑک، شالامار، شاہدرہ۔ بادشاہی مسجد، قلعہ سب میں اگر سیر نہیں کی تو جھانکا ضرور، مگر جہاں کہیں قدم رنجہ فرمایا، حذار کھے! اپنے اوضاع واطوار کی بدولت ممتاز رہے۔ انہوں نے ایک نظر ادھر ادھر جھانکا۔ اور لوگوں نے انہیں نو وارد دیہاتی سمجھا۔ چنانچہ انہی حضرات کی نسبت مولانا لاأعلم اپنی مشہور کتاب سیر لاہور مطبوعہ تجربہ پریس کے ضمیمہ (۱...) میں یوں رقمطراز ہیں:-

"........ جونہی یہ لوگ عجائب گھر میں داخل ہوئے، جھٹ ناظرین انکے دہقانانہ اوضاع واطوار سے بھانپ گئے کہ نو واردانِ لاہور ہیں، چنانچہ یہ خود عجائب گھر کی اشیاء میں شامل ہوگئے یعنی ناظرین اور چیزوں کو چھوڑ کر انکی طرف نظرِ استعجاب دیکھنے لگے۔ کارپردازانِ عجائب خانہ نے مہتمم صاحب سے درخواست کی کہ انہیں یہیں روک لیا جائے مگر کالج کے پرنسپل صاحب کے نام کے توسط

سے بچ آئے۔ . . . جب لنگا گزر چڑیا گھر میں ہوا تو تماشہ بین اور حیوانوں کو چھوڑ کر ان ناطق حیوانوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہاں بھی قریب تھے کہ چڑیا گھر کی موجودات پر اضافہ ہوں کہ صاحب پرنسپل کے نام کی طفیل جان چھوٹی . . . . . . ایک جگہ انہیں سے دو آدمی سڑک پر پیشاب کرنے بیٹھ گئے جھٹ سے کالی کالی وردی والے کانسٹبل انکے سر پر آ موجود ہوئے، مگر پھر وہی پرنسپل صاحب کے اسمِ اعظم سے ان آہر منوں سے نجات ہوئی . . . . وغیرہ وغیرہ "

یہ تو ہوا ان لوگوں کی بورڈنگ ہوس سے باہر کی زندگی کا نقشہ، اب کالج اور بورڈنگ ہوس میں بھی انکی بود و باش کی کیفیت سُنیئے جس طرف جاتے ہیں کچھ اس انداز سے قدم اُٹھاتے ہیں کہ چاروں طرف سے انگلیاں اُٹھتی ہیں کہ وہ "فسٹ ایرفول" (کالج کی اونےٰ جماعت کے نادان) انکی عزت افزائی کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی پرنسپل صاحب بے تمیزی کی مثال دیتے ہیں تو ان نونہالانِ ملک کے اسمائے گرامی سے سامعین کی ضیافتِ گوش کی جاتی ہے۔ جب کبھی کالج ہال میں کوئی مجمع یا تقریب ہو تو ان کی نشست گاہوں پر ضرور و فورِ تمیز کا شور اور فراوانیٔ شعور کا غل سنائی دیگا۔ مشن کالج کے ہال میں تو اکثر ایسا ہوا کہ پادری صاحب نے دعا مانگنی شروع کی اور انہوں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی حرکت کرنی شروع کی، پرنسپل صاحب کو اکثر چند لمحوں کے لئے تقاضات کو بالا طاق رکھنا پڑا اور دعا کی بسم اللہ ان حضرات پر لعنت و ملامت سے کی۔ بورڈنگ ہوس میں نشست برخاست، رفتار گفتار، خورش پوشش میں غرضیکہ ہر ایک چیز میں یہ لوگ اپنی نظیر آپ ہونگے

ہم نرالے ہیں کل زمانے سے　　بات کھلتی ہے آزمانے سے

مگر چونکہ کالج کی اعلیٰ کلاسوں کے طلبہ ایسے سلسلۂ اخوت میں منسلک ہوتے ہیں۔ انہیں تواضع کرتے ہی بن آتی ہے مگر یہ تواضع وضع میں کچھ نفرت سے ہی ملتی جلتی ہے۔ یہ سب کچھ، دیکھتے بھالتے، سنتے سمجھتے، جانچتے پڑتالتے ہیں مگر دم نہیں مارتے۔ دل میں سوچتے ہیں کہ الہیٰ! ہم تو سمجھے بیٹھے تھے کہ اب گلشن کالج میں آزادی کی ہوائیں ہونگی مگر یہ تو خارستانِ دلآزاری نکلا۔ پرنسپل، پروفیسر، طلبہ سب کے سب گویا ہمارے برخلاف سازش میں شریک ہیں، آخر ماجرا کیا ہے دعویٰ آزادی کا، تعلیم آزادی کی، پھر ہماری آزادی کے پاؤں پر کیوں زنجیر ڈالی جاتی ہے؟

. . . .

مسلم۔ لاغر اندام، پتلے دبلے، چھریرے سے آدمی تھے کوئی سولہ سترہ کا سن ہوگا مگر زیرکی اور ذہانت کے آثار جبین سے ظاہر تھے۔ مگر پیشانی پر اس قدر ذہانت متلاطم نہیں تھی جتنی حضرت اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی قابلیت کا ہیضہ تھا اور ہیضہ ہے مرضِ متعدی۔ سب لوگ ان سے متوحش تھے۔ لباس کی مختصر کیفیت یہ تھی، سر پر خودسری کی ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے جس کے بانکے پھندنے کو تاجِ خودسری کا طرہ کہنا بجا ہے۔ چہرے پر ہر چند لاغری چھائی تھی مگر خودبینی کی عینک نے وہ شان بڑھائی تھی کہ خودپسند سے خودپسند آدمی کو بھی بے اختیار صلِّ علیٰ کہتے ہی بن پڑتی تھی۔ یہ اچھے گھرانے کے آدمی تھے، نازپروردہ ہونے کے سبب گرم و سردِ زمانہ کی لذت سے بالکل ناآشنا تھے۔ نام کو تو تھے مسلم مگر سرپناؤں کے معنے انکے نزدیک سرافراختن تھے ؎

برعکس نہند نامِ زنگی کافور

نازپروردگی نے انکی طبیعت کو بالکل چڑچڑی بنا دیا تھا، وہ بات بات پر یاروں دوستوں، اور ہمنشینوں سے بگڑ بیٹھتے تھے، کسی کا ادب لحاظ نہیں جانتے تھے، نہ بڑے کی تمیز تھی نہ چھوٹے کی، بڑے بڑے لوگوں پر پھبتہ چینی کرنا گویا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ قوم کے لیڈروں کا مذاق اڑانا انکی شگفتگیٔ قلب کا بہترین علاج تھا، صلح جوئی کا یہ عالم تھا کہ آج مجھ سے بگڑے ہیں تو کل آپ سے ۔ ان صفات کے باعث انکے احباب کا حلقہ اتنا ہی وسیع تھا جتنا انکا حوصلہ اور تحمل، غرضیکہ سب انہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ مگر انہیں مطلق پروا نہیں تھی۔ ذات شریف کو آزادی کے دیوتا کا مظہر سمجھتے تھے اور اپنے افعال کو آزادی کا ظہور، چنانچہ جب وہ کالج یا بورڈنگ ہوس میں پہنچتے تو وہاں کے منچلے انہیں آزادی کا ننھا سا سرو رواں پکار پکار کر ان کا ناک بند کر دیتے۔

مصطفےٰ اسے کالج میں داخل ہوتے ہی انہیں رسم ہو گئی تھی۔ مصطفےٰ کی شکل شباہت، وضع قطع، چال ڈھال سے کچھ خاص بات مترشح نہ ہوتی تھی۔ سب کا خلاصہ مطلب یہ سمجھو کہ ایک خاموش طبیعت کے آدمی تھے، جتنی چادر دیکھتے تھے اتنے ہی پاؤں پھیلاتے تھے، اپنی حد سے قدم باہر مارنا گناہ سمجھتے تھے، بیچارے سیدھی سادی وضع کے آدمی تھے۔ پیشانی کے خط صاف کہہ رہے تھے کہ خطاب یافتہ واجب التعظیم اور لازم التکریم بزرگ ہیں یعنے فسٹ ایرفول ۔ انہیں اپنے کام سے کام تھا۔ مسلم صاحب کی طرح دنیا جہان کے معاملات پر رائے زنی کرنا انکی عادت میں داخل نہ تھا۔ مسلم صاحب سے اکثر خلوت میں کہا کرتے تھے۔

کہ بھائی! ان لن ترانیوں سے کیا بنتا ہے؟ میرا ضمیر گواہی دے رہا ہے
کہ ہم فسٹ ایر فول ہیں ابھی ہماری رائے کی کون وقعت کرتا ہے کہاں
کی ہماری آزادی اور کہاں کی خودداری؟ کسی قابل ہونگے تو ہر ایک
سر جھکائے گا۔ مسلم جونہی یہ باتیں سنتے، غصہ کے مارے آگ بگولا ہو جاتے
اور بیچارے مصطفے کو تاک گھور کر کہتے کہ اگر تم جیسے ہی فسٹ ایر کلاس
کے ممبر ہیں تو ان کا خدا حافظ۔ تم ہو گے فسٹ ایر فول۔ ہم تو نہیں۔ ہم
تو آزاد و منش آدمی ہیں۔ مصطفے بیچارے کی کیا حقیقت تھی مسلم تو خدا کی
بھی ماننے والے نہیں تھے . . . .

رات کے نو بج چکے ہیں۔ مگر مسلم اور مصطفے میں یہی بحث جاری ہے
کج بحثی کے باعث مسلم مصطفے کا قافیہ تنگ کئے ہوئے ہیں۔ وہ بیچارے
سمٹے سمٹے حریف کی باتیں سن رہے ہیں کبھی مجال آن پاتے ہیں تو
کوئی دلیل دیتے ہیں ورنہ بکے بکے کس مپرسی کے عالم میں مسلم کی لن ترانیاں
سن سنکر نقش حیرت ہو رہے ہیں۔

قریب ہی ایک اور صاحب چارپائی پر لیٹے یہ تمام گفتگو سن رہے
ہیں اور فسٹ ایر کلاس کے دو ننھے ننھے طالب علموں کی لڑائی سے
دل ہی دل میں اسطرح مزے لے رہے ہیں جیسے گریٹ مغل مست ہاتھیوں کی
جنگ سے یا شوقین مسخرے بلبلوں کی لڑائی سے، یہ صاحب بی۔ اے
کلاس کے طالبعلم تھے۔ آپ کا نام نامی اور اسم سامی رحمت تھا مگر صوفی
ہیں تو ان سے نالاں، مولوی ہیں تو ان سے گریاں، شیخ ہیں تو ان
سے لرزاں، خواجہ ہیں تو اسے ترساں، نام کو رحمت مگر سب کے لئے موجب
زحمت، جس نے ذرا سر ابھارا انہوں نے فوراً نیچا کیا، جس نے گردن

اُٹھائی۔ ان سے منہ کی کھائی۔ انہیں خدائی فوجدار کہئے تو بجا ہے، مسٹر خواہ مخواہ کہیئے تو روا ہے، آدمی قابل تھے مگر اُنکی قابلیت کا رنگ کچھ نرالا ہی تھا، جن مضامین کو چھوتے بھی اعلیٰ اعلیٰ انشا پردازی کا دم خشک ہوتا تھا، ان میں یہ وہ جدت دکھاتے اور وہ شان پیدا کرتے کہ بیساختہ ہر ایک تعریف کرتا اور حضور کی قابلیت کے آگے ہر ایک سر جھکاتا۔ انکے پرنسپل اور پروفیسر تو ڈاکٹر آف ڈیوینٹی (فاضل علم الہیات) تھے اور یہ حضرت ڈاکٹر آف نون سنس (فاضلِ علم واہیات) کی ڈگری پائے ہوئے تھے۔ مگر صاحب بات پوچھئے اپنے فن میں یدِ طولےٰ رکھتے تھے۔ کالج کی لٹریری سوسائٹی میں اس علم کے متعلق وہ وہ ظرافت آمیز مضمون پڑھتے کہ سامعین لوٹ لوٹ جاتے۔ مضمونِ تاریخ اور واقفیتِ عامہ میں بھی بلا کی دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ روز کسی نہ کسی طالب علم پر قابلیت کا سکہ بٹھاتے، غریب کے گھنٹہ کا نقصان ہو جاؤ دو کا مگر یہ اپنی باتیں سنائے بغیر نہیں چھوڑتے تھے، اور انکی باتیں خالی از دلچسپی نہیں ہوتی تھیں۔ ہر بات پر دخل در معقولات کو تیار رہتے تھے۔ دوستوں کو نہیں چھوڑتے تھے۔ غیروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ مسلم اور مصطفےٰ کی بحث کو سنکر خوش ہوئے اور آہستہ آہستہ ڈاکٹر اقبال کا شعر الاپنے لگ گئے

ع

وہ چیز نام ہے جسکا جہاں میں آزادی ۔۔۔ سنی ضرور ہے دیکھی نہیں کہیں میں نے

---

*نوٹ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ابھی بقید حیات ہیں۔ انکی خوبیاں اس قسم کی ہیں کہ ان پر ایک مبسوط مضمون لکھا جا سکتا ہے (طور)

مصطفے! بیچارہ جو مسلم کی تیز زبانی سے دم بخود ہو رہا تھا، رحمت صاحب کے الاپنے سے فوراً تاڑ گیا۔ کہ خدائی فوجدار اس وقت خواجہ خضر بن کر میری مدد کو آئے ہیں۔ جھٹ تیز ہو کر کچھ بولنے لگے۔ گر خدائی فوجدار صاحب کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہیں تقریر کرنے دیں۔ وہ تو اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کیلئے غرض سے کود رہے تھے۔ انہیں روکا اور خود بدولت مسلم سے یوں مخاطب ہوئے۔

(رحمت) کیوں رے بھائی! کیا دن رات مغز چاٹتے رہتے ہو، تمہاری بساط ہی کیا ہے جو تم ایسے ایسے مضامین پر تقریر کر سکو تم سے تو بات کرنا بھی ہماری ہتک ہے، آزادی! ارے کہاں کی آزادی؟ کل تو کل، ہمیں تو آج ہی بی۔اے تک پہنچنے سے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ دنیا میں آزادی نام کو نہیں سے

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

(مسلم) حضرت! گستاخی معاف! آپ بلحاظ عمر و تعلیم سینیر ضرور ہیں مگر بے دلیل بھی کبھی کوئی دعوے چل سکا؟ آپ نے دو تین فقرے چست کر دئے ہیں نہ دلیل، نہ برہان، نہ ثبوت، نازم بہ ایں ریش و فش۔

(رحمت) ارے ننھے میاں! آنکھیں تو کھولو اور لمحہ بھر کے لئے خودبینی کی عینک اتار کر جیب میں ڈال لو، پھر آپ پر بخوبی منکشف ہو جائے گا کہ نہ قدرت آزادی دیتی ہے، نہ گورنمنٹ، نہ قانون، نہ مذہب نہ سوسائٹی، انسان کے بال بال پر قیود لگ رہی ہیں، کریں تو کیا کریں۔ چار باید زیستن ناچار باید زیستن۔

احاطہ سے فلک کے ہم تو کب کے
نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا

(مسلم) وہ کیونکر؟ صاحب! ہم تو یہی پڑھتے، لکھتے، سنتے، سناتے ہیں کہ یہ دور آزادی کا دور ہے، ہر مذہب و ملت اور ہر آب و ہوا کے لوگ آزادی پر ہزار جان سے نثار ہیں، آپ جیسے طوطی کی صدا اس نقار خانہ میں کون سنیگا؟
(رحمت) بھلا! بتاؤ؟ تو، اگر آپ چاہیں تو کانوں سے کھانا کھا اور آنکھوں سے بات سن سکتے ہیں؟ ہاتھوں سے سونگھ اور منہ سے دیکھ سکتے ہیں؟ ہوا کے بغیر رہ سکتے ہیں؟ فضا میں اڑ سکتے ہیں؟
(مسلم) نہیں تو، مگر فضا میں اڑ ضرور سکتے ہیں، دیکھو، بیلون اور ہوائی جہاز کرۂ یاد میں کس تیز گامی سے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، گویا ہوا میں ایک نئی دنیا بسا رہے ہیں۔
(رحمت) مگر بیلون یا ہوائی جہاز میں اڑنے کے لئے بھی تو گیس و دیگر اسباب و علل کی ضرورت اور پابندی لازمی ہے، دور کیوں جائیں، خود ہماری زمین، سورج، چاند سب کے سب نظام شمسی میں مقید اور پابند ہونے کے باعث زندگی بسر کر رہے ہیں، ذرا اس نظام سے انہیں آزادی ہونے دو اور دیکھو کہ انکا کیا حشر ہوتا ہے، ہم کشش ثقل، ہوا، آگ، پانی، مٹی، غرضیکہ قدرت کی بیشمار بڑی اور چھوٹی طاقتوں کے مغلوب اور پابند ہیں، اگر کبھی ہمنے ان میں سے کسی پر کچھ غلبہ حاصل کیا بھی تو اپنے تئیں طرح طرح کی پابندیوں اور بندشوں کی قیود میں جکڑ کر، بھئی! اگر یہ حال ہے تو پھر آزادی کہاں کی؟
(مسلم) بھائی! میرا مطلب ان طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے کا نہیں، انکے متعلق تو آپ کی کیا ہر ایک کی منطق خوب چل سکتی ہے۔
(رحمت) اچھا! تو مذہب کو لو، انسان کے بال بال پر شریعت کی مہر لگا،

لگاتا ہے، واللہ باللہ اس قدر احکام ہیں کہ جسم کے بالوں سے بھی زیادہ یہ ننھی سی جان اور یہ قیود۔ خدا کو واحد مانو، رسول کی رسالت پر ایمان لاؤ، تقوے اختیار کرو، نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، زکوٰۃ دو، چوری زنا، قتل مت کرو، جھوٹ، بغض، کینہ، حسد سے بچو، اجی! اس قدر اوامر و نواہی، صغیرہ و کبیرہ ہیں کہ توبہ ہی بھلی، کوئی کیا کیا گنائے، قصہ کوتاہ! از مہد تا بہ لحد مذہب کا تازیانہ دم نہیں لینے دیتا، ادھر بچہ پیدا ہوا، اُدھر اس کے کانوں میں اذان کے ذریعہ مذہب کی حکومت کا اعلان ہوا

(مسلم) تو یہ باتیں تو انسان اور خدا کے درمیان ہیں، ہماری شخصی آزادی میں انکے ماننے، نہ ماننے سے خلل تھوڑا آسکتا ہے؟

(رحمت) چہ خوب! ابھی مولوی نیک عالم صاحب کے کفر کے فتووں کا نام حضور کے کانوں تک نہیں پہنچا، بڑے بڑے تیس مارخاں دیکھے جنہیں مولنٰنا نے ناکوں چنے چبوائے۔

(مسلم) صاحب! مذہب کی نہ پوچھو، ایمرسن نے خوب لکھا ہے کہ مذہب انسان کو بزدل بنا دیتا ہے، یہ تو آزادی کی بیخ بنیاد اکھاڑنے والا ہے، مگر الحمد للہ! اب اس کا حلقۂ اثر روز بہ روز تنگ ہوتا جاتا ہے، اب اس کی قیود رفتہ رفتہ مٹ رہی ہیں، ایک دن آئے گا کہ خود بدولت کو جہاں سے رخت سفر باندھنا ہوگا۔

(رحمت) رحمت ہو آپ پر! آپ آپ پورے پورے اسم بامسمیٰ، آنکھ کے اندھے نام نین سکھ، مذہب سے آپ کو بیر سہی مگر سوسائٹی کے قائل تو ہو؟

(مسلم) کیوں نہیں، صاحب! سوسائٹی کو کوئی چھوڑ کر کہاں جائے گا اور اس کی دلچسپیاں کہاں پائے گا؟

(رحمت) ارے! آخر سوسائٹی کیا ہے؟ گویا مذہب ہی دوسرے قالب میں براج رہا ہے، سوسائٹی کی قیود بھی قریب قریب وہی ہیں جو مذہب کی ہیں، چوری، زنا، قتل نہ کرو۔ کینہ، بغض، حسد، مکر۔ فریب، ریا، جعل، جھوٹ، دغا سے بچو۔ . . . . وغیرہ وغیرہ، وہی اوامر و نواہی ہیں جو مذہب کے ہیں۔

مزدک* نے کہا "ہر زنے راشوئے و ہر شوئے راز نے" گر سوسائٹی نے کہاں تک اس کے اصول کو مانا؟ طوائف کی آزادی کو سوسائٹی کہاں تک پسند کرتی ہے؟ وہ چیز جسے عرف عام میں پبلک اوپینین (رائے جمہور) کہتے ہیں اسی قسم سے ہے، آپ اپنے تئیں بڑے علامہ و مجدد شمار کریں مگر ضرور نہیں کہ سوسائٹی آپ کے دعاوی پر آمنا و صدقنا کہے۔

اور گورنمنٹ بھی دوسری شکل میں وہی چیز ہے جو سوسائٹی ہے، گورنمنٹ کیا ہے؟ سوسائٹی کی انتخاب کردہ قائمقام جماعت کا نام ہے جو سوسائٹی کی خاطر قانون مرتب کرتی اور اس کی پابندی کرنے والوں کے گلے میں تحسین و آفرین کا تمغہ پہناتے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کی گردن میں طوقِ ذلت لٹکاتی ہے۔

تم کہتے پھرتے ہو کہ ہم آزاد، ہماری جان آزاد، ہمارا مال آزاد،

---

* عہد نوشیرواں میں ایک آزاد خیال گزرا ہے جس کا مقولہ تھا کہ "ہر زنے راشوئے و ہر شوئے راز نے" (طور)

اگر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تمہاری کونسی چیز آزاد ہے، میرے خیال میں تو تم صرف اسی حد تک آزاد ہو جس قدر تمہارے مجلس دوسرے آدمی یعنی سوسائٹی اور گورنمنٹ تمہیں آزادی دے، اور اس آزادی کا پیمانہ اتنا ہی تنگ ہے جتنا آپ کا دہن، ارے! تمہاری جان بھی تو اپنی نہیں، ذرا تم حوادث جہان سے تنگ آکر اقدام خودکشی کرو، جھٹ سوسائٹی کی قائمقام گورنمنٹ تمہارا گلا آپکڑے گی اور تمہارے لئے سزا تجویز کرے گی، اس کی راے میں تم اپنے لئے نہیں جیتے، بلکہ ماں باپ بیوی بچوں، خویش واقارب قوم ملک، گویا اپنے بیگانے کے لئے، تمہیں ان سے لاکھ نفرت ہو جیتے ہو، تمہارے مال پر گورنمنٹ تمہارے خلاف مرضی ٹیکس لگائے گی، سوسائٹی تم سے یتیم خانوں، مدرسوں، سڑکوں کے لئے روپیہ وصول کریگی یہ تو ٹھیریں مقابلۃً بڑی باتیں، تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی خود آرائی سے کام نہیں کرسکتے، تم برا کتا پالو، تم اس کی مضرت رسانی کے ذمہ دار ہو، ذرہ کہیں شاہراہ پر پیشاب تو کر دو، کسی سرکاری عمارت میں تھوک تو دو، کسی پبلک گارڈن سے دو پھول تو علانیہ توڑ دو، شام کو ٹھنڈی سڑک پر بغیر لیمپ کے بائیسکل پر تو نکلو، دیکھو تو تمہاری آزادی کیسے برقرار رہتی ہے تعزیرات ہند۔ ضابطۂ فوجداری، ضابطۂ دیوانی، غرضیکہ جس قدر آئین وضوابط ہیں تمہاری آزادی کی نفی ہیں، اگر یہاں دنیا میں آزادی چاہو تو جملہ پابندیوں کی زنجیر میں جکڑے جاؤ، بس یہاں تو آزادی پابندی سے ہے اقبال سہ

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

(مسلم) صاحب! یہ باتیں تو آپ نے کھری کہیں، کچھ اور بھی تو کہو۔
(رحمت) جب تک کالج میں والدین کے سر پر عیش منا رہے ہو۔ جسقدر چاہو آزادی کا نقارہ بجالو، جونہی بی۔ اے پاس کرکے یہاں سے نکلو گے، سب حقیقتِ حال منکشف ہو جائے گی۔ ماں باپ پال پوس کر، لکھا پڑھا کر فارغ ہو جائیں گے، پیٹ کھانے کو مانگے گا۔ خویش و بیگانہ کی نگاہیں تم پر لگ رہی ہونگی، جیب میں امتحان کے سارٹیفکیٹ ہونگے اور دفتروں کے ارد گرد جوتے چٹخاتے پھرو گے تمہیں اپنے چال چلن کیا، اپنے نام وولدیت وسکونت تک کی تصدیق کی حاجت ہو گی، گویا آپ سے زیادہ اس وقت دنیا بھر میں کوئی غیر معتبر آدمی نہیں، ایک دفتر سے جواب ملے گا تو دوسرے کا دروازہ کھٹکھٹاؤ گے، وہ نہیں کھلیگا تو تیسرے پر دستک دوگے، گوئے میدان کیطرح کبھی ادھر کبھی ادھر جاؤ گے۔ آوارگی اور پریشانی آپ کے رفیق ہونگے، سارا نشہ ہرن ہو جائے گا، اگر بالفرض نوکری مل بھی گئی تو ننانوے فی صدی حالتوں میں حسبِ منشا نہ ملے گی، ہر روز کی پابندی، وقت کی حاضری، افسروں کی نگرانی، ترقی، تنزل، تبدیلی، نیکی، بدی سب دوسروں کے ہاتھ میں ہو گی، تم لاکھ لائقوں کے ایک لائق سہی گر افسر تم پر ناخوش ہیں تو تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، خواہ وہ افسر محض منشی کا بت ہی کیوں نہ ہو۔
(مسلم) صاحب! ہم نے آگے ہی ٹھانی ہے کہ ملازمت نہیں کریں گے، ہم وکالت کریں گے، نہ کسی کا غم، نہ کسی کا فکر۔
(رحمت) جی! تو وہاں کونسی آزادی رکھی ہے؟ اوّل تو سوسائٹی کی ایک کافی تعداد وکلاء کے پیشہ کو ہی معیوب خیال کرتی ہے، پھر وکلاء کو رات دن دلّالوں کی حاجت، ایجنٹوں کی محتاجی، پبلک اوپنین کی فکر ہے، جن ججوں کے سامنے

وہ مقدمات لڑاتے ہیں انکی خوشامد کرنا اور خوشنودی حاصل کرنا گویا انکے ایمان میں داخل ہے، کبھی انکے مکان پر جاتے ہیں، کبھی ان سے ٹینس کھیل کر رسم پیدا کرتے ہیں، کبھی انہیں دعوت دیتے ہیں،

علاوہ بریں جہاں ایک دفعہ انکی شہرت قایم ہو جائے، وہاں سے ہلنا گویا انکی روزی کے لئے پیام اجل ہے - یہ پابندیاں اور پھر بھی وکالت آزاد پیشہ!

(سلیم) ہم ایف-ایس سی کلاس میں پڑھتے ہیں، ڈاکٹری سیکھینگے۔

(رحمت) ارے میاں! ڈاکٹری کا بھی یہی حال ہے جو وکالت کا، روپیہ روپیہ کو دفتروں کے کلارکوں کو جھوٹے بیماری کے سارٹفکیٹ دیا کروگے۔

(سلیم) تو سب کو چھوڑ کر ہم سوداگری کرینگے۔

(رحمت) ہاں! وہ بھی خوب ہی کروگے، وہاں بھی دکان کی شہرت، خریداروں کی خوشنودی، تعلقاتِ انسانی کا پیدا کرنا، ہر ایک سے صاحب سلامت رکھنا آپ کے جزو ایمان ہونگے۔

(سلیم) بھئی! مجھے نیند آرہی ہے، اصل میں میرے دل کا مطلب آزادی سے پولٹیکل آزادی تھا، وہ تو قابل تمنا ہے اور قابلِ حصول بھی۔

(رحمت) پولٹیکل آزادی کے بڑے سرگرم حامی مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی-اے الہ آباد کے سنٹرل جیل میں قیدِ فرنگ میں لکھتے ہیں ؎

ہر چند ہے دلِ شیدا حریتِ کامل کا
منظورِ دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

(سلیم) بھائی! قیدِ محبت سے تو کوئی چھوٹا نہیں، بڑے بڑے جابر و قہار بادشاہ سپہ سالار، جرنیل جو آن کی آن میں خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں محبت کے

ادنےٰ سے غمزہ سے قتیل ہو جاتے ہیں۔

(رحمت) خیر! پولیٹکل آزادی بھی اسی قوم کو میسر آسکتی ہے جس نے آئین و ضابطہ کی قیود کی پابندی کا حقہ سیکھ لی ہو، جو خود احکام کی پابندی نہیں کرسکتی وہ احکام کی پابندی بھی نہیں کرا سکتی۔ انگلستان کو لو، امریکہ کو لو، بادشاہ یا پریذیڈنٹ سے لیکر ادنےٰ شہری تک سب کے سب ایک عالمگیر سلسلۂ قوانین میں منسلک ہیں، ان آزاد ملکوں کا شیوہ یہ ہے کہ جتنا کسی کا منصب زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ پابندِ رسوم زیادہ ہوگا ع

آں راکہ عقل بیش غمِ روزگار بیش

کا یہی مفہوم ہے۔ ذرا انگریزی پارلیمنٹ کے فرائض اور اسکی کارروائیوں پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ بات تک، ہر ایک میں آئین اور ضابطہ کا رنگ جھلکتا ہوگا، ادنےٰ اعلےٰ سب کے سب قانون کے پابند ہیں۔ تمہیں معلوم ہوگا سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک معمولی سی حیثیت کے آدمی نے ہمارے شہنشاہِ معظم جارج پنجم خلد اللہ ملکہ پر کچھ الزام لگایا تھا اور انہیں اس الزام کا ازالہ کرنا پڑا تھا۔ انگریزی پارلیمنٹ دیکھئے پابند ہے اپنے الفاظ کی، اپنے قوانین کی، اپنے ضوابط کی، اپنی رسوم کی، اپنی روایات کی، اپنی ہسٹری کی، بین الاقوامی مباحث کی، جب اس نے اس قدر پابندیوں کی زنجیر میں اپنے تئیں جکڑا، جب کہیں جاکر اسے آزادوں کے زمرے میں جگہ ملی۔

رومیوں نے ترقی کی تو انہیں مذکورہ بالا صفات سے، انگریزی مورخ فرونڈ انہیں فرمانرواؤں کی قوم کے نام سے یاد کرتے ہیں، وہ فرماں روا تھے اپنے نفس کے اوپر اپنے اقوال کے اوپر اپنے اعمال کے اوپر اپنے افعال کے اوپر

اپنی خواہشات کے اوپر اپنے جذبات کے اوپر۔ اپنی حرکات سکنات کے اوپر اپنی صفات اور خصوصیات کی بدولت وہ عہدِ ماضی کی دنیا سے تہذیب کے ثمرِ اولین کہلائے۔ اگر جونہی انہوں نے پابندیٔ قانون اور التزام ضابطہ سے منہ موڑا اور اپنے تئیں قانون اور ضابطہ سے مستثنیٰ اور مبرا سمجھنے لگے انکے سب کاروبار ہی بگڑ گئے، انکے دورِ آخری کی آزادی آزادی ہی نہیں تھی بلکہ مادر پدر آزادی تھی جسے انگریزی میں لائسنس کہتے ہیں۔ خدا ہر ایک قوم کو، ہر ایک فرد کو اس سے بچائے، یہ کیا افراد کے اور کیا اقوام کے لئے سمِ قاتل اور زہر ہلاہل ہے۔

بھائی! دنیا میں کوئی متنفس آزاد نہیں، متمدن آدمی پابند ہے گھر گھاٹ کا، رشتہ داروں کا، سوسائٹی کا، قانون کا، گورنمنٹ کا، مذہب کا، صاحب! جو آدمی دنیا سے بالکل قطع تعلق کر چکا ہے وہ بھی تو آزاد نہیں۔ اسبارہ میں کسی روشن خیال نے کیا خوب کہا ہے ؎

کہ کرد قطعِ تعلق کدام شد آزاد؟
بریدہ زہمہ با خدا گرفتار است

پس آزادی خوشگوار پابندی کا نام ہے۔

(مسلم) (اونگھ کر) رات کے دو بج چکے تھے، صاحب! کہیں آزادی ہے بھی؟

(رحمت) ارے کیوں نہیں؟ آزادی صفت ہے روح کی اور اس کیفیتِ روح کی جس میں نہ طول ہو نہ عرض، نہ جوہر ہو نہ عمق، جہاں وہ بندشوں سے آزاد ہو اور آلائشوں سے پاک، علمِ مافوق الطبیعۃ کے بہترین علامہ عارفِ روم وابستگانِ اسباب و علل کے بارے میں کہ گئے ہیں ؎

خشک بر تیغِ طبیعت چوں قدید
بستہ واُستا جانش لا یزید

صحیح آزادی کا خطہ ہی وہ اور تبلاتے ہیں ؎

واں فضائے خرق و اسبابِ علل
ہست ارض اللہ اے صدرِ اجل

یہ وہ خطہ ہے، یہ وہ سرزمین ہے جہاں اسبابِ ظاہری محض بیکار ہیں۔ جہاں گوشِ بینی شدن جانتا ہے اور دہن چشم شدن یہاں کے رہنے والے عارف کہلاتے ہیں جو دنیاوی اسباب و علل کی منزل سے گزر کر کسی بالائی طبقہ میں پرواز کرتے ہیں ؎

راست گفت است آں شہِ شیریں زباں
چشم گرد د مو بہ موے عارفاں

. . . .

مسلم سُن رہے ہو؟
مگر اتنے میں مسلم کی آزادی باوجود انکی کوششوں کے نیند کی پابندی سے مغلوب ہو چکی تھی اور وہ خرّاٹے مار کر سو رہے تھے۔
(رحمت) افسوس کہ یہ کہانی ناتمام رہ گئی۔

غلام محمدؐ طور ایم۔ اے ایڈیٹر

اشرف المخلوقات

ذیل کا پرمغز، معنی خیز، اور فلسفیانہ مضمون ہمارے فاضل دوست خواجہ غلام نقشبند صاحب بی۔اے کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، کچھ شک نہیں کہ آپ مخزن سبھا میں عرصہ کی غیر حاضری کے بعد تشریف لائے ہیں، مگر ہماری زبانِ شکایت کے لئے مکمل نہیں سکتی کیونکہ آپ اِس محبوبانہ عز و ناز سے آئے ہیں اور ہاتھ میں وہ ارمغانِ جواہر معانی لئے ہوئے ہیں کہ سبھا کے جملہ اراکین بیاختہ پڑھ رہے ہیں؂

گر بر سرِ چشم من نشینی ۔۔۔ نازت بکشم کہ نازنینی

ہم اس محبانہ تحفہ کو شکریہ سے قبول کرتے ہیں، مگر ہماری طبیعت کچھ ایسی بیتابانہ للچا رہی ہے۔ کہ اِس قسم کے اور تحائف کی درخواست کرنا ہم معیوب نہیں سمجھتے، امید کہ آپ ہمیں نگاہِ توجہ سے محروم نہیں رکھینگے

(طور)

سناٹا۔ سناٹا۔ سب طرف سناٹا۔ ہوا تک نہیں سرکتی۔ چڑیا تک نہیں پھڑکتی۔ اندھیرا گھپ۔ تاریکی۔ چار کونٹ میں اندھیرا۔ شش جہت میں اندھیرا۔ کچھ سوجھتا نہیں۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مگر دکھائی کیا دے۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ کوئی شے موجود نہیں۔ زمین۔ آسمان۔ چاند۔ ستارے۔ پانی۔ ہوا۔ کسی چیز کا وجود نہیں۔ خدا کی خدائی

سونی پڑی ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ ایک ذات باری ہے اور بس۔
لیکن خواہش نمود حسن کی صفت لازمی ہے۔ شاہد ازل کو بھی نمودِ حسن کا شوق دامنگیر ہوتا ہے۔ یہاں کیا دیر ہے۔ صرف ارادہ چاہیئے۔ قوی سے فعل میں آ جانا اُس کا لازمی نتیجہ ہے۔ ارادہ ہوا۔ اور چار دانگ میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ ہیولیٰ اور قوت توام معرض وجود میں آگئے ہیں۔ تمام خلا ذراتِ ہیولیٰ سے معمور ہو گیا ہے۔ ہر ذرہ میں خدائی قوت کا ظہور ہے۔ کہ دایمی اور استمراری حرکت میں ہے۔ اور کبھی تھکتا نہیں۔ گو ہر ذرہ اس قدر چھوٹا ہے کہ قوی ترین دوربین بھی انسانی آنکھوں پر اس کی صورت ظاہر نہیں کر سکتی۔ اور انسانی تصور بھی اُس کے حجم کی قلت کا قیاس کرنے سے قاصر ہے۔ گر وہ موجود ہے اور حرکت میں ہے۔ شش جہت میں حرکت کر رہا ہے۔ ایک مرکز ہر ذرہ کے لئے مخصوص ہے۔ مگر اس کا حلقہ حرکت محاذ کے حلقہ جات میں کھچڑی ہو رہا ہے۔ ذرہ حرکت اضطراری کرتا ہے آگے پیچھے اوپر نیچے آتا جاتا ہے۔ مگر ہر حرکت میں اپنے مرکز پر سے گذرتا ہے۔ اور ہر وقت و ہر آن اسی طرح تانا بانا بنے جاتا ہے۔

گو خلا لا محدود ہے اور خدا کی خدائی لامتناہی۔ گر مادہ بھی لاانتہا پیدا کر دیا گیا ہے۔ کوئی کونا کھدرا ایسا نہیں جس پر مادہ نے قبضہ نہ کر رکھا ہو۔ گو مادہ نہایت ہی لطیف صورت میں ہے۔ اور تمام صفات مادی سے معرا ہے۔ اور اس پر سوائے ہیولیٰ کے اور کوئی نام چسپاں ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ وہ سونا ہے نہ چاندی۔ نہ لوہا ہے نہ لکڑی۔ مگر مادہ ضرور ہے۔ اور اس کے ذرات ہر وقت اضطراری

حرکت میں مشغول ہیں۔ ہر ذرہ کے لئے مرکز گو مختص ہے۔ مگر وہ اپنے کھیل کود میں دوسرے ذروں کی راس قطع کرتا ہے۔ یہ مداخلت بیجا آخرا پنا رنگ لائی۔ دوسروں کے مال پر یہ دست درازیاں آخر کب تک جاری رہتیں۔ ایسے مواقع بھی پیدا ہوئے کہ اضطرار میں ایک ذرہ دوسرے سے لڑ گیا۔ یہ بے جان ذرے جن میں نہ خصومت کا مادہ ہے نہ محبت کا۔ قضا و قدر کے اٹل قانون کے مطابق آپس میں لڑ گئے۔ اور لڑے تو ایسے کہ ایک دوسرے میں فنا ہو گئے۔ اور پیوست ہو کر ایک ہو گئے۔ اور ایسے پیوست ہوئے کہ تحلیل کیمیادی میں بھی یہ قدرت نہیں کہ اب اُن کو جدا کر سکے۔ یہ جو نیا ذرہ پیدا ہوا۔ اس کا نام سالمہ Molecule رکھا گیا۔ کیونکہ اس کی تحلیل ممکن نہیں۔ ان سالمات کو دیکھو تو اپنے مورث ذرہ ہیولی سے شکل و شباہت میں صفت و خاصیت میں بالکل جدا۔ بالکل نرالے۔ ذرات میں حرکت اضطراری تھی شش جہت میں حرکت کرتے تھے۔ اور دائمی اور استمراری حرکت میں مشغول تھے۔ لیکن سالمہ چونکہ دو ذرات پر مشتمل ہے۔ ایک کی حرکت دوسرے کو مانع آتی ہے۔ لہذا حرکت اضطراری کی جگہ حرکت سمتی پیدا ہو گئی ہے۔ یعنے دو مختلف السمت حرکتوں نے مل کر ایک تیسری سمت کی حرکت پیدا کر دی ہے۔ اور اسی حرکت سمتی کا نام ثقل ہے۔ جب تک حرکت اضطراری تھی ثقل کا ظہور ممکن نہ تھا۔ کیونکہ شش جہت کی طرف میلان برابر تھا۔ اب ایک خاص سمت میں حرکت پیدا ہوئی تو ایک خاص سمت کا میلان مرجح ہو گیا۔ اور یہی ثقل ہے۔ جب تک حرکت اضطراری تھی ہر ذرہ اپنی مضمرہ قوت کو تمام

کمال صرف کر رہا تھا۔ اب حرکت سمتی میں کچھ قوت پس انداز ہونے لگی۔
اس زاید قوت نے جذب کی صورت میں ظہور کیا۔ اور ہر سالمہ دوسرے سالمہ
کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہوا۔ ذرات ہیں کہ حرکت
اضطراری کر رہے ہیں مگر اپنے مرکز کو نہیں چھوڑتے۔ سالمات ہیں کہ
انکے لئے کوئی مرکز خاص نہیں۔ سیدھے ایک دوسرے کی طرف دوڑے
چلے جاتے ہیں۔ اور تمام ذرات کے راستے قطع کرکے نکل رہے ہیں۔
آخر سالمات کو بھی وہی صورت پیش آئی جو ذرات کو آئی تھی۔ راستے
میں کسی سالمہ کی کسی ذرے سے ٹکر ہو گئی۔ اور سالمہ کے دو ذروں کے
ساتھ تیسرا ذرہ اور پیوست ہو گیا۔ اور ایسا ایک جان ہو گیا کہ اب اسکو
جدا کرنا ممکن ہی نہیں دو ذرات کا سالمہ صفات و خواص میں ہیولی
سے بالکل مختلف تھا اور بجاے خود ایک عنصر تھا۔ لیکن اب تین ذرہ
کے سالمے نے سابقہ عنصر سے بھی جداگانہ خواص ظاہر کئے۔ اور بجاے
خود ایک عنصر ہو گیا۔ اسیطرح یہ کھیل لاکھوں کروڑوں برس جاری
رہا۔ کوئی دو ذرہ کا سالمہ۔ کوئی تین کا۔ کوئی چار کا بن گیا۔ اور وہ
تمام عناصر پیدا ہو گئے جن سے آیندہ خدا کی کائنات کی تعمیر
ہو گی۔

برسیں گذریں۔ صدیاں گزریں۔ لاکھوں برس گذر گئے۔ لیکن عرصہ
کا ٹھیک اندازہ ممکن نہیں۔ کیونکہ قدرت نے اپنی کلاک آفتاب حال
درست نہیں کی۔ غرض نوماتوں پر زمانے گذر رہے ہیں اور قدرت تا
حال وہی تماشہ دیکھ رہی ہے۔ کائنات میں وہی کھیل جاری ہے۔
ذرات ہیولی اپنی حرکت اضطراری میں مشغول ہیں۔ سالمات پیدا ہوتے

ہیں اور اپنی حرکت سمتی میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ اپنے مضمر جذب کی وجہ سے ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ جہاں دو ہم جنس سالمات جمع ہوئے وہ پیوست ہو گئے۔ گو تحصیل کیمیاوی اُن کو جدا کر سکتی ہے۔ مگر آلات میخانکی (Mechanics) سے اُن کی تفریق ممکن نہیں۔ اس لئے مجتمع سالمات کو اجزاے لا یتجزی (Molecules) کا نام دیا گیا۔ متعدد ہم جنس سالمات کے یکجا ہونے سے انکی حرکت میں جس قدر کمی ہوتی ہے اُسی قدر اُن کی جذب و ثقل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح سالمات و اجزاے کی روش ذرات سے بالکل جداگانہ ہو گئی ہے۔

سالمات کی تکوین کیوجہ سے گو ذرات کی تعداد میں کمی ہو گئی ہے اور ہیولے لطیف تر ہو گیا ہے لیکن پھر بھی کائناتِ جو میں ذرات یکساں طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بخلاف اس کے سالمات جذب و ثقل کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ گروہوں میں جمع ہو گئے ہیں۔ یہاں سالمات کا ایک مجمع ہے تو وہاں دوسرا۔ جذب انکو باہم دگر اور قریب تر کئے دیتا ہے۔ یہ کوئی تخصیص نہیں کہ ہم جنس ہم جنس سے ملے۔ بلکہ ہم جنس و غیر جنس سالمات۔ و اجزاے برابر ایک دوسرے کیطرف کھچے چلے آتے ہیں۔ اور جو جس سے ٹکرا گیا اُسی سے پیوست ہو جاتا ہے۔

ذرات کی پیوستگی نے عناصر پیدا کئے۔ سالمات مختلف الجنس کی پیوستگی سے مرکبات کا ظہور ہوا۔ اور وہ منظر نظر آیا کہ دیدنی تھا نہ شنید۔ سالمات غیر جنس جمع ہوئے تو انکی حرکت سمتی میں بھی فرق نہ آیا۔ جذب و ثقل تو پہلے ہی موجود تھے۔ فاضلہ قوت نے حرارت کی شکل میں ظہور کیا۔

کائنات جو میں جا بجا اجزا سے کا مجمع نظر آرہا ہے۔ اجزا سے اکٹھے ہو ہو کر بڑے بڑے کرے بن گئے ہیں ہر ایک کرہ اتنا بڑا ہے کہ ہمارا کل نظام شمسی اس کے ایک کونے میں سما جائے اور کسی کو خبر نہ ہو۔ گو ہر کرہ بظاہر اجزا سے لاتیجزی پر مشتمل ہے۔ مگر بین الاجزا سے خلا موجود ہے۔ جس میں ذرات ہیولی کی آمدوشد اسیطرح جاری ہے گویا کوئی کرہ بنا ہی نہیں۔

الغرض کائنات ہیولی سے معمور ہے اور ہیولی میں بے تعداد کرات تیرتے پھرتے ہیں جن کا حجم گمان و قیاس سے بزرگتر ہے۔ ذرات کی اضطراری حرکت نے حرکت محوری پیدا کر دی ہے اور سالمات کی حرکت سمتی نے حرکت مداری کی صورت میں ظہور کیا ہے۔ اس لئے ہر کرہ لڑھکتا پڑکتا بھاگا چلا جاتا ہے۔ حرکت اجزا سے کی وجہ سے حرارت میں شدت ہو گئی ہے۔ اور فرط حرارت سے اجزا سے سرخ ہو کر سفید ہو گئے ہیں جن سے روشنی نکل رہی ہے۔ ہر کرہ بقعہ نور نظر آتا ہے۔ کائنات میں چاروں طرف نور ہی نور برس رہا ہے۔ آج تخلیق عالم کا پہلا دن ہے اور دنیا اپنی پیدائش کی خوشی میں چراغان کر رہی ہے۔

ہر کرہ بقعہ نور بھی ہے اور آتشکدہ نمرود بھی۔ کوئی عنصر یا مرکب ایسا نہیں جو اس شدید حرارت کی مقاومت کر سکے۔ گو جذب کی وجہ سے اجزا سے باہم ہیں۔ اور مجموعہ اجزا سے کو کرہ کی شکل حاصل ہے۔ مگر تمام عناصر و مرکبات پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔ کشش متنفر المرکز کے غلبہ کی وجہ سے تمام کرہ جات خط استوی پر پھول گئے ہیں اور اپنی قطبین کی طرف سے سکڑ گئے ہیں۔ مگر اپنے کام میں مصروف ہیں۔ لڑھکتے پڑکتے دوڑے

چلے جاتے ہیں۔

کرہ جات کے قریب حرارت شدت کی ہے۔ مگر جس قدر بُعد بڑھتا ہے اُسی قدر حرارت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض حصص کائنات میں حرارت یونہی نام کو پہنچتی ہے۔ دنیا کا مزاج اعتدال پر نہیں۔ کہیں سخت گرمی اور کہیں سردی +

کشش متنفر المرکز اپنا رنگ لاتی ہے۔ کرات اپنے محور پر گردش کرتے ہیں تو انہیں سے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر اسطرح دور نکل جاتے ہیں۔ جسطرح گوپئے میں سے پتھر۔ مگر جو ٹکڑا ٹوٹتا ہے وہ بجائے خود بقعہ نور ہے اور آفتاب کا ہمسر۔ کل کائنات میں آتشبازی چھوٹ رہی ہے۔ اور پھل جھڑی کا سماں پیش نظر ہے۔

جو ٹکڑا ٹوٹتا ہے وہ اپنے مورث سے کچھ فاصلہ پر جا کر رُک جاتا ہے۔ تنفر مرکز پر جذب غالب آجاتا ہے۔ اور یہ ٹکڑا اپنے مورث کے گرد طواف کرنے لگتا ہے۔ اس طرح ایک آفتاب کے کئی آفتاب بن جاتے ہیں۔ اور ایک کرے سے دوسرے کرے تک سردی و گرمی کے جو مدارج تھے۔ انمیں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ بین الکرتین سخت سرد مقامات کی تعداد میں اور شدت برد میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور دنیا کا مزاج اعتدال پر آجاتا ہے۔

جب مزاج کائنات میں اعتدال پر آیا تو ایک نیا کھیل شروع ہوا۔ جسکی آج تک نظیر نہ تھی۔ اب تک تو یہی حالت رہی کہ دو مختلف الجنس سالمات جمع ہوئے تو ایک مرکب بنا۔ اس مرکب میں ایک تیسرا سالمہ مل گیا۔ تو دوسرا مرکب پیدا ہو گیا۔ اور اس دوسرے مرکب میں ایک چوتھا

سالمہ مل گیا تو تیسرا مرکب پیدا ہو گیا۔ اور اس طرح جملہ معدنیات کا ظہور ہو گیا۔ مگر اعتدال نے ایک نئی خلقت کی بنیاد رکھی۔ چار عناصر (آکسیجن) نائیٹروجن۔ کاربن۔ ہائیڈروجن) ایک ہی وقت میں باہم مل کر ترکیب پانے لگے۔ اور ایک ایسا مرکب پیدا ہو گیا۔ جو اس زمانہ سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا اور نہ بعد میں کبھی ہوا۔ چار سالمات کے مرکبات (مرکبات رباعہ) تو معدنیات میں بھی موجود ہیں مگر وہ سب اسطرح بنے ہیں کہ یکے بعد دیگرے سالمات مخلوط ہوتے گئے ہیں۔ یعنے پہلے دو ملے۔ پھر وہیں تیسرا۔ اور پھر تین میں چوتھا لیکن مرکب زیر بحث ان سب سے بالکل جداگانہ ہے۔ ایک ہی وقت میں چار عناصر باہم ترکیب پا گئے ہیں۔ اور ایک ایسا جزو لاتیجزے پیدا ہوا ہے۔ جس کے خواص دیگر معدنیات سے بالکل نرالے ہیں۔

اس جزو میں حس ہے ادراک ہے ارادہ ہے اور قوت نامیہ ہے۔ (قوت نامیہ حقیقت میں جذب ہے۔ مگر جذب منتظم) ان اجزا سے کو روح کہئے۔ خواہ جان۔ یا جانداروں کی جان۔ زبان سائنس میں اِسے Protoplasm یعنے ابتداءِ تخلیق کہتے ہیں اور آئندہ اسی جوہر سے تمام اشیاء نامیہ کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ جوہر کائنات جو میں پھیل کر اپنے کھیل میں مشغول ہو گئے ہیں۔

اس کرہ سے جسے اہل زمین آفتاب کہتے ہیں بہت سے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہوئے ہیں۔ جو انگارے کیطرح دہکتے چمکتے اور بجائے خود آفتاب ہیں۔ جن میں سے ایک ٹکڑا وہ ہے جسے آئندہ زمین کا لقب دیا جائے گا۔ اور اشرف المخلوقات کا مسکن

ہونے کا فخر عطا ہو گا۔

یہ ٹکڑہ آفتاب سے معتدل فاصلہ پر آکر رُک گیا ہے۔ اور حجم میں بھی متوسط ہے۔ گو اطال تو اسی قدر گرم اور اسیقدر پر نور ہے جس قدر آفتاب خود۔ مگر چونکہ قد میں چھوٹا ہے۔ اس لئے اس میں مقدار حرارت کم ہے۔ اور آفتاب سے اتنے فاصلہ پر ہے کہ نہ تو آفتاب کی حرارت اسے جلا کر کوئلہ کرتی ہے اور نہ سرد ہو کر یخ بستہ ہونے دیتی ہے۔ یہ ٹکڑہ اہل قانون قدرت کی وجہ سے حرکت محوری و مداری میں مبتلا اور سرگردان ہے۔ اپنے مورث آفتاب کے گرد طواف بھی کرتا ہے اور اپنے محور پر گھومتا بھی ہے۔ حرارت زیادہ ہے۔ اس لئے جذب اجزا سے پر متنفر المرکز غالب آجاتا ہے۔ خط استوی پر پھولتا جاتا ہے اور قطبین کی طرف سے سکڑتا جاتا ہے۔ حتےٰ کہ اس میں سے ایک ٹکڑہ ٹوٹ کر اسی کے گرد گردش کرنے لگتا ہے اور اس زمین کا چاند کہلاتا ہے۔ مگر چونکہ چاند زمین سے بہت ہی چھوٹا ہے اسلئے جلد تر سرد ہو کر ماند پڑ جاتا ہے۔ اور اشیاء نامیہ کی بود و باش کے قابل نہیں رہتا۔ ہر کرہ گرداں کے خط استوی پر متنفر المرکز کا اثر باقی حصص سے مقابلتاً زیادہ پڑتا ہے اس لئے آفتاب میں سے جس قدر ٹکڑے ٹوٹے ہیں وہ سب خط استوی پر سے ٹوٹے ہیں اور اسی کی سیدھ میں دوڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اگر نظام شمسی کے جملہ مدارہا کو ایک سطح مانا جائے تو آفتاب کا محور اس سطح پر عموداً واقع ہو گا۔ لیکن آفتاب کا جرم چونکہ ایک عنصر سے نہیں بنا بلکہ مختلف عناصر و مرکبات سے بنا ہے اس لئے حرارت کا اثر سب جگہ یکساں

نہیں۔ بعض حصص آفتاب حرارت سے زیادہ نرم ہو گئے ہیں بعض کم۔ کم نرم شدہ حصص میں جذب زیادہ ہے اور تنفر المرکز کا مقابلہ کرنے کی استعداد باقی ہے۔ بخلاف اس کے نرم حصص تنفر المرکز سے جلد متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر ٹکڑہ ٹھیک خط استوی پر سے ٹوٹے۔ بلکہ استوی کے قریب کے نرم حصص ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہو رہے ہیں۔ اگر ٹھیک خط استوی پر سے کوئی ٹکڑا ٹوٹے تو اس ٹکڑے کا محور آفتاب کے محور سے متوازی ہوگا۔ اور اسکا خط استوی کے محاذ۔ لیکن چونکہ خط استوی سے ذرا ادھر ادھر سے ٹکڑے ٹوٹتے رہے ہیں اس لئے اُن کے محور آفتاب کے محور کے ٹھیک متوازی نہیں۔ اور نہ ہی خط استوی آفتاب کے خط استوی کے عین مقابل ہیں۔ یہی حالت زمین کی بھی ہے۔

ہاں تو زمین آفتاب میں سے ٹوٹ کر جدا ہوئی اور تیر کیطرح سیدھی نکل گئی۔ حرارت سے سرخ انگارہ بلکہ سفید آفتاب۔ اور نرمی میں صابن کا بلبلا۔ آفتاب سے متنفر ہو کر دوڑ تو گئی ہے۔ لیکن کب تک۔ کہاں تک۔ آخر دیرینہ ہم نشینی کی محبت نے جذب کی صورت میں ظاہر ہو کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ زمین کی گریز تو رک گئی۔ آفتاب کے فیض سے جسم پایا تھا۔ اُسی کے اثر سے حرکت محوری اور مداری حاصل کی تھی۔ اُسی کے گرد طواف کرنے لگی۔

یہ مرکبات کا بلبلہ آفتاب کے گرد طواف کر رہا ہے۔ صدیاں گذر گئیں۔ ہزاروں برس گذر گئے۔ مگر اس کی آگ نہیں بجھتی پر نہیں بجھتی۔ اسی طرح

شعلہ زن۔ نمونۂ آفتاب بن رہا ہے۔ سرگرداں ہے کہ یہ لگی کسی طرح بجھ جائے۔ پر ابھی وقت نہیں آیا۔ اور زمانوں پر زمانے گذر گئے۔ آخر اُس کی حرارت میں کچھ کمی آگئی۔ زمین جوان ہو چلی ہے۔ وہ بچپن کی شوخیاں نکل چلی ہیں۔ شعلے اب نہیں اُٹھتے۔ گو انگارہ سی سرخ ہو رہی ہے۔ تمام جسم کھدبدا رہا ہے۔ مگر وہ گرمیاں باقی نہیں۔ شعلہ زنی کی حالت میں تو ممکن نہ تھا کہ پانی سیال رہ سکتا۔ پانی تو موجود نہ تھا مگر سب دخان کی صورت میں۔ اب جو شعلے بند ہو گئے تو تمام کرہ بادکرہ آب ہو گیا۔ موسلا دھار بارش پڑنے لگی۔ اور وہ جھڑی لگی کہ نہ آج تھمی نہ کل۔ برسیں گذریں۔ صدیاں روبہ قفا ہو گئیں۔ لیکن بارش نہیں تھمتی پر نہیں تھمی۔ زمین پر لبیوں پانی چڑھا۔ بانسوں پر چڑھ گیا۔ مگر سب طرف سے آب پوش ہے۔ ایک کرۂ آب نظر آ رہا ہے۔ ظاہر جلد تو سرد ہو کر سخت ہو گئی ہے۔ جس طرح کدو پر چھلکا۔ مگر اندر سے ویسی ہی گرم ہے اور کھدبدا رہی ہے۔ صدیوں پانی برسا ہے مگر اس برسات نے دل کی لگی نہیں بجھائی۔ زمین کا گودا تا حال گرم انگارہ ہے۔ باہر کا چھلکا سرد ہو کر سکڑنے لگا ہے۔ مگر گودا اسطرح پھولا ہوا ہے۔ چھلکا سکڑنا چاہتا ہے مگر جگہ نہیں پاتا۔ اور جگہ جگہ سے پھٹ جاتا ہے۔ گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ پانی ان گڑھوں میں گھستا ہے اور گرم گودے کے ساتھ مس کر کے دخان بن جاتا ہے۔ اوپر سیال پانی نیچے آتش مجسم گودا۔ ان دونوں کی سطح مماس پر دخان پیدا ہوتا ہے۔ اُسے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ مجبوراً زمین کے

چھلکے اور گودے کے درمیان جو خفیف سا فصل ہے اُس میں گھس جاتا ہے گودے کی حرارت اُسے اور زیادہ گرم کر دیتی ہے اور اس میں بے انتہا قوت پیدا ہو جاتی ہے یہ نکلنے کی راہ ڈھونڈتا ہے چھلکا کانپنے لگتا ہے۔ زمین کی بوٹی بوٹی تھراتی ہے۔ اور جوڑ بند ہل جاتے ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ شور نشور ہوتا ہے۔ اور آخر چھلکا ٹوٹ جاتا ہے۔ جس میں سے دخان خارج ہوتا ہے اور کچھ پگھلا ہوا گودا باہر بہ نکلتا ہے۔ جہاں سے گودا نکلا وہاں جگہ خالی ہو جاتی ہے۔ چھلکا بے سہارے ہو کر کانپنے لگتا ہے اور آخر ٹوٹ کر اندر کو گر پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہتا ہے۔ پانی بار بار گودے سے مس کرتا ہے۔ بار بار زلزلے آتے ہیں۔ اور زمین رقاصہ کائنات بنی ہوئی اُچھلتی کودتی ناچتی چلی جاتی ہے۔ حتی کہ گودے کی سطح مس آب سے سرد ہو جاتی ہے۔ خود گودا اسکڑ جاتا ہے اور اس پر ایک اور چھلکا جم جاتا ہے۔ باہر کا چھلکا چونکہ محیط میں بڑا تھا اس لئے وہ بے سہارے رہ جاتا ہے اور ٹوٹ کر اندر جا گرتا ہے۔ تھوڑی جگہ پر بہت سا غلبہ پڑتا ہے۔ اس لئے کہیں پہاڑ بن جاتے ہیں کہیں سمندر کے سے گڑھے رہ جاتے ہیں۔ پانی گڑھوں میں گھس جاتا ہے اور پہاڑ چوٹی کی طرح نمودار ہو جاتے ہیں۔ مگر سمندر ابھی اتنا گہرا نہیں کہ کل پانی اس میں سما سکے۔ اس لئے سطح مرتفع پر بھی تھوڑا بہت پانی رہ جاتا ہے۔ خشک زمین تلاش کرو تو شاید پہاڑوں کی چوٹیوں پر ملے۔ ورنہ کل زمین وقعت آب ہو رہی ہے۔ جہاں سمندر نہیں۔ وہاں دلدل ہے۔ اور تا حال حرارت کا یہ عالم ہے کہ سمندر کا پانی تک

کھول رہا ہے۔

زمین کی ہیئت تو بظاہر موجودہ صورت کے قریب ہوگئی ہے۔ پہاڑ بھی ہیں ہموار زمین بھی۔ اور سمندر بھی۔ مگر پہاڑ تنگ و شرنگ تپ رہے ہیں۔ زمین ولدل ہو رہی ہے۔ سمندر کھول رہے ہیں اور حرارت کا یہ عالم ہے کہ زمین کا کلیجہ پگھل کر پانی ہو رہا ہے۔ پانی دخان بن رہا ہے۔ دن میں بیسیوں دفعہ زلزلے آتے ہیں اور اس شدت کے کہ پہاڑوں کی جڑھیں ہل جاتی ہیں۔ آج سمندر کی چوٹی اڑ گئی اور سمندر میں گر کر سمندر پاٹ دیا۔ کل سمندر کا پیندا اندرونی دخان کے زور سے اٹھا اور دھول گڑھی کی چوٹی سے اونچا نکل گیا۔ دوسری طرف ایک پہاڑ زمین میں دھنس گیا اور وہاں سمندر بن گیا۔ بارش ہے کہ لگاتار جاری ہے۔ اس کا تار ٹوٹتا ہی نہیں۔ بادل گرجتے ہیں بجلیاں کوندتی ہیں۔ مطلع تیرہ و تار ہو رہا ہے۔ طوفان اٹھتے ہیں جھکڑ آتے ہیں غرض ایک حشر بپا ہے۔ اور زمین دیوانوں کی طرح دوڑی چلی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں اگر موجودہ درخت و حیوانات پیدا کر دئے جاتے تو وہ کیا پھلتے پھولتے اور کیونکر زندہ رہتے۔ لیکن قدرت اپنی تدابیر میں بند نہیں۔ جواہر روحی (یعنے اجزاے ابتدار التخلیق) کے نام حکم پہونچتا ہے۔ ان کا ترشح سطح ارض پر ہونے لگتا ہے۔ درخت نکل آتے ہیں۔ زمین کی جوانی کی اولاد ہیں۔ حرارت و رطوبت کا وفور ہے۔ ایسے سر بفلک۔ اس قدر بلند و بالا کہ اہرام مصر اور مینار ایفل اُن کے پاؤں چومیں۔ حیوان ہی پیدا ہو گئے ہیں۔ شکل میں تھنگ کے سے

عادت میں مینڈک کے سے- پانی میں بھی رہیں اور خشکی میں بھی- دلدل میں
پڑے لوٹا کرتے ہیں- مگر ایسے دیو قامت ہیں کہ جب پچھلی ٹانگوں پر سیدھے
کھڑے ہوتے ہیں تو سر بہ فلک درختوں کی چوٹیوں سے منہ ملا دیتے ہیں
کونپلیں توڑ کر کھاتے ہیں اور آتش شکم بجھا کر پھر دلدل میں لوٹ پوٹ
ہو جاتے ہیں-

اشیاء نامیہ کا یہ اول دور ہے- مدتوں تک یہ دور قایم رہتا ہے- کل
سطح ارض پھر انہیں جنوں کی سلطنت ہے- سب طرف ان کا سلسلہ
چل رہا ہے- کروبیاں تماشائی ہیں اور محو حیرت- کہ ان عظیم الجثہ قوی
القوی مکروہ صورت حیوانوں سے دنیا کی مخلصی کیونکر ہو گی-

مگر دنیا میں ثبات صرف ایک ذات باری کو ہے- ابھی زمین کے نمو
کے دن ہیں- اس نے ابھی کئی رنگ بدلنے ہیں- گولا سرد ہو رہا ہے-
سطح جب کافی سرد ہو گئی تو اس کا حجم اور کم ہو گیا- یہ سکڑا- چھلکا بے
سہارے رہ گیا- تھرایا کانپا- پھٹا اور ٹوٹ کر ملبہ ہو کر گولے کی سطح پر
گر پڑا- تمام دیو قامت درخت- سب دیو سار حیوان ملبہ میں دفن ہو گئے-
یہی دفن شدہ درخت اب حضرت انسان کے لئے معدنی کوئلہ کا مخزن ہیں
اور انہیں حیوانوں کے ڈھانچ آج کل کے عالمان طبقات ارض کی قوت
تخیلہ کے لئے معیار امتحان ہیں-

گولا سکڑ کر مقابلتاً بہت چھوٹا ہو گیا ہے- ملبہ کی مقدار مقابلتاً بہت
زیادہ ہے اس لئے سمندر بہت گہرے- پہاڑ بہت بلند بن گئے ہیں-
تمام پانی سمندروں میں سما گیا ہے- زمین خشک نکل آئی ہے-
دلدل مقابلتاً بہت کم رہ گئی ہے- اور گولے کی آگ پر بہت سی خاک

پڑ گئی ہے۔ اس لئے وہ بھی ذرا دب سی گئی ہے۔ اور سابقہ شدت سے اب ظاہر نہیں ہو سکتی۔ پانی بھی جلد تر گودے سے مس نہیں کر سکتا۔ اسلئے پہلے سے سخت زلزے نہیں آتے۔ سمندر نہیں کھولتے۔ مگر جس قدر ظہور حرارت کم ہو گیا ہے۔ اسی قدر قیام حرارت کا زمانہ بڑھ گیا ہے۔ اب یہ گودہ اربوں برس اندر ہی اندر سلگا کرے گا۔

اب نئے انداز سے دنیا سجائی جاتی ہے۔ نئے انتظام ہوتے ہیں۔ نئی قسم کے درخت اور نئی وضع کے حیوانات تخلیق ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا دور بھی زمانوں تک قایم رہتا ہے مگر آخر فنا آخر فنا۔ ایک دن اس کے دن بھی ختم ہو گئے۔ اس قدر مدت سے گودے کا بخار بند تھا۔ وہ قیامت بن کر اوٹھا اور دوسرے دور کو بھی دفن خاک کر گیا۔

اسیطرح اس زال دنیا نے بہت سے بچے پیدا کئے۔ اور وہ پھر اوسی کے پیٹ میں سما گئے۔ کئی دور آئے کئی بساطیں اُلٹی گئیں۔ حتے کہ زمین کا چھلکا اس قدر موٹا ہو گیا کہ گودے کی حرارت بالکل دب گئی۔ ظاہر زمین پر اندرونی حرارت کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ آیندہ ساکنان ارض اپنی زیست کے لئے حرارت آفتاب کے محتاج ہونگے۔ اس یکایکی تغیر نے قطبین پر برف کے تودے لگا دئے۔ سیکڑوں فٹ موٹی برف کی تہ جم گئی۔ اور یہ برف قطبین تک ہی محدود نہ رہی۔ بلکہ تمام یوروپ اور ایشیا کے اکثر شمالی حصہ نے نور کی چادر اوڑھ لی۔ اب زمین کا بوڑھاپا آگیا۔ وہ گرمیاں سرد پڑ گئیں۔ وہ شوخیاں باقی نہیں۔ نہ زلزلے ہیں نہ طوفان۔ نہ وہ بارش کا تار ہے۔ نہ بادل کی گرجیں۔ کل کرہ ارض ایک سکون کی حالت میں ہے۔ گردش

بھی کرتا ہے اور دوڑتا بھی ہے ۔ مگر اس کی چال اب بھونچال نہیں گھومتی بھی ہے اور چلتی بھی ہے ۔ مگر ایسی سبک روہے کہ ساکنانِ ارض کو اُس کی رفتار و حرکت کا علم تک نہیں ہوتا۔

گو زمین کا زمانہ انحطاط ہے لیکن قدرت اب بھی اُسے بیکار نہیں رہنے دیتی ۔ بال بچوں کی کثرت اُسے آزاد نہیں کرتی ۔ نئے درخت اور نئے حیوان پیدا کئے جاتے ہیں ۔ جو قد و قامت میں زور و طاقت میں سابقہ دور کے نباتات و حیوانات سے کوئی نسبت نہیں رکھتے ۔ کمزور ہیں اور زیادہ خبرگیری کے محتاج ۔ اور انکی خبرگیری اس بوڑھی زمین کے سپرد کی گئی ہے یہی درخت اور یہی حیوان ہیں جنھیں ہم آج دیکھ رہے ہیں ۔ انکے دور شروع ہونے کو بھی ہزاروں برس گذر گئے ہیں ۔ کل دنیا باغ ارم کا نمونہ بن رہی ہے ۔ حرارت آفتاب نے یورپ و ایشیا پر سے برف دائمی کو اوٹھا کر صرف قطبین تک محدود کر دیا ہے ۔ پہاڑوں پر بارش زیادہ پڑتی ہے ہموار زمین پر کم ۔ ہموار زمین پر دریا بہنے لگے ہیں فطرت نے کل زمین کو ایک باغ بنا رکھا ہے ۔ درختوں پر رنگ رنگ طیور نغمہ سنجی کر رہے ہیں ۔ زمین پر طرح طرح کے چرند اپنی کلیلوں میں مصروف ہیں ۔ سمندروں میں مچھلیاں اپنی تڑپ دکھا رہی ہیں ۔ زمین کا بوڑھاپا بڑھ رہا ہے ۔ سکون بڑھ رہا ہے سلیقہ بھی بڑھ رہا ہے ۔ اس زمانے میں ایک اور حیوان کی تخلیق ہوتی ہے ۔ بوڑھاپے میں یہ پیدا ہوا ۔ بوڑھوں کی اولاد کی طرح اس قدر کمزور و ناقص ہے کہ اُس کے ضعف و عجز کی مثال اولاد زمین میں

ناپید ہے۔ چار ٹانگوں میں سے پچھلی دو ٹانگیں تو اس لایق ہیں کہ اس کے جسم کا بوجھ اُٹھا سکیں۔ لیکن اگلی دو ٹانگیں کمزور اور ناقص ہیں۔ نقل و حرکت میں کوئی مدد دے نہیں سکتیں۔ اس حیوان سے پہلے کنگرو پیدا ہو چکا ہے اُس کی ٹانگوں کی حالت بھی بعینہٖ یہی ہے۔ مگر وہ اس ضعیف سے قرنوں پہلے پیدا ہوا ہے۔ جب فطرت میں مقابلتاً قوت زیادہ تھی۔ اگر اس کی اگلی ٹانگیں کمزور تھیں تو فطرت نے نعم البدل بھی دے دیا تھا۔ دُم کو نہایت مضبوط اور توانا کر دیا تھا۔ وہ چلنے پھرنے میں بیٹھنے اوٹھنے میں مدد دیتی تھی۔ اگر چار نہیں تو تین ٹانگیں تو تھیں۔ مگر اس اضعف المخلوقات کو اس کھولت کی اولاد کو یہ بات بھی نصیب نہیں۔ آپ خیر سے لنڈورے پیدا ہوئے ہیں۔ دُم جڑھ سے ندارد ہے۔ کنگرو کو تھوتھنی لمبی دی گئی تھی۔ اور اس پر سمت اُفقی میں آنکھیں لگی تھیں۔ جس سے وہ چار پاؤں کے بل چلنے پھرنے میں اپنا راستہ تو دیکھ سکتا تھا لیکن اس اضعف المخلوقات کا منہ بھی مختصر طباخی بنا یا گیا ہے اور اسکے سامنے آنکھیں جڑ دی گئی ہیں۔ کوتاہ گردن ہے۔ اگر چار پاؤں کے بل چلے تو آنکھیں زمین سے لگ جاتی ہیں۔ راستہ سوجھتا نہیں۔ گردن اُٹھا کر باقی جسم پر عمود گر رکھے تو آنکھیں سمت اُفقی میں آئیں اور راستہ دکھائی دے۔ لیکن گردن چھوٹی ہے اور اس طرح اُٹھانے میں تکلیف ہوتی ہے۔ دم گھٹتا ہے۔ حلق سوکھتا ہے۔ مجبوراً اُسے سیدھا کھڑا ہو کر چلنا پڑتا ہے۔ لیکن دو پاؤں پر۔ ایسے مختصر قاعدہ پر اس قدر طویل عمودی قد کو قایم رکھنا کوئی کھیل نہیں۔

کشش ثقل ہر حرکت میں روڑا اٹکاتی ہے - قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے اور منہ کے بل آ رہتا ہے - برسوں کی مشق کے بعد دو پاؤں پر کھڑے ہونا اور کھڑے ہو کر چلنا تو آ گیا - مگر وہ سرعت رفتار پیدا نہ ہوئی پر نہ ہوئی جو دیگر چارپاؤں کے حیوانوں میں پائی جاتی ہے۔

چلتا ہے تو اگلی ٹانگیں بیکار پہلوؤں کے ساتھ لٹک رہی ہیں۔ ابتدا میں تو جب قدم اوٹھاتا ہے ساتھ ہی ہاتھ بھی اوٹھتا ہے۔ مگر بتدریج یہ عادت چھوٹ گئی - اور ہاتھ فضول حرکت سے رک گئے - مگر تا حال یہ نہیں سمجھا کہ نقل و حرکت کے وقت ان سے کیا کام لیا جاوے - بتدریج ان سے گرفت کا کام لینے لگا - شکم پروری کے لئے پھلوں پہ ہاتھ بڑھایا - پیٹ نے خود ہنر سکھا دئے - درختوں پہ چڑھنے لگا - مگر وہ بات کہاں جو چار ہاتھ والے جیوانوں میں ہے - وہ بے تکلف و بے خطرہ ڈال ڈال اور پات پات گھوم رہے ہیں - مگر یہ حضرت اضعف المخلوقات ہیں کہ سہمے سہمے درخت کی موٹی موٹی شاخوں پر گھومتے ہیں اور جہاں تک ہاتھ کی رسائی ہے وہاں جیسے رسیدہ و نارسیدہ پھل دستیاب ہو جاتے ہیں ان سے آتش شکم سرد کر لیتے ہیں۔

جسم پر بال نہیں - بالوں کے نیچے کھال موٹی نہیں - کھال کے اندر چربی کی تہ دبیز نہیں - اس لئے نہ گرمی کا مقابلہ کر سکتا ہے نہ سردی کا - رات کو کونے کھدرے تلاش کرتا ہے - جہاں ہوا سے بارش سے آرام پائے - دن میں کبھی سردی سے ٹھٹھرا ہوا اکڑتا ہے - کبھی گرمی سے ہانپتا جاتا ہے - غرض چونکہ اپنی کوئی کل درست نہیں - اس لئے اسکے لئے دنیا دار المحن اور دار الامتحان بن رہی ہے۔

سر پر سینگ نہیں۔ دانت لمبے تیز اور مضبوط نہیں۔ ناخن کمزور ہیں۔ اور چیر پھاڑ کا کام دے نہیں سکتے۔ دوڑنے میں عاری۔ درخت پہ چڑھنے میں سست۔ نہتا۔ اپاہج قدرت نے بھی اسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ سردی۔ گرمی۔ بھوک۔ پیاس۔ حیوان۔ خاردار جھاڑیاں۔ سب اس کی جان کی دشمن ہیں۔ اسے ہر وقت و ہر آن اپنی جان کے للے پڑے رہتے ہیں۔ ہر وقت ملول و دل گرفتہ رہتا ہے۔ ڈر کے مارے جلوت سے خلوت کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو کسی سے تعرض نہیں کرتا۔ قدم قدم پر اسے اپنا عجز اپنا ضعف پیش نظر ہے۔ گو کوشش کرتا ہے۔ مگر ملال و غم کسی وقت پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہر وقت اوداس اور ہر وقت سوچ میں مستغرق رہتا ہے۔

سر اوٹھا کر چلنے کی عادت پر اضعف المخلوقات کو بڑا ناز ہے۔ اور اسکو وہ ایک مایہ شرف سمجھتا ہے۔ حالانکہ سیدھے چلنے کی وجہ اسکی اگلی ٹانگوں کا نقص ہے یہ تو وہی مثل ہے کہ نکٹا ناک والوں کو نکو بتائے۔ خیر یہ میاں سیدھا چلنے تو لگے۔ مگر یہ روش انسان کا شرف بڑھانے کی خاطر اپنے لازمی نتائج کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ چارپایوں پر چلنے سے چونکہ سہارا زیادہ ملتا ہے۔ اسلئے تنو رہ جسم عرض و عمق میں زیادہ بڑھ سکتا ہے۔ احشاء کامل نشو و نما پا سکتے ہیں۔ حوصلہ و ہمت چونکہ بقدر خون ہوا کرتی ہے اس میں ترقی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب سیدھے کھڑے ہو کر چلنا پڑے اور تمام قد کے لئے صرف دو پاؤں کی سطح زیرین سہارا ہو۔ جسم کا مرکز ثقل مقابلتاً زمین سے زیادہ

اونچا ہو جاوے تو طبیعت از خود جسم کے زیادہ نمو سے محترز رہے گی۔
اور اس کی کوشش ہر آن یہی ہو گی کہ بوجھ اس قدر نہ بڑھ جائے۔
اور سہارے کے طول و عرض سے اس قدر باہر نہ نکل جائے کہ جسم
کا کھڑا کرنا محال عقلی ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حیوان ذوالرجلیں
دیکھنے میں گو اس قدر بلند و بالا ہے لیکن اسکا تنورہ جسم ایک اچھے
پہاڑی کتے سے چنداں بڑا نہیں ہوتا۔ چھاتی میں اس قدر وسعت۔
معدہ میں اس قدر گنجائش اور دیگر احشاء میں اس قدر ظرف نہیں
ہوتا جو اس کے ہم قد دیگر چارپایوں میں پایا جاتا ہے۔

یہ حیوان ذوالیدین چونکہ کھڑا چلتا ہے اسلئے اسکا معدہ اس کے
امعاء پر عموداً واقعہ ہوتا ہے اور جس قدر غذا کھاتا ہے اُس کا بوجھ تمام
امعاء پر یعنے معدہ کے منفذ اسفل پر پڑتا ہے لہذا انسانی معدے کو
ہضم غذاء کے وقت ایک تو فعل ہضم پر قوت صرف کرنا پڑتی ہے۔
اور دویم انقباض منفذ پر۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کافی غذا
نہیں کھا سکتا۔ حیوان چونکہ چارپاؤں کے بل چلتے ہیں اسلئے
غذا کا بوجھ جرم معدہ اور جلد شکم پر رہتا ہے۔ تمام امعاء معدہ پر بوجھ
نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ حیوان غذاء کی مقدار کثیر کھا کر ہضم کر
سکتے ہیں اور کچی نباتات پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بخلاف اسکے
انسان مجبور ہے کہ قلیل الحجم اور کثیر الغذاء چیزیں کھائے۔ اسلئے
یہ گھاس چھوڑ کر گھاس کا بیج کھاتا ہے۔ گو پرند بھی دو پاؤں پر
چلتے ہیں اور انکی بسا اوقات بھی بیجوں پر ہے مگر قدرت نے انہیں
سنگدان عطا کر رکھے ہیں وہ پتھر کھا جائیں تو ہضم کر سکتے ہیں۔ لیکن

اس اضعف المخلوقات کے معدہ میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ بیجوں کو ہضم کر سکے
اس لئے مجبور ہے کہ جو کچھ کھائے اُسے پکا کر کھائے۔ ضعف نے اس
سر دردی پر مجبور کر رکھا ہے اور شیخی یہ کہ میں حیوانوں سے اشرف ہوں
کھانا پکا کر کھاتا ہوں۔ حیوان اسباب کے محتاج ہی نہیں تو وہ کیوں
ناحق کا دردسر خریدیں۔

رحم کی بھی یہی حالت ہے۔ چارپایوں کے جنین کا بوجھ غذا کے
بوجھ کی طرح نرم رحم پر نہیں پڑتا۔ اس لئے بچہ کامل نشو ونما پا کر پیدا ہوتا
ہے۔ اور پیدا ہونے کے جلد بعد اپنی خبرگیری کے قابل ہو جاتا ہے۔
لیکن پرند چونکہ دو پاؤں پر چلتے ہیں اس لئے وہ بھی جنین کو رحم میں
زیادہ دیر تک رکھنے کے قابل نہیں۔ اس پر اضافہ یہ کہ انہیں پرواز میں
نہایت سریع حرکات کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے وہ نطفہ منعقدہ ہی خارج
کر دیتے ہیں۔ ہاں ان کا انڈا اسکے بچہ کے لئے رحم ثانی کا کام دیتا
ہے اور جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ جلد تر چلنے پھرنے کے لائق ہو جاتا
ہے۔ کنگرو کی حالت رفتار کچھ انسان سے ملتی ہے۔ اُس کے بچے
بھی نہایت ضعیف و ناقص پیدا ہوتے ہیں۔ مگر قدرت نے اس کے
بچوں کے لئے ماں کے پیٹ کے باہر کی طرف ایک اور رحم (تھیلی) لگا
دیا ہے۔ بچے پیدا ہوتے ہی اس میں رکھ لئے جاتے ہیں اور وہ وہاں
سے قوی و توانا ہو کر نکلتے ہیں۔ اب اس اشرف المخلوقات کو دیکھئے۔
کھڑا چلنے کی وجہ سے رحم اس قابل نہیں کہ جنین کے کمال تک اسکا
بوجھ برداشت کر سکے۔ ناقص الخلقت کی اولاد ناقص پیدا ہوتی ہے۔
اور اس قدر ناقص کہ نہ ان پر بیضہ کا چھلکا ہے نہ ماں کے پیٹ پر

طفیلی ہے۔ اس نصیبوں جلے کو سوائے آغوشِ مادر کے اور کوئی پناہ نصیب ہی نہیں ہوتی۔ سینکڑوں بچے اپنی زندگی کے سال اول میں مرجاتے ہیں۔ کیونکہ آغوشِ مادر قدرت کی عطا کردہ جائے قیام کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ جس قدر بچے بچتے ہیں وہ بھی ۲۵ برس میں اپنے پورے قد پر پہونچتے ہیں ۔ حالانکہ دیگر حیوان اس سے بدرجہا کم عرصے میں اس سے بدرجہا زیادہ قد و قامت پا جاتے ہیں۔ مگر اس پر خود غلط کو اپنی خلقت کے نقص پر بھی ناز ہے اور اسے بھی شرف بتایا جاتا ہے۔

یہ ناقص الخلقت ضعف المخلوقات دو پاؤں کے بل لڑکتا پڑکتا چلا جاتا ہے چھاتی تنگ ہے اس پر ستم ہے کہ پھیپھڑے کے انقباض کی حالت میں کرۂ باد کا عمودی دباؤ اس کے پھیپھڑے پر بڑھ جاتا ہے کیونکہ پھیپھڑے کی حرکت حجاب صدر (ڈیافراغم) کی حرکت سے وابستہ ہونے کے باعث زیادہ تر عمودی ہے۔ اور ایسا ہی انبساط ریہ کے وقت جس وقت دم اندر کھینچتا ہے اس وقت ہوا کا وزن مقابلتاً زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے دونوں صورتوں میں اسے بمقابلہ حیوانات زیادہ قوت صرف کرنا پڑتی ہے۔ حیوان چار پاؤں کے بل چلتے ہیں اور انکی حرکات تنفس زیادہ تر سمت افقی میں وقوع میں آتی ہیں اسلئے انبساط و انقباض ریہ میں صرف جرم ریہ کو حرکت دینے پر قوت صرف ہوتی ہے ۔ اور ہوا کے عمودی دباؤ یا وزن میں نہ کوئی کمی بیشی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے مقابلہ کے لئے صرف قوت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تنفس مایہ حیات ہے اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں اور قوت

دیگر حیوانوں کے مقابلہ میں زیادہ درکار ہے۔ مگر بغیر اس کے کہ مادی جسم بڑھے قوت کا بڑھنا معلوم۔ اس لئے قدرت نے غیر ارادی قوئے کے ساتھ ارادی قوت کو بھی شریک کر دیا ہے تاکہ یہ زندگی کے دن تو کسی طرح پورے کرے۔ یوں ان میاں کو اپنے پھیپھڑے کی حرکت کو بجرے تابع ارادہ رکھنے کی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ اور آپ پھونک مار سکتے ہیں آگ سلگا سکتے ہیں۔ مگر نازیہ ہے کہ کوئی حیوان وہ کام نہیں کر سکتا جو ہم کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کیونکہ حیوانوں کی غیر ارادی قوئے کا خزانہ حرکت ریہ کے لئے کافی ہے اس لئے ان کی حرکات تنفس میں ارادہ کو زیادہ دخل نہیں۔

مشق سے ہر قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ اس کی قوت ارادہ کو چونکہ ہر حرکت ریہ میں شریک ہونا پڑتا ہے اس لئے پھیپھڑا دن بدن ارادے کے زیادہ تابع ہوتا جاتا ہے۔ سانس کے آنے جانے کے راستہ میں حنجرہ لگا ہے۔ اور جب کبھی زور سے سانس لیتا ہے تو آواز خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہے۔ دن بھر میاں سہمے اور ڈرے پھرتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حلق و حنجرہ کے عضلات سکڑے رہتے ہیں اور خواہ مخواہ آوازیں نکلتی ہیں۔ وہ ہر گرمی سے ہانپتے اور سردی سے کانپتے جاتے ہیں۔ تنگ و حمہ تک جو بھڑے ہے۔ تو گویا آپ کا دم ہر وقت اکھڑا رہتا ہے۔ کبھی تنفس منتظم نہیں رہتا۔ اس لئے ہر وقت حلق سے کوئی نہ کوئی آواز خفیف یا بلند نکلا کرتی ہے۔ چونکہ غایت مسرت کے وقت یا غایت رنج کے موقعہ پر تنفس میں زیادہ ہل چل پڑ جاتی ہے اس لئے بلند آوازیں نکلتی ہیں۔ جذبات جس قدر خفیف ہوں اسیقدر اثرات بھی خفیف

ہوتے ہیں اس لئے آوازیں بھی ہلکی نکلتی ہیں۔ غرض اسطرح تکلم کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ صوت اظہار رنج و مسرت کا کام دینے لگی ہے۔

کمزور جانیں ہمیشہ سریع التاثیر ہوتی ہیں۔ اسیطرح انسان کا پھیپڑا بھی حیوانوں کے پھیپڑوں کے مقابلہ میں جلد اثر پذیر ہوتا ہے۔ خفیف سے جذبہ سے متاثر ہوتا ہے اور انسان ہر کیفیت قلبی کو صوت سے ظاہر کرنے لگا ہے لیکن حیوانوں میں تا حال وقار بقدر قوت موجود ہے وہ بات بات پر شور نہیں مچاتے۔ ہلہ نہیں اوٹھاتے۔ حیوانوں کو دیکھ لو۔ بکری زیادہ ممیاتی ہے۔ گائے اس سے کم۔ بھینس اس سے بھی کم۔ اور ہاتھی بہت ہی کم۔ غرض جس قدر قوت زیادہ ہے اسیقدر کیفیت قلب کو صوت سے کم ظاہر کیا جاتا ہے پرند جن کی چھاتی چارپایوں سے مقابلتاً تنگ ہوا کرتی ہے وہ ہمیشہ چارپایوں سے زیادہ چرچوں کیا کرتے ہیں۔ انسان میں بھی جس قدر ضعف بڑھے اسیقدر تکلم بڑھ جاتا ہے بچے اور بوڑھے ہمیشہ جوانوں سے زیادہ بکا کرتے ہیں۔ اور عورت ہمیشہ مرد سے زیادہ باتیں کرتی ہے۔ الغرض تکلم اور ضعف متناسب ہوا کرتے ہیں۔ جس قدر ضعف بالطبع زیادہ ہوگا اسیقدر تکلم بڑھ جاتا ہے۔ لیکن انسان بزعم غلط انسان اس صنعت کو صفت باری سمجھتا ہے اور اپنے تکلم پر حد سے زیادہ ناز کرتا ہے۔ حالانکہ تکلم بقدر ضرورت دیگر چارپایوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن چونکہ ان کی ضرورتیں کم ہیں اسلئے الفاظ بھی کم ہیں۔ اس صنعت کی ضرورتیں بے انتہا ہیں اس لئے الفاظ بھی کثیر ہیں۔

خیر یہ دو شنگے حیوان۔ دو ہاتھ ہلاتے۔ منہ سے راغنوں کا کام لیتے لڑکھڑاتے چلے جاتے ہیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ کھانا پکا کر کھاتے

ہیں کیونکہ کچا ہضم نہیں ہوتا۔ مگر حیوان اس زحمت سے مستغنی ہیں۔ آلات حرب ساتھ سے کر پیدا نہیں ہوئے اس لئے کبھی پتھر پھینکنے کی مشق کر رہے ہیں کبھی لٹھ بازی کا شوق چرایا ہے۔ پھر چھری کلہاڑی کی نوبت آئی۔ آجکل بندوقیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن چارپایوں کا حربہ اب بھی چل جائے تو کارگر ہو ہی جاتا ہے۔ ننگے پیدا ہوئے ہیں۔ لباس و مکان کی فکر دامنگیر ہے۔ تاکہ فطرت کی حسنت کی تلافی ہو جائے گھاس میں چھپتے ہیں۔ کھیٹ بناتے ہیں۔ وہاں سے جھونپڑے تک تو بڑا فرق نہیں۔ بڑھتے بڑھتے مکان اور محلات تک نوبت پہونچی۔ آرائش مکان کا اسباب بھی بے انتہا وضع ہو گیا ہے۔ لیکن وہ آسایش پھر بھی نصیب نہ ہوئی جو حیوان کو درخت کے سایہ تلے ملتی ہے حیوان کی کھال اس کی جملہ ضروریات پوری کر رہی ہے۔ یہی کھال اسکے لئے لیسیہ آلود ہو کر خسخانہ۔ اور بال کھڑے کرکے حمام بن جاتی ہے۔ دھوپ اور بارش سے درختوں کی آڑ بچا تی ہے۔ پھر حیوان معماری و نجاری کے جھگڑوں میں کیوں پڑے؟ انسان میاں لاکھوں قسم کے لباس اختراع کر چکے ہیں۔ لیکن تا حال ویسا لباس ایجاد نہ ہو سکا جو حسب ضرورت گرم و سرد۔ ہوا دار و گرم کن ہو سکے۔ حالانکہ یہ سب باتیں حیوان مطلق کے لباس میں موجود ہیں۔ انسان لاکھوں برس کی سر دردی کے بعد آج لباس امکان میں وہ آسایش حاصل نہیں کر سکا جو حیوان کو کھال میں حاصل ہے طرہ یہ ہے کہ انسان پھر حیوانوں پر ہنستا ہے کہ تم میں قوت ایجاد نہیں۔ مگر یہ نہیں سوچتا کہ قوت ایجاد اسلئے نہیں کہ ضرورت ایجاد نہیں جہاں ضرورت موجود تھی وہاں حیوانوں نے وہ کام کئے کہ انسان آج تک انکی نقل پر قادر نہ ہو سکا۔ مثال کے طور پر بیا۔ شہد کی مکھی۔

دیک۔ ریشم کے کیڑے کو ہی دیکھ لیں۔

آپ دنیا پر آگئے ہیں لیکن ہر ایک چیز ناقص لے کر۔ قوت شامہ کسی سوزی کے قرب کا پتہ نہیں دیتی۔ اس قوت میں تو کتا اور گھوڑا انسان سے بازی لے گئے ہیں۔ نظر اس قدر فاصلہ پر یاری نہیں کرتی جس قدر فاصلہ سے چیل دیکھ سکتی ہے۔ کان اس قدر ہلکی آواز سن نہیں سکتے جس قدر خفیف آواز کو ہاتھی محسوس کر لیتا ہے۔ باب علم بھی پانچ حواس ہیں جس قدر اُن میں نقص ہیں اسی قدر حقائق اشیاء کم منکشف ہوتے ہیں۔ اسلئے مجبور ہے کہ جو تھوڑا معلوم ہوتا جائے اُسے یاد رکھے۔ تاکہ زندگی میں کام آئے۔ اور اس طرح حواس کی کمی پوری کر سکے۔ مگر ازل سے بر خود غلط پیدا ہوئے ہیں اس لئے علم کی اس پارہ دوزی پر بھی فخر ہو رہا ہے۔

اور یہ غرور ہے کہ ایجاد و علم کی قدرت و استعداد محض مجھ میں ہے اور میں حیوانوں پر حکومت کر رہا ہوں۔ سب حیوان میری خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ سوار اپنے گھوڑے کی چوبیس گھنٹے خدمت کرتا ہے۔ تو گھوڑا اس کو دو گھنٹے سواری دیتا ہے۔ اہل نظر فیصلہ کر لیں کہ کون خادم ہے اور کون مخدوم۔ اور انسان کا تبختر کہاں تک بجا ہے اور کس قدر بے جا۔ مگر سے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے پھر کام دو جہاں کے لئے

جی۔ این (بی۔ اے)
حال وارد لکھنؤ

کلامِ ظفر پر ایک ناقدانہ نظر

ہم اپنے دیرینہ دوست خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کے تہِ دل سے ممنون ہیں جنہوں نے ہماری درخواست پر آشوبِ چشم کے باوجود حضرت سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ طاب اللہ ثراہ کے کلامِ بلاغت نظام پر ذیل کا ناقدانہ مضمون عنایت فرمایا ہے۔ حضرت ظفر رح جنکی تصویر اس پرچہ میں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔ نہایت روشن ضمیر، نیک نفس، صاحبدل عارف گزرے ہیں اور انکا کلام انکے خیالات، انکے جذبات، انکے محسوسات کا آئینہ ہے۔ مگر مقامِ افسوس ہے کہ ایسے نکتہ سنج شاعر اور ادبِ اردو کے سچے مربی اور محسن کے کلام کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کا وہ ازروے انصاف مستحق ہے، اس میں کچھ قصور تو پبلک کا ہے اور کچھ ہمارے تذکرہ نگار حضرات کا۔ ظفر مرحوم کے ساتھ زمانہ کے بیرحم ہاتھوں نے اتنا ظلم نہیں کیا جتنا شمس العلما، آزاد مرحوم کے جادو نگار ہاتھوں نے، شمس العلماء صاحب موصوف کی ہم کیا شکایت کریں انہوں نے استاد پرستی کے نشہ میں آکر ظفر کے کلام کو بھی ذوق کا کلام ہی قرار دیدیا، حالانکہ سبحرانِ حقیقت کو دونو بزرگوں کے کلام میں تفاوتِ بیّنہ نظر آرہی ہے مگر ع

گوشِ سخن شنو کجا؟ دیدۂ اعتبار کو؟

(غلام محمد طور ایڈیٹر)

جس طرح انگریزی سلطنت کی برکت سے اردو میں انگریزی الفاظ کثرت سے شامل ہوتے گئے اور اس کو ایک نئی اردو بنا دیا۔ اسیطرح سلطنتِ مغلیہ کے زمانہ میں فارسی اور عربی کے الفاظ کے شمول نے ہندی بان کا کایا پلٹ کر دیا تھا اور اس ملوان ہندی کا نام اردو ہو گیا۔ جو وقت انگریزوں کو اردو حاصل کرنے میں ہوتی ہے اور جس کے لئے وہ کچہریوں کے تمام دفتر روزمرہ اردو سے انگریزی میں بدلتے ہیں۔ یہی تکلیف مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کو اردو بولنے میں ہوتی تھی جن کی زبان پر ٹ۔ ڑ۔ ڈ کے حرف اچھی طرح نہ آسکتے تھے مگر مغلوں نے اپنی رعیت سے ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے ہندوستان کی زبان حاصل کرنے میں اپنی عمر کا کثیر حصہ صرف کیا یہاں تک دہلی کے آخری تاجور حضرت محمد سراج الدین بہادر ظفر شاہ اچھی خاصی اردو بولنے پر قادر تھے۔

اردو کے علم ادب میں انکی تصنیف نے ایک تازہ روح پھونک دی۔ بہادر شاہ مرحوم کے چار موٹے موٹے دیوان تو مطبوعہ موجود ہیں اور خدا جانے انکی تصنیف کا کس قدر ذخیرہ غدر کے زمانے میں معرض تلف میں آگیا ہوگا جن کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک مغل کی تصنیف ہے جس کی مادری زبان ترکی اور فارسی تھی۔ اردو زبان کی ایسی مثال ہم کو کسی انگریز کے کلام سے نہیں مل سکتی بہادر شاہ کی شاعری نے یہ قبولیت حاصل کی۔ کہ وہ اردوے معلےٰ کے نام سے مشہور ہوئی اور جو لفظ قلعہ معلےٰ کی چار دیواری سے نکلا وہ اردو علم ادب کے لئے سند ہوا۔ بہادر شاہ کی شاعری میں خصوصیت سے

وہ بات ہے جو دہلی کی شاعری کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ یعنے جذبات کا اظہار عام زبان میں۔ اسی وجہ سے ظفر کے کلام میں اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ذوق کی شاعری کو جس خصوصیت نے چار چاند لگا دئے وہ ظفر کے کلام میں موجود ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ بہادر شاہ مظلوم مرحوم کے واقعات پر اچھی طرح بحث کرتے اور معزول بادشاہ کے مصائب کا ذکر کر کے ایک مختصر سوانح عمری کا کام لیتے۔ لیکن اردو علم ادب کے ایک وقیع رسالہ کے واسطے ایسے تذکرے ناظرین کی عیش پسند طبیعت منغص کر دیتے۔ اس لئے ہم نے محض ادبی تعلقات کے بیان پر اکتفا کی۔ حق تو یہ ہے کہ باوجود تمام اشغالِ امورِ سلطنت کے بہادر شاہ کا شعر کہنا اور پھر ایسا کہنا جو مطبوعِ عام ہو۔ یہ ایک تعجب خیز بات ہے۔

ہند کی رعایا اکبر بادشاہ سے اسبات پر خوش ہے کہ اس نے اپنا مذہب رعایا کی نذر کر دیا تھا اور اس کو بعض علماء نے اس بے نفسی پر دہریہ سمجھ رکھا تھا لیکن بہادر شاہ نے اس سے بھی بڑھ کے کام کیا۔ وہ یہ کہ اپنی مادری زبان رعایا کی نذر کر دی اور انہیں کی زبان میں ان سے بات چیت کرنے کا سبق ہم کو سکھا گئے۔ یہ ظفر کا فیضِ سلطنت ہے کہ آج تمام مسلمان جن کی مادری زبان۔ فارسی۔ عربی۔ پشتو تھی بے تکلف اردو بولتے ہیں اور انکی مادری زبان بھی اردو بن گئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اردو کی بنیاد شاہجہان کے وقت سے پڑ چکی تھی لیکن اس کی تکمیل ظفر کے عہد میں ہوئی گویا زبانِ اردو کا آخری قاصد بہادر شاہ مرحوم تھا جس کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا اور اسکے

بعد کسی اوتار کے جنم لینے کی ضرورت نہ رہی۔

گویا دہلی کا پایۂ تخت اردو کی تکمیل کی غرض سے قائم ہوا تھا۔ جس کو بوجوہ احسن اسنے انجام دیا۔

دہلی کی سلطنت نہیں برباد ہوئی دنیا سے اردو کی بادشاہت اُٹھ گئی۔ جب تک دنیا میں اردو کا نام ہے دہلی کی سلطنت کا چراغ روشن ہے۔ لکھنؤ نے جس قدر وقعت حاصل کی اسی دہلی سے۔ دہلی کے سرمایۂ ناز شاعر تباہ ہوکر لکھنؤ میں آئے اور لکھنؤ کو باعتبار زبان ثانی دہلی بنادیا بقولِ غالب ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

میر مرحوم تک قدردانی کا دائرہ محدود نہ تھا بلکہ دہلی کے تمام شعراء کی قدر و منزلت لکھنؤ کے اہلِ کمال نے اسیطرح کی۔ جب تو دہلی کے سرمایہ ناز شاعر میرزا سودا۔ انشاء اللہ خاں انشا۔ میر سوز۔ میر تقی۔ نواب طالب علیخاں عیشی وغیرہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں آرہے اور یہاں سے مرکر بھی نہ نکلے۔

بہادرشاہ کا دائرہ سلطنت آخر میں گو بہت غیر وسیع رہ گیا تھا مگر اس پر بھی ان کو اردو زبان کی پرورش کا خیال زمانۂ ولیعہدی سے تھا۔ دہلی کے موجودہ شعرا کو جو کہنہ مشق تھے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ملی اور حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ عبدالرحمن خاں احسان۔ برہان الدین خاں زار۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیب۔ میرزا عظیم عظیم۔ شیر قمرالدین منت وغیرہ درباری شاعر مشہور

ہوئے۔ بہادر شاہ اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھاتے تھے مگر شاہ صاحب تھوڑے زمانے کے بعد دکن چلے گئے۔ شاہ نصیر کی کافی شہرت ہو چکی تھی انکے بعد اگر کچھ لوگ مانتے تھے تو ذوقؔ کو مانتے تھے۔ شاہ صاحب کے جانے کے بعد ظفرؔ نے ذوقؔ سے اصلاح لی۔ یہ امر کسی قدر غالبؔ کے خلاف طبع ہؤا اور اپنے قصائد میں بعض بعض موقع پر اظہار ناراضی کیا لیکن بات یہ ہے کہ اس زمانے میں بعد نصیر ذوقؔ کا طوطی بول رہا تھا اور غالب بیچارے کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ولیعہد بہادر جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو استاد کو ملک الشعراء خاقانی ہند کا خطاب دیا۔

ظفرؔ کے کلام پر اس اعتبار سے نظر کی جائے کہ اس میں محاورے کس طرح ادا کئے ہیں۔ روزمرہ کیسا ہے۔ اثر کتنا ہے۔ زبان کس قدر مستند ہے۔ تو ان کا مثل و نظیر آپ کو نہ ملے گا۔ اس لحاظ سے کہ زبان اور محاورات کے تو یہ بادشاہ تھے جو لفظ قلعہ معلےٰ سے نکلتا وہ شعراء کے لئے سند ہو جاتا۔ ہاں پر شکوہ الفاظ۔ مضامین بلند۔ تراکیب فارسی۔ مصادر فارسی حروف روابط فارسی سے ان کا کلام خالی تھا۔ تو اس کی ضرورت بھی اردو کی شاعری میں ایسی نہ تھی اور بعض کے نزدیک تو ایسی شاعری مخل فصاحت ہے۔ ہاں مضامین بلند کی ضرور دنیا قدر کرتی ہے۔ مگر جب تک وہ الفاظ فصیح زبان میں ادا نہ ہوں۔ اچھے نہیں معلوم ہوتے

اس پر لطف یہ ہے کہ ظفرؔ نے مشکل زمینوں میں جو غزلیں لکھی ہیں انکو بھی عام محاورے اور سادہ لفظوں سے پانی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اس سے ہے غریبوں کو تسلی کہ اجل نے
مفلس کو جو مارا تو نہ زردار بھی چھوڑا۔

اِس شعر میں یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ ردیف کتنی محاورے اور زبان میں ڈوبی ہوئی ہے۔

جا سکے گلشن تلک اُڑ کر نہ ہم بے بال و پر ہمنے اے صیاد کیا پایا رہائی میں مزا
بیٹھا ہے مہندی لگا کر اپنے دست و پا میں تو آج ہے اے شوخ تجھ سے ہاتا پائی میں مزا

پہلے شعر میں کتنی نازک بات پوشیدہ ہے یعنے بے بال و پری کا نتیجہ۔

دوسرا شعر شوخی سے لبریز ہے شاعر کی چلبلی طبیعت نے ایک نئی بات پیدا کی ہے کہ جب معشوق حنا ملے ہو اُس وقت دست درازی میں مزا ہے وہ مجبور ہے خود مختار ہیں۔ ہاتا پائی ایک فصیح محاورہ ہے جو دست درازی کے معنے پر مستعمل ہے۔

نہیں جاتا کسی سے وہ مرض ہے جو نصیبوں کا
نہ قائل ہوں دوا کا میں نہ قائل ہوں طبیبوں کا

نصیبوں کا مرض یعنے قسمت کی لکھی ہوئی بیماری۔

دیا جو اشک نے شورابہ سرشک ہمیں
تو توشجاں اسے ہمتے مثالِ دُرج کیا

شکوۂ الفاظ قابلِ دید ہے۔

جواب صاف تو لاتا اگر نہ لاتا خط
لکھا نصیب کا جو نامہ بر سے کچھ نہوا

کتنا صاف اور سادہ مضمون ہے۔!

کیوں مجھ سے نہ ہو زخمِ دلِ بیتاب کا پھاہا
بھیگا ہوا چپکے گا نہ پھر آب کا پھاہا

وہ زخمی شمشیر حوادث ہوں کہ جس کو　　آئے ہے نظر چرخ بھی ہر آبکا پھاہا

پر درد کو تو میں نے غرض کیا کہ ترے زخم　　یکساں ہے گزیکا کہ ہو کمخواب کا پھاہا

چھوڑ اسا نہ دل پھوٹ ہے کیوں ظفر اسپر

ہے مرہم غمخواری احباب کا پھاہا

ایسی مشکل ردیف میں ظفر کے بعد دہلی میں کسی نے اس زمین میں قافیہ پیمائی نہیں کی مضمون آفرینی اور شکوہ الفاظ قابل دید ہے۔!

کچھ جواب اُسنے جو خط کا دیا اُلٹا سیدھا

نامہ بر نے مرے رستہ لیا گھر کا سیدھا

اصل لفظ تو راستہ ہے مگر رستہ اردو میں زیادہ فصیح ہے۔ گھر کا سیدھا رستہ لیا۔ محاورہ ہے جو اس جگہ بہت موقع سے صرف ہوا ہے۔ حقیقت میں کلام الملوک ملوک الکلام ہے ظفر کی زبان فیض ترجمان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ زبان کے لئے سند ہے۔

مرا گھر تو نے کیوں چھوڑا؟ ترا گھر تھا تو اُس جا تھا
مکاں پردے کا اسے پردہ نشیں اگر تھا تو اُس جا تھا

کتنی مشکل ردیف میں تصوف کے مسئلے کو طے کیا ہے!

وہ تھا جو ہر دمہ کے لئے اعتبار نور

سب تیرا ایک جلوہ دکھانے سے اٹھ گیا

یہ بھی ایک اہل اللہ کے مذاق کا شعر ہے۔

تھا میرے اور اس کے جو پردہ سا اک ظفر

یکبارگی دوئی کے اٹھانے سے اٹھ گیا

کتنا وحدت میں ڈوبا ہوا مقطع ہے!

بے لکھے خط جو کیا نامہ و پیغام طلب کاہلی لکھنے کو تھی آپ میں آرام طلب

سرنامہ میرے نام کا اور خط رقیب کا ظالم اثر ہے تم کے ہیں عنوان عجب عجب!!

نفس کی ہے یہ جو آمد و شد بغور کر سیر اس کی غافل!
یہ دیکھ طے ہو رہی ہے کیونکر رہِ وجود و عدم چھپا چھپ

جلا کیا شبِ غم دل کا داغ صبح کے وقت وگرنہ ہوتے ہیں گُل سب چراغ صبح کے وقت

دل ہے مکدر انکا صفائی ہو کسطرح! بخت ہے نارسا میں رسائی ہو کسطرح!

ہے سفر درپیش اس بستاں سرا سے غنچہ وا
باندھ تو رختِ سفر غافل! سفر سے پیشتر

کرے ہے نکہتِ گُل دمبدم چمن میں سفر ہمیشہ خانہ بدوشوں کو ہے وطن میں سفر

کیونکر نہ خاکسار رہیں اہلِ کیں سے دور
دیکھو زمیں فلک سے۔ فلک ہے زمیں سے دور

قیام اُڑنڈ کی جڑ سے بھی کم ہے دنیا کو
کچھ اسکی اصل نہیں ہے مگر فساد کی جڑ

واللہ بتوں نے ہم سے یاری کی ترک — پر ہم نے نہ انکی پاسداری کی ترک

جان عالم ہو کوئی کیونکر جدا رکھے تمہیں
زندگی ہے اے بتو اتم سے خدا رکھے تمہیں

صنم جیسا کہ تو اِم خدا ہے دلربائی میں — نہ ہوگا دلربا ایسا کوئی ساری خدائی میں

جلایا آپ ہم نے ضبط کرکے آہ سوزاں کو
جگر کو سینے کو پہلو کو دل کو جسم کو جاں کو
ہمیشہ کنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو یاس کو حسرت کو بیتابی کو حرماں کو
بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو دیو کو جن کو پری کو حور و غلماں کو

بے پڑھے خط نہ سرا تنوری پہ لب ڈالو — پہلے پڑھ لو اسے پھر پھاڑ کے مل ڈالو

دل و جاں دین و ایماں سے جو لینا ہو صنم لیلو — کرونگا عذر دینے میں نہیں مجھسے قسم لے لو
تم آئے عین گرمی میں نکلکر دلسے اے اشکو! — کوئی دم نخل مژگاں کے ذرا سایہ میں دم لیلو
یہی ہے حضرت دل عشق کے بازار میں سودا — اگر لیتے ہو لینے واسطے تم مول غم لے لو
نہیں ہے اعتبار انکا وہ ہیں کہکر مکر جاتے
نوشتے انکی باتوں کے ظفر تم مکتلم لیلو

یہ قصہ وہ نہیں تم جسکو قصہ خواں سے سنو مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو

نہیں معلوم ظفر تسے ہوئیں کیا باتیں چپکے بیٹھے ہو تم آج خفا سے کچھ ہو

کہتا ہے تمسے کون کہ خنجر بکف نہ ہو پر حقِ جاں نثارِ محبت تلف نہ ہو۔
اللہ ہے ہمارا طرفدار اے ظفر! کوئی اگر نہیں ہے ہماری طرف نہ ہو

ہے جہاںمیں خرمئِ نام و نشاں بے فائدہ سینہ کاوی ہے نگیں کیطرح یاں بے فائدہ

واں رسائی نہیں تو پھر کیا ہے؛ یہ جدائی نہیں تو پھر کیا ہے؛
ہو مدافات تو صفائی سے اور صفائی نہیں تو پھر کیا ہے؛
عکس قابِ اغنیا ہونا بے حیائی نہیں تو پھر کیا ہے؛
اللہ اللہ! رے بتوں کا غرور یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہے؛

بہکانے والے آپکے سب یار بن گئے۔ سمجھانے والے مفت گنہگار بن گئے
ہشیار رہنا چاہئے یارو تمہیں اے ظفر! ہیں یار اس زمانے کے عیار بن گئے

کسکی ابرو کی وہاں تصویر کھینچ کر رہ گئی سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھچکر رہ گئی
لوگ اس مطلع کو بادشاہ کی کرامت پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس مطلع کے چند روز کے بعد خبر آئی تھی کہ بھوپال میں تلوار چل گئی اور بہت کچھ کشت وخون ہوا۔

کیا خرد و بدخواہ کیا تدبیر دشمن بن گئی
میرے حق میں تو مری تقدیر دشمن بن گئی

خرد ہی پہ تکیہ نہ بالکل کرے
خدا پر بھی انساں توکل کرے
کروں کم نگاہی کا گر میں گلہ
تو پھر اور بھی وہ تغافل کرے

لکھ کے حال اپنا انہیں بھیجا ہے اپنے ہاتھ سے
کھوئی ہے ہم نے آپ اپنی بات اپنے ہاتھ سے

جفاکش اور ستم پرور نہ ہم جیسے نہ تم جیسے
بلاکش اور غارتگر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

عجب روش سے انہیں ہم گلے لگا کے ہنسے
کہ گل تمام گلستاں میں کھل کھلا کے ہنسے
یہ کہہ دو غنچے سے آتی ہے تیرے منہ سے بو
چمن میں سن کے اس گل کے منہ چھپا کے ہنسے

گلشن میں جب سے آ وہ رنگیں ادا ہنسے
غنچے کا منہ ہے کیا کہ جو پھر سے صبا ہنسے
یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے حال دل
منہ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

ملے خسرو کو شیریں کوہکن ناکام رہ جائے
بعید اے عشق ہے یہ بات انصاف و عدالت سے

چھوڑ کر یار ہمیں شب سے چلتے پھرتے
اپنی تنہائی پہ ہم ہاتھ ہیں ملتے پھرتے

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
بلا یہ کون لیتا جان پر لیتے تو ہم لیتے

اسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں پوچھتا پھرتا دلِ گمگشتہ کی اپنے خبر لیتے تو ہم لیتے

لگایا جام مے ہونٹوں سے اپنے ہم کو ترساتا رہا
کہ بوسہ اسکے لب کا اے ظفر! لیتے تو ہم لیتے

کہاں ہیں وہ اگلی ملاقات والے عنایات والے؟ مدارات والے؟
خوش اوقات و لیکے خرابات والے ہمیشہ رہے خوش اس اوقات والے

ظفر جسدم غم دوری سے دل مغموم ہوتا ہے
مزا دلکے لگانے کا ہمیں معلوم ہوتا ہے
حباب! اتنی نہ باندھا کر ہوا ہیں تو نمود اپنی
کوئی دم میں نشاں تک بھی ترا معدوم ہوتا ہے

ہم ہیں ساقی ہے اور دورِ پیمانہ رہے حشر تک یارب! یونہی آباد میخانہ رہے

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے
ظفر احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

گالیوں کا منہ سے چلنا اور چہرا صاف ہے کیا زباں ہے آپکی کیا روزمرہ صاف ہے

کہوں کیا ماجرا بے ثباتی نقش ہستی کا
مٹا جاتا ہے یوں گویا کہ یہ پانی پہ لکھا ہے

مقدور کس کو حمد خدائے جلیل کا — اس جا پہ بے زباں ہے دہن قال و قیل کا
پانی پہ اُس نے راہبری کی کلیم کی — آتش میں وہ ہوا چمن آرا خلیل کا

کسی نے اسکو سمجھایا تو ہوتا — کوئی یاں تک سے لایا تو ہوتا

دل کا کچھ کام نہ تجھ سے بت پرفن نکلا — دوست جانا تھا تجھے جانکا دشمن نکلا

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

کوچے میں ترے تنہا ہر شب مجھے ہو جانا — دو چار گھڑی اپنا دل کھو کے رو جانا

وائے اے بیخبرو تمکو خبر خاک نہیں — کہ سفر سر پہ ہے سامانِ سفر خاک نہیں
برسوں گذرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد — اب تو اس کوچے میں ہے بادِ سحر خاک نہیں
خاک میں آنسوؤں کو میرے ملاتا کیا ہے — تجکو اے دیدۂ تر! قدرِ گہر خاک نہیں
ہمسے ظاہر میں ہے گو صاف تو کیا ہوتا ہے
دل تو صاف انکا ہوا ہمسے ظفر خاک نہیں

پاک شے کچھ اور ہے میں قطرۂ ناپاک ہوں — بولتا کیا جانے کیا ہے میں تو مشتِ خاک ہوں

بھری ہے دل میں جو حسرت کہوں تو کس سے کہوں
سنے یہ کون مصیبت؟ کہوں تو کس سے کہوں!

کسی کو دیکھتا اپنا نہیں حقیقت میں؛
ظفر میں اپنی حقیقت کہوں اگر کس سے کہوں؟

جو دل کو دل کی خبر واں نہیں تو یاں بھی نہیں
بدل محبت اگر واں نہیں تو یاں بھی نہیں؛

درد دل درد آشنا جانے
اور بیدرد کوئی کیا جانے؛

ابھی یہ چشم و چراغ دہلی زندگی عیش و عشرت میں بسر کر رہا تھا کہ سوتیا ڈاہ رنگ لائی اور غریب کو قید فرنگ نصیب ہوئی۔ بچے قتل ہوئے۔ خاندان تباہ ہوا۔ ایک لاکھ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا جس کے اضافے کی تجویز ہو رہی تھی کہ غدر کا ہولناک واقعہ پیش آیا غریب بادشاہ اور بھی زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ قید کی حالت میں رنگون بھیج دیئے گئے اور اسی غربت میں سفر آخرت اختیار کیا۔ آج بہادر شاہ کی حکومت ہے نہ دولت۔ اولاد ہے تو وہ اپنی مصیبت میں مبتلا ہے۔ بہادر شاہ کو دنیا سے رخصت ہوئے پچاس برس سے زیادہ ہو گئے مگر ان کی علم ادب کی خدمت نے ان کو آج تک زندہ رکھا اور ہم ان کا دیوان دیکھ کر ان سے دل کھول کر باتیں کر لیتے ہیں۔ اور وہ غریب اپنی مصیبت کی کہانی دوہرا دیتے ہیں اسی لئے شعر کو اولاد معنوی کہتے ہیں۔

دنیا میں جب تک زبان اردو کے قدر دان موجود ہیں گے جب چاہیں گے ظفر سے دو دو باتیں کر لیں گے۔

آہ! اے غم کیش ظفر! آہ! اے دہلی کے آخری۔ یادگار!! دنیا

میں جس قدر تو نے عیش اُٹھایا تھا اُس سے زیادہ تجھکو مصیبت جھیلنا پڑی۔ آخر خاکِ رنگون تجھکو کشاں کشاں لے گئی۔ جہاں آج تیری قبر کا نشان تک نہ باقی رہا۔ اب کوئی فاتحہ پڑھے۔ تو کہاں؟ اور دو پھول چڑھائے تو کس جگہ؟ اے پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدلنے والے بادشاہ! آج تو ایک ایسے تاریک مکان میں سو رہا ہے جہاں نہ مسہری ہے نہ چھپر کھٹ۔ خاک کا بچھونا۔ خاک کا اوڑھنا۔ خاک کا تکیہ ہے۔ مگر گھبرا نہیں۔ بہت جلد تجھے ان مصیبتوں سے نجات ملنے والی ہے اور دائمی عیش و مسرت کا دروازہ تیرے واسطے کھلنے والا ہے۔ فقط

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

"پولٹکس" پر ایک نظر

اگست کے مخزن میں شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے (بار۔ایٹ۔لا) نے "پولٹکس" کی سرخی سے جن اعلےٰ خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُن سے غالباً بہت کم اشخاص ایسے ہونگے جن کو کچھ مخالفت ہو سکتی ہو! جو کچھ فرمایا ہے بالکل بجا اور درست فرمایا، لیکن تمام مضمون پڑھ چکنے کے بعد ایک غور کرنے والا اگر یہ سوچتا ہے کہ "کیا فرمایا ہے؟" تو اُس کے اس سوال کا جواب کچھ ایسے گوگو رنگ میں ہے۔ کچھ ایسے اُلجھے ہوے الفاظ میں ہے جس کی تشریح اور تفصیل کی پوری ضرورت ہے۔

شیخ صاحب کے مضمون "پالٹکس" کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان میں پالٹکس کا زور بغیر سوچے سمجھے بڑھ رہا ہے، ہر شخص ہلدی کی گرہ ہاتھ لگ جانے پر پنساری بن بیٹھا ہے، اور سیاسی معاملات کے ماہرین تعداد میں انگلیوں پر گنے جانے سے زیادہ نہیں ہیں! آپ نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ بجائے لیڈر بن بیٹھنے کے بہتر یہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ جماعت سیاسیات کا پورا پورا مطالعہ کرے اور اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کرے، واقف ہو جانے کے بعد اس امر پر غور کیا جائے کہ ہماری موجودہ پالیسی۔ زمانہ اور ملک کی ہوا کا رخ دیکھ کر۔ کیا ہونی چاہئے؟ یہاں تک کس کو اختلاف ہو سکتا ہے؟ لیکن ایک بات۔ اور غالباً بہت بڑی بات۔ رہی جاتی ہے! یہ نہیں ظاہر کیا گیا کہ سیاسی تعلیم کا مطالعہ کس اسکول میں اور کن کن استادوں سے

زیرنگرانی کیا جائے؟ اگر محض یورپ کے مدبّرانِ ملک کی تصانیف اور لکچروں وغیرہ کا پڑھ لینا ہی سیاسیات کا مطالعہ کیا جا سکے، تو پھر وہی نقص پیدا ہوگا جس کا آپ نے آخر میں خود اظہار کیا ہے۔ یعنی بہت سے ایسے مسائل ہو نگے جو ہندوستان کے لئے قطعی ناموزوں بلکہ تقریباً ناممکن قرار پائیں گے، اور اکثر ایسی باتیں ہونگی جن کی ضرورت ہندوستان کو بے حد ہوگی لیکن ان کا پتہ یورپ کی سیاسیات میں مشکل سے مل سکیگا! اب اسکی ضرورت ہے کہ سیاسیات کے مطالعہ کے وقت ایک طالب علم کو صحیح راستہ دکھانے والا۔ ہندوستان کی آب و ہوا کے لحاظ سے راستہ دکھانے والا۔ ضرور نگرانی کرے اور وقتاً فوقتاً امداد دیتا رہے: الجھی ہوئی باتوں پر روشنی ڈالتا رہے، اور طالبعلم کو غلط راستہ پر جانے سے روکتا رہے! افسوس ہے کہ شیخصاحب نے اس کو نظرانداز کر دیا: اچھا ہوتا کہ وہ اس مطالعۂ سیاسیات کو زور اور واضح طور پر بیان فرماتے اور اس مسئلہ کو معمہ کی صورت میں مطالعہ کرنے والے کے لئے ہی نہ چھوڑ دیتے! کیا اس افراط و تفریط کے زمانہ میں اسبات کی ضرورت نہیں کہ ہم کو صاف صاف الفاظ میں سچا راستہ دکھایا جائے، غلط فہمی سے روکا جائے، اور جرأت کے ساتھ بتا دیا جائے کہ کیا کرنا چاہیئے؟ بیشک ہندوستان میں سیاسیات کے متعلق نہایت گڑبڑ ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی الاپ رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری بہتری، ہماری ترقی، بلکہ سب سے زیادہ ہماری سلامتی، کس راستہ پر چلنے سے ہوسکتی ہے! اور اس گڑبڑ کا، اس ایک سچا راستہ قائم نہ کرنے کا، اس غلط فہمی کی بنیاد ڈالنے کا، ذمہ وار کون ہے؟ ہمارے لیڈر! اور صرف ہمارے لیڈر! جھوٹے نمایشی، نافہم لیڈر نہیں، سچے، معاملہ فہم لیڈر جن کو اس وقت

ہماری قوم اپنا لیڈر مان رہی ہے، جنکے ہاتھوں میں ہماری قسمت ہے، جنکا ایک ایک لفظ ہمارے لئے پتھر کی لکیر ہے، یہ لیڈر ہر بات کو راز میں رکھنے کے ایسے دلدادہ ہیں، فریبین قائم کرنیکے ایسے شیدا ہیں کہ اب انکی تحریر و تقریر کے الفاظ بھی حروف مقطعات سے کم نہیں تھے تو وہ پبلک کو اپنی باتیں سمجھنے کا اہل نہیں سمجھتے وہ ہمکو اپنے ارادوں سے آگاہ کرنا نہیں چاہتے، اب اگر ہم غلط راستہ پر چلتے رہیں، غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں تو قصور کس کا ہے؟ ہمارا یا اُن کا، جز میرا مطلب یہ ہے کہ اب وہ وقت نہیں ہے کہ کسی بات پر صرف سطحی نظر ڈالی جاتے اور اندرونی کیفیت کو پہیلی بنا کر چھوڑ دیا جائے۔

امید ہے کہ شیخ صاحب اس مطالعہ سیاسیات پر زیادہ روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ایک طالب علم اپنے مطالعہ کے زمانہ کو کس طرح گذارے، کس کی نگرانی میں گذارے، کیونکر گذارے؟ وہ خود کیا مسلک رکھے اور اپنے خیالات کی تصیح سچے لیڈروں یا سیاسیات سمجھنے والوں سے کیونکر کرائے؟

واقعی ہندوستان میں بہت کم ایسے حضرات ہیں جو پارلیمنٹ کے ممبروں سے لیاقت سیاسی کے اعتبار سے ہمسری کا دعوے کر سکیں، اور بیشک انگلستان میں سینکڑوں درجن ایسے دماغ ہونگے جن میں سے ہر شخص پارلیمنٹ کا ممبر بنایا جا سکتا ہے، مگر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ آزاد ہیں، وہ ہر بات میں حصہ لے سکتے ہیں، وہ نہایت اعلےٰ تعلیم پاتے ہیں اور ان کا دماغ غور کرتے کرتے زندگی کے ہر شعبہ سے واقف ہوگیا ہے مگر ہم؟ اس کا کچھ نہ پوچھئے؟ آزادی کا تو شاید ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، ملک کی بہتری ہمیں بتائی نہیں جاتی کہ کس رنگ میں پوشیدہ ہے، ملکی معاملات میں حصہ لینا تو شیخ چلی کی ڑل ہے۔ قومی معاملات بھی ہماری آنکھوں اور ہمارے کانوں سے دور رکھے جاتے ہیں، اور زندگی کے ہر شعبہ سے واقف ہونا تو کجا، مختلف حسب حال صورتوں پر اظہار رائے کرنے میں ڈانٹ دیا جاتا ہے۔

روک دیا جاتا ہے، اور "ہوا، ہوا" کہہ کر ناسمجھ بچوں کیلئے ڈرا دیا جاتا ہے
اب یہاں آسانی کے ساتھ شاید یہ دھوکہ دیا جائے، کہ "تمہیں ان باتوں سے
الگ رکھنا ہی بہتر ہے، کیونکہ تم اس کوچہ سے ناواقف ہو، اس کے اہل نہیں،
تمہارے دماغ میں وہ خیالات نہیں جو یورپ کے دماغوں میں ہیں اور
اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری تعلیم اس قدر اعلےٰ و اکمل نہیں ہے جس قدر
کہ انکی ہے!" بہت اچھا! لیکن یہ تو فرمائیے کہ جب اس اعلےٰ تعلیم حاصل
کرنے کے۔ بلکہ بہم پہونچانے کے۔ ذرائع اختیار کئے جائیں، پیٹ کاٹ
کر اس کے لئے رقم کثیر جمع کی جائے، تمام اوقات صرف کر کے ایک صورت
قائم کیجائے اور اب ایک زبردست طمانچہ ایسا لگے کہ منہ پھیر دے، ہوش
و حواس باختہ کر دے، اور کان پکڑ کے بتا دے کہ اس طرف بھی قدم نہیں
اُٹھا سکتے! تو فرمائیے کہ ہندوستان میں سیاسی ماہرین کس آسمان سے
برسیں اور کس زمین سے اُگیں؟ مثلاً ایک مشین کو لے لیجئے! ایک شخص
اس مشین سے پوری طرح واقف ہے، وہ اُس کے اندرونی پرزوں سے
واقف ہے، وہ پرزوں کے علیحدہ علیحدہ حرکت اور مجموعی حرکت، سب کو
جانتا ہے، وہ اُس کے پرزے علیحدہ علیحدہ کر کے پھر جوڑ سکتا ہے! اب
ایسے شخص سے دو اشخاص۔ دو نوجوان۔ اُسی مشین کا سبق حاصل کرنا چاہتے
ہیں، اُس کی مشینری سے واقف ہونا چاہتے ہیں! وہ ایک کو تو محض
پڑھاتا ہے، اُس مشین کے تمام پرزوں وغیرہ کی کیفیت صرف زبانی بتاتا
ہے یا پڑھاتا ہے، لیکن مشین کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا: اور دوسرے کو پڑھانے
کے ساتھ مشین کے استعمال کی بھی اجازت دیتا ہے، خود اُس کے ہاتھ
سے مشین چلواتا ہے، پرزے علیحدہ کر کے اُس کے آگے ڈال دیتا ہے اور

اسی سے پھر درست کراتا ہے، جس پرزے کے لگانے میں وہ غلطی کرتا ہے
اس کو خود بتاتا ہے! اب فرمائیے کہ واقعی ان دونوں میں سے کون مشینری
سے واقف ہوگا؟ کون اس قابل ہوگا کہ ضرورت کے وقت مشین کو خود
چلا سکے؟ کون اس لائق ہوگا کہ ہر پرزے کو ضرورت کے لحاظ سے بدل
سکے؟ اور کون - آئندہ جاکر - ایسا ہو سکتا ہے کہ مشین میں کوئی پرزہ گھٹا
بڑھا کر مفید اور نتیجہ خیز اضافہ کر سکے؟ ہماری بالکل یہی حالت ہے!
ہم بول نہیں سکتے، ہم لکھ نہیں سکتے، ہم کسی طرح تبادلۂ خیالات آزادی
کے ساتھ نہیں کر سکتے، ہمارا ہاتھ ناپاک سے ناپاک چیز ہے جو کسی طرح
سیاسیات سی متبرک چیز کو چھو نہیں سکتا، اور تو اور - ہمارا دماغ ذلیل
ترین دماغ ہے جس کو تعلیمی کوشش کے راستہ سے بھی "روڈ کلوزڈ"
(   ) کا تختہ لگا کر روک دیا جاتا ہے! ہمارے سمجھ میں
کسی طرح نہیں آتا کہ ہم سیاسیات کی الف - بے - تے - کہاں پڑھیں؟ کس سے
پڑھیں؟ کیونکر پڑھیں؟ اور پڑھیں تو لکھنا بھی سیکھیں یا صرف رٹ لیں،
لکھیں تو کس جگہ لکھیں اور اس ابجد کی مشق کی اجازت کیونکر ملے؟
یہ صاف ظاہر ہے کہ جس قوم کو اعلیٰ تعلیم بہم پہونچانے کی اجازت نہ
ہو، جس کو ملکی مشین کے محض پرزے یاد کر لینے کا بھی موقع نہ ہو، جسکے
لئے ہر راستہ بند ہو وہ کس منہ سے انگلستان جیسے حضرات پیدا کر سکتی
ہے! وہ تبین اگر زمانہ کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے تجربہ میں مکمل ہو گئے تو
کیا نتیجہ؟ رہا تو وہی مخط الرجال! یہ تو نہیں کہ ایک راستہ دکھا کر ہر شخص کو
چلنے کی ہدایت کی جائے اور ہمیشہ ایک پوری تعداد ماہران فن کی دستیاب ہو سکے -
اگر یہی روک ٹوک ہے تو کبھی بھی اس قابلیت کے عام ہونے کی امید نہیں!

زمانہ جن کو اجازت دیگا وہ خود بخود کشمکش میں مبتلا ہو کر ایک عرصے کے بعد مکمل ہو جائیں گے، اور اُن کی تعداد اُسیقدر ہو گی جس قدر کہ اب ہے! نہ سب کو کشمکش میں حصہ لینا کا موقع ملے گا نہ جانتے اور سمجھنے والوں کی تعداد بڑھے گی! انشاءاللہ وخیر صلاح!

شیخصاحب ممدوح نے ٹرکی اور ایران کی مثال دے کر اور زیادہ روشنی ڈالی ہے لیکن پھر اُس کو بھی گول طور پر ہی چھوڑ دیا ہے! آپ نے مان لیا ہے کہ ٹرکی اور ایران کو بڑی بڑی مشکلات اور دقتوں سے سامنا ہے، لیکن پھر بھی آپ یہ فرماتے ہیں کہ "اگر بیرونی مشکلات نہ بھی ہوتیں تو بھی ایران کو . . . . . وقت کا سامنا ہوتا" بے شک ہوتا اور ضرور ہوتا! لیکن وہ کونسا ملک ہے جس کو ایسی ترقی کے آغاز میں اندرونی دقتوں، اور مقامی جھگڑوں سے، مدتوں اور برسوں سامنا نہیں کرنا پڑا؟ وہ کونسی قوم ہے جس کے سیاسیات کے آغاز میں ماہرین سیاسیات کا قحط الرجال نہیں تھا، اور عرصہ تک نہیں رہا؟ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ ایک قوم ایسی زندگی کے آغاز میں اپنے گھر کی مخالفتوں کا سامنا کرتی ہے، اُس کے اکثر مفروضات صحیح ثابت ہوتے ہیں، اکثر زمانہ کی رفتار سے پامال ہو جاتے ہیں، اور اسیطرح کوشش کرتے کرتے وہ صحیح راستہ پر آجاتی ہے۔ شہر روما ایک دن میں نہیں بنا تھا۔ اور اگر روما کی تعمیر کے زمانہ میں بیرونی طوفان اور حوادثات اُس کی تعمیر کو ڈھاتے رہتے۔ جس قدر روما والے بناتے، مخالفین کسی نہ کسی طرح اُس کا اصلی اور عمدہ حصہ ڈھا دیتے۔ تو کیا کبھی بھی روما، روما ہو سکتا تھا! موجودہ ڈیلومیسی۔ نپولین کی بنیاد رکھی ہوئی ڈپلومیسی۔ ایک زمانہ میں یورپ بھی شیر خوار ہی تھی، اور بڑی بڑی تکالیف اٹھاتے کے

بعد ہر ملک میں جوان ہوتی ہے اب اُس کا مار ڈالنا کسی بیرونی طاقت
کے بس کا روگ نہیں وہ جڑ پکڑ چکی، وہ پھیل چکی، وہ استحکام پا چکی،
شروع کا زمانہ ہی تو غضب کا زمانہ ہے، ذرا سی تیز ہوا جڑ سے اکھیڑ
دیتی ہے، معمولی سی دست درازی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کمھلا دیتی ہے
کیا انگلستان، فرانس، جرمنی، روس، غرض یورپ کی کسی طاقت
بھی سیاسیات کے آغاز میں ایسی ہی بیرونی مشکلات سے سامنا پڑتا
جیسی آج کل غریب ٹرکی اور مفلس ایران کے سر پر نازل ہو رہی ہیں
تو وہ ترقی کر سکتی تھی، سیاسیات میں دخل دے سکتی تھی، اور آج
دنیا کے سامنے ایک طاقت بن سکتی تھی۔! ہرگز نہیں! ہر چیز کو شروع
میں ہی مٹا دینا نہایت آسان ہے اور موجودہ پولیسی کا زرین
اصول یہی ہے! خیر، اس بیرونی مسئلہ پر بحث کرنے سے بات
کہیں سے کہیں جا پڑے گی! مقصود صرف یہ تھا کہ ایران بیچارے
میں اگر قحط الرجال ہے تو ابھی اُسے اس کوچہ میں قدم رکھے
ہوئے کے دن اور کے راتیں گذری ہیں! ایران کی مجلس اور ٹرکی
کی پارلیمنٹ کو جانے دیجئے! یورپ کی کسی اور طاقت کی پارلیمنٹ
کو لے لیجئے، اُس کی تاریخ سے صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ
پارلیمنٹ آغاز میں کیا تھی؟ کس قدر معمولی لیاقت کے سیاسی دان
اُس کے حامی تھے؟ کس قدر عرصہ تک یہ ہی حالت رہی کہ ایک
سر آور دہ لیڈر پر قبضہ کر کے مار ڈالا اور ساری پارلیمنٹ ہوا ہو گئی؟
کتنے عرصہ تک تاج و تخت اور پارلیمنٹ کی کلہ بہ کلہ ہوتی رہی؟
اگر اُس زمانہ میں بیرونی طاقتوں کے ۲۰ و ۳۰ ونت اس ایک ملک،

کو زمان کی طرح چبا ڈالنا چاہتے تو کیا ہوتا ؟

خیر! اس وقت ہندوستان کی پالٹکس زیر بحث ہے! شیخ صاحب ممدوح کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش گورنمنٹ پر جایز اور ناجایز نکتہ چینی کو ہی پالٹکس سمجھ بیٹھے ہیں! مگر جناب یہاں یہ بھی ضرور ماننا پڑے گا کہ گورنمنٹ کی مخالفت ایک ایسی چیز ہے جس سے بچنا تقریباً ناممکن ہے! آپ ضرور ملاحظہ کرتے ہونگے، ملک کی ترقی کی کوشش کرنا گورنمنٹ کی مخالفت ہے اعلےٰ تعلیم کے ذرائع بہم پہنچانے کی کوشش کرنا۔ گورنمنٹ کی مخالفت، اپنے بیرونی بھائیوں پر ظلم کا پہاڑ ٹوٹتے ہوے دیکھ کر اظہار ہمدردی، گورنمنٹ کی مخالفت، اپنی اندرونی کیفیت بیان کرنا گورنمنٹ کی مخالفت، جائز حقوق مانگنا گورنمنٹ کی مخالفت، یا اپنے درد دل پر چار آنسو بہانا گورنمنٹ کی مخالفت، اپنی عزت کو ناجائز آمدنی کے شدید احکام سے بچانا، گورنمنٹ کی مخالفت، کچھ لکھنا گورنمنٹ کی مخالفت، کچھ بولنا گورنمنٹ کی مخالفت، غرض کام کی کوئی بات کہنا، بولنا، لکھنا، کرنا، گورنمنٹ کی مخالفت، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سی معنی خیز اور نتیجہ آمیز بہبودی کی بات ہے جو گورنمنٹ کی مخالفت نہیں ؟ جس قدر برٹش گورنمنٹ کی سلطنت وسیع ہے کہ چوبیس گھنٹے میں ایک منٹ کے لئے آفتاب اس سلطنت سے باہر نہیں جاتا، اسیقدر اس کی مخالفت بھی۔ صرف ہندوستان کے لئے۔ تقریباً نا محدود چیز ہے کہ چوبیس گھنٹے کی ایک ایک حرکت بوقت حاجت مخالفت کے دائرے میں لے جا سکتی ہے! البتہ ترقی کی طرف سے اندھا، قومیت کی

ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار کی یہ رائے غلط فہمی پر مبنی ہے اور ہم اس پر مفصل بحث کسی آئندہ پرچہ میں کرینگے۔ ایڈیٹر

طرف سے بھرا، ملک کی طرف سے گونگا ہو جائے اور صرف شخصیت کے لئے کوشش کرے، صرف اپنی ذات کے لئے چمکتے ہوئے خطابات حاصل کرنے میں رات دن دیوانہ رہے تو بے شک کوئی عمل گورنمنٹ کی مخالفت نہیں! یہاں یہ بھی بتانا چاہئے کہ ترقی و فلاح کی کونسی کوشش گورنمنٹ کی مخالفت نہیں کہی جا سکتی؛ اچھا ہو کہ جائز اور ناجائز نکتہ چینی کی پوری پوری تفصیل نہیں تو کچھ اتا پتا ہی بتا کر حدِ فاصل کو قائم کر دیجائے!

ہندوؤں سے مخالفت کرنے پر بھی شیخصاحب ممدوح نے اعتراض کیا ہے؛ لیکن ہم اس کی نسبت کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں چاہتے، جب تک نہ معلوم ہو کہ شیخصاحب نے "پالٹکس" سے مشرقی پالٹکس مراد لی ہے یا صرف ہندوستان کی؛ مضمون مذکورہ سے کچھ پتہ نہیں چلتا! بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ پالٹکس کو مشرقی نقطۂ خیال سے دیکھ رہے ہیں، مگر پھر یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ آپ ایران اور ٹرکی کو صرف مثال میں کیوں لیتے ہیں اور جاپان کو کیوں چھوڑ دیتے ہیں! اس ٹرکی اور ایران کی مثال سے یہ نظر آتا ہے کہ آپ پالٹکس کو اسلام کے نقطۂ خیال سے دیکھ رہے ہیں مگر پھر معمّہ بنا جاتا ہے کہ آپ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مخالفت کو کیوں نظر انداز کرنا چاہتے ہیں! ہندوستان میں رہ کر مسلمان اور ہندو مجبور ہیں کہ زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں! ممکن نہیں کہ یہ دونوں اقوام خلوت و جلوت، بازار و دربار، غرض ہر جگہ نہ ٹکرائیں، یہاں اس سے بحث نہیں کہ زیادتی کس کی ہے اور کون صرف اپنے بچانے کی

کوشش کر رہا ہے! یہ یقینی ہے کہ جب دو طاقتیں ٹکرانی ہیں، زبردست کمزور پر غالب آ جاتی ہے، اور کمزور اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے کسی بالاترین طاقت کے آگے روتی ہے پیٹتی ہے چیختی ہے چلاتی ہے! مرتا کیا نہ کرتا! زبردست طاقت کمزور کو ضرور ایک نہ ایک دن کچل ڈالے گی، روند ڈالے گی، پامال کر دے گی، مرنا برحق، لیکن سوال یہ ہے کہ کیسی موت مرنا چاہئے۔ بزدلانہ یا دلیرانہ؟ ہندوستان میں رہکر مسلمان اپنی حق تلفی کو دیکھ کر آہ و نالہ بھی نہ کریں!

اس تمام سمع خراشی سے میرا مطلب یہ ہے کہ شیخصاحب موصوف اپنے مضمون "پالٹکس" پر مزید نظر ڈال کر تشریح طلب باتوں کی تشریح کر دیں، کم ازکم صاف الفاظ میں یہ ہی بتا دیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کس راستہ میں ہماری ترقی یا کم از کم ہماری سلامتی ہے! ہم کو معلوم ہے کہ مسلم لیگ کے لندن کی جماعت نے مسلمان اور ہندوؤں کی موافقت اور اتفاق پر توجہ دلائی ہے، لیکن اس شریفانہ اور نیک استدعا کا جواب جو کچھ پریس کے ذریعہ سے ملا ہے۔ ہندو بڑے بڑے اخباروں نے دیا ہے۔ وہ بھی سامنے موجود ہے - یونیورسٹی کا جو کچھ حشر ہوا، اور ہوگا صاف نظر آرہا ہے: ہم عجیب کش مکش میں مبتلا ہیں، گر ہمارے لیڈر اب بھی حروف مقطعات میں ہی بات چیت کرتے ہیں اور کچھ نہیں تو شیخ صاحب موصوف کم ازکم مطالعۂ سیاسیات کا طریقہ ہی ذرا واضح طور پر بیان فرماویں! یہ تمام استدعا خدانخواستہ ایک معترض کے رنگ میں نہ سمجھئے بلکہ ایک طالبعلم کی حیثیت سے جو سیاسیات کے مطالعہ میں کوئی پیچیدہ مسئلہ دیکھتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے۔

سلطان حیدر جوش (علیگ)

کلامِ اکبر

جنہیں ہے شرک سے نفرت خدا کو ایک کہتے ہیں
پھر اُن میں باہمی کیوں جنگ و تکرار باقی ہے
سبب اس کا تو ظاہر ہے، خدا لب پر، خودی دل میں
تبانِ سنگ ٹوٹے ہیں، بتِ پندار باقی ہے

آپ اکبر لاکھ مشقِ خوش کلامی کیجیے ، کتنا ہی اظہارِ اعزاز دوامی کیجیے
دوستی کی آپ سے فرصت نہیں اس شوخ کو ، یا کھسکئے سامنے سے یا غلامی کیجیے

ترانۂ معرفت

از خطِ مولوی محمد سلیمان خان صاحب خائف مرحوم مغفور

کسی کے لطفِ مئے محبت کا دل میں ایسا سرور ہوتا
نہ جامِ کوثر کی حرص ہوتی نہ شوق جامِ طہور ہوتا
ہماری اس چشمِ سیر بیں میں اگر نہ کوئی تصور ہوتا
تو تو ہی ہوتا نظر میں ہم سے قریب ہوتا کہ دور ہوتا
شرابِ وحدت کا دور ہوتا نشہ میں ہر دم میں چور ہوتا
نگاہ جامِ سبو پہ ہوتی، زباں پہ ربِ غفور ہوتا
جو اپنی قسمت کی تیرگی میں کسی کے جلوہ کا نور ہوتا

خود آنکھیں ارنی پکار اٹھتیں، دلِ حزیں رشکِ طور ہوتا
تمہارے دیدار کی تمنّا اگر اٹھاتی دوئی کا پردہ

تو ہم کو ہر شعلۂ فروزاں فروغ میں برقِ طور ہوتا
اُسی کی ہر نور میں جھلک ہے، اُسی کی ہر پھول میں مہک ہے

اُسی کا ہر شے میں حسن پاتا اگر آدمی کو شعور ہوتا
دل و جگر میں وہ آگ لگتی بجھائے سے بھی جو بجھ نہ سکتی

تڑپ تڑپ کر یہ جان جاتی، نصیب تیرا حضور ہوتا
جو نحن اقرب کو یاد رکھتے، پھر اسپہ ہم اعتقاد رکھتے

جہاں بھی رہتے، وہاں میسر ہمیں تمہارا حضور ہوتا
تھے جیسے مشتِ غبار پہلے، یونہی جو رہتے تو ہم بھلے تھے

نہ عہدِ روزِ الست ہوتا، نہ خوفِ یومِ نشور ہوتا
شراب کیطرح جام بھر کے یہ زہرِ قاتل کبھی نہ پیتے

جو زندگی میں ہمیں تمہارا نصیب قرب و حضور ہوتا
وہ رازِ مخفی کھلے ہیں ہم پر ملک بھی حیران ہیں جس کو سنکر

نہ وہ ہمیں رازداں بناتے، نہ ہم کو اتنا غرور ہوتا
جو قرب اُس کا نصیب ہوتا، تو حال اپنا عجیب ہوتا

نہ آرزوئے بہشت ہوتی، نہ ہم سے ایسا قصور ہوتا
نہ ہم کسی رنگ و بو پہ کرتے، نہ ہم کسی آرزو پہ مرتے

نہ آپ ایسا حجاب کرتے، نہ ہم سے، ایسا قصور ہوتا
ہمیں ہیں اُنکے ازل سے شیدا، ہمیں سے دیدار کا ہے وعدہ

اگر نہ ہوتا غرور ہم کو، تو کس کو کبر و غرور ہوتا

نہ ہم سیرِ کوہِ طور جاتے نہ لفظِ ارنی زباں پہ لاتے
نہ سنتے ہم ایسی لن ترانی جو ہم میں تیرا ظہور ہوتا
جو راستہ ترکِ ماسوا کا آسے تو پیرِ مغاں بتاتا
قسم ہے جام و سبو کی خالص مرید تیرا ضرور ہوتا

قیصر (بھوپال)

عیدِ سعید

کس ادا انداز سے کس شان سے آئی ہے عید
دیکھئے تو واہ کیا تصویرِ رعنائی ہے عید!

ناچتا ہے کس قدر فرطِ خوشی سے آسماں
کیا زمیں پر آج طالع نے پری پائی ہے عید

پھول اُٹھے ہیں نسیمِ عیش سے گلہائے دل
چھاونی بن کر ریاضِ دہر میں چھائی ہے عید

تو بھی اے ساقی دکھا دے ساغر و مینا کا رقص
رقصِ تلا پر نہایت آج اترائی ہے عید

کس مسرت سے کھلا ہے آج ہر غنچہ دہن
کس خوشی سے آج محوِ مجلس آرائی ہے عید

چہرہ ہر اعلیٰ و ادنیٰ کا خوشی سے لال ہے
روکشِ تصویرِ زینت، رنگ پیمائی ہے عید

دین کی بھی برکتیں حاصل ہیں اسکے فیض سے
اسلئے دنیا میں وجہِ عشرت افزائی ہے عید

رحمتِ خالق نے بخشے روزہ داروں کے گناہ
یہ نویدِ جاں فزا اسلام میں لائی ہے عید

سجدوں میں گرم ہو بازارِ طاعت آج صبح
سچ اگر پوچھو تو جنسِ حق کی سودائی ہے عید

عیدگاہوں میں ادا ہوتی ہے بندوں کی نماز
عاصیوں میں رحمتِ حق کی تماشائی ہے عید

اس جہاں میں عیش کم ہے۔ رنج و غم ہے بیشتر
تیس دن روزے رہے تو ایک دن آئی ہے عید

کیجئے طاعت خدا کی اور اطاعت شاہ کی
یوں زبانِ حال سے معروف گویائی ہے عید

صرف عید آتی نہیں حلوا کھلانے کے لئے
مومنو! یہ دن غنیمت ہے کہ آج آئی ہے عید

اس طرح اخلاص سے دل بھی ملائیں بار بار — جسطرح دیتی گلے ملنے کی یارائی ہے عید
ایک دن دو دل ملا دیتی ہے پیار سے — ایک اپنے نام کی ہے ۔ فخرِ یکتائی ہے عید
خانۂ طالب میں ماتم کے سوا شادی کہاں؟ — بھول کر رستہ اِدھر شاید چلی آئی ہے عید!
بھائی بھائی جانکر ملتے ہیں آپس میں گلے — ساری تقریبوں سے ہم کو اسلئے بھائی ہے عید

روز و شب اللہ عالم کو دکھائے راحتیں
جسطرح طالب خدا نے آج دکھلائی ہے عید

(طالب بنارسی از بمبئی)

کلام نادر

میل دل اور زبان میں نہ رہا — کچھ اثر اب بیان میں نہ رہا
اب نہ حسرت نہ یاس ہے دل میں — کوئی بھی اس مکان میں نہ رہا
کیا شکایت جو کٹ گئے گاہک — مال ہی جب دکان میں نہ رہا
مر کے رہنا پڑا اب اُس میں آہ — جیتے جی جس مکان میں نہ رہا

نادر افسوس قدردانِ سخن
ایک ہندوستان میں نہ رہا

پھیر لیتا ہے مکدر ہو کے منہ جس سے کہیں — ملے جو جی پر گذرتی ہے وہ ہم کس سے کہیں
مانعِ عرضِ تمنا کیوں نہو رشکِ رقیب — اسے ہم کہنے نہ پائیں اُنکے مونس سے کہیں

نادر اس محفل میں ہیں وہ نام کے صدرِ انجمن
آپ کو کہنا ہو جو کچھ اہلِ مجلس سے کہیں

نوا سنجی کو کیا کچھ بلبلیں اس باغ میں کم تھیں
مجھے تکلیف دی ناحق چمن پیرائے عالم نے

اس خرابہ سے کوئی گذرا ہے نادر نام بھی جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

سہ مصرعی

خوشی سے خوشی کا ہونا ہی اچھا یہاں جان دے دے کے کھونا ہی اچھا
رولانا ہی اچھا ہے رونا ہی اچھا

یہ قصر اور یہ گھر ہے سب چار دن کا یہ فرش معطر ہے جب چار دن کا
تو خاکِ لحد کا بچھونا ہی اچھا

بھری تلخیوں سے ہے یاں جان شیریں سم آلودہ ہے پارۂ نان شیریں
غذا سے یہاں ہاتھ دھونا ہی اچھا

تماشے جہاں کے کبھی کم نہونگے زمانہ رہے گا مگر ہم نہ ہونگے
نہوں ہم ہمارا نہ ہونا ہی اچھا

کہے جا اسیطرح اشعار نادر نہ اشکوں کا ٹوٹے ترے تار نادر
یہ لڑیوں میں موتی پرونا ہی اچھا

(نادر کاکوروی)

کلامِ حامد

۱ . ہمارے لائق دوست منشی محمد حامد علیخاں

صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ نے اپنے تازہ کلام کا
ایک معقول حصہ ہمیں اشاعت کے لئے عنایت
فرمایا ہے جس میں سے اس پرچہ میں صرف
دو غزلیں بشکریہ درج کی جاتی ہیں۔

ویسا لٹا ہوں میں کسی قابل نہیں رہا　　جس دل میں تیری یاد تھی وہ دل نہیں رہا
مجموعہ حواس کا شیرازہ تھا یہی　　ہستی ہے بے نظام اگر دل نہیں رہا
کیا کیا ستم کے آرے مرے دل پہ چل گئے　　لیکن میں تیری یاد سے غافل نہیں رہا
آنکھیں لڑیں تو اٹھ گئے پردے حجاب کے　　دل جب سے مل گیا بخدا دل نہیں رہا
لو میرے دم کے ساتھ تماشا بھی ختم ہے　　وہ سیر کیا کریں گے جو بسمل نہیں رہا
خود ہی تڑپ کے مشق ہے ہیں پاس بیٹھکر　　اور خود ہی کہہ رہے ہیں کہ لو دل نہیں رہا
جادو بھری نظر وہ جوانی کی کیا ہوئی؟　　قاتل وہی ہے پر وہ قاتل نہیں رہا
دونو جہاں کی میری یہی کائنات تھی　　پھر کیا رہا جو پاس مرے دل نہیں رہا
اشکوں کا یہ سلوک خدا ساز بات ہے　　بیڑی تھی جس پہ ناؤ وہ ساحل نہیں رہا
وہ آنکھیں ایک دل تھا یہ کل کائنات تھی　　آنکھیں وہ آہ! اب نہ رہیں دل نہیں رہا
حامد صغیر مر گئے محفل اداس ہے　　وابستگی تھی جس سے وہی دل نہیں رہا

حامد چھپاؤ لاکھ چھپیگا کہیں یہ راز
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ وہ دل نہیں رہا

دل کا وہ مختصر فسانہ ہے　　جس میں اک وسعت زمانہ ہے
سیدھی سادی روش دل آئینہ　　میرا سیدھے دوستانہ ہے
جو بشر ہے جہان میں بے شر　　ذکر خیر اس کا غائبانہ ہے

ہوں شہ غم دوست ولے سنتا ہوں — درد انگیز جو فسانہ ہے
بے اجازت ملک نہیں آتے — تکیہ اپنا وہ آستانہ ہے
آنکی سب ہاں میں ہاں ملاتے ہیں — وہ جدھر ہیں اودھر زمانہ ہے
جتنا شاکی ہوں میں زمانے کا — اوتنا شاکی مرا زمانہ ہے
کس مصیبت سے مجکو ملتا ہے — جو مقدر میں آب و دانہ ہے
اس قدر پختہ ہیں اصول اپنے — جن سے مجبور خود زمانہ ہے
خاک میں مل گیا کمال افسوس — مفلسی بھی برا زمانہ ہے
صاف سیدھی روش ہے اپنی — جس سے کوسوں الگ زمانہ ہے
علم بڑھتا ہے صرف کرنے سے — کم نہ ہوگا یہ وہ خزانہ ہے
کہتے سب ہیں جنون ہے انکو — ناموافق جو اب زمانہ ہے
بے بہا کچھ خیال ہیں دل میں — مفلسوں کا یہی خزانہ ہے
تیرے عجز و نیاز سے حامد — جو ہے بیگانہ وہ یگانہ ہے
ہر زمانے کا اک فسانہ ہے — ہر فسانے کا اک زمانہ ہے
کام جو آنکھ سے نہیں لیتے — اُن کو سادہ ورق زمانہ ہے
تفرقہ یہ بھی جیتے جی دیکھا — ہم کہیں دل کہیں روانہ ہے
اپنی محنت سے جو کہ حاصل ہو — من و سلویٰ وہ آب و دانہ ہے
جس میں سب تنگ ہیں زمانے کے — ہم غریبوں کا وہ فسانہ ہے
ہر بشر ہے زمانے کا قوتو — میرا گیتی نما فسانہ ہے
مرکے چھٹتا ہے قید سے انساں — عمر بھر کا یہ جیلخانہ ہے
خدمتِ ملک میں ہیں مصروف — خلق میں جب تک آب و دانہ ہے
۱ اچھے خاصے ملے تھے کل حامد — آج روتا اُنہیں زمانہ ہے

تازہ غزلیں

(از جناب حفیظ جونپوری)

سر و تن میں اپنے ہو تفرقہ تو زباں سے اُف نہ ادا کروں
تیرے بازوؤں کی "سلامتی" تہ تیغ بھی یہ دعا کروں

نہ وہ مہر ہوں کہ ہوں شمع گل تیرے آگے کسکو فروغ ہے
یہ ادا ہے اور حسیں میں کب ؟ جسے پیار تیرے سوا کروں

نہیں یاد آج وہ قول بھی جو کہا تھا آپ نے یہ کبھی
پھروں اب جو عہد سے جیتے جی تو خدا سے اپنے دغا کروں

کبھی آنکھ اُس کے جمال پر کبھی دھیان اپنے مآل پر
کبھی ہاتھ مل کے ہوں رہ گیا۔ کبھی سوچتا ہوں کہ کیا کروں

زہے بے خودی جو ہو یوں بسر مجھے آپ اپنی نہ ہو خبر
نہ تو آرزوے کرم رہے۔ نہ ستم کا اُسکے گلا کروں

نہ جفا سے پھیروں گا منہ کبھی۔ یہ وفا ہے اور وفا مری
تہ تیغ اپنا گلا جو ہو ترے حق میں پھر بھی دعا کروں

مرے ناصحانِ شفیق کی سر و چشم پر ہیں نصیحتیں
دل و دیدہ پر جو نہ بس چلے وہ بتائیں ایسے میں کیا کروں

کبھی بیٹھے وہ جو خموش بھی تو میں لاؤں چھیڑ کے غیظ میں
اسی بات میں ہے مزہ مجھے وہ کہا کرے میں سنا کروں

مری نبض دیکھکے چارہ گر! گئے دست و پا ترے پھول کیوں؟
مجھے جلد بہرِ خدا بتا کہ دوا کروں کہ دعا کروں

جو نہیں ہے وصل نصیب میں تو ہو دور دل سے تمیز و حِس
نہ تو قدر حسن و ادا کی ہو نہ جفا سہوں نہ وفا کروں

وہ برائیاں جو سُنیں تری تو حفیظ ؔہمیں سے برا کیا؟
جو خوشی کسی کی اسی میں ہو تو میں آپ اپنا گلا کروں

حسرتیں سی حسرتیں ہیں جان کس مشکل میں ہے
اک خدائی ہے خدا رکھے جو میرے دل میں ہے

زندگی دے سے رہی تھی ساری زندگی تو دل میں ہے
اک ہماری جان تھی وہ بھی کفِ قاتل میں ہے

سوزشِ پروانہ سے آخر پسینہ آ گیا
رشک ہوتا ہے انہیں یہ شمع کیوں محفل میں ہے

اک نظر کا یم سنبل ترے جھپکے جائے کہاں؟
اے مہِ خورشید وش تو کون سی منزل میں ہے

ظاہر الفتا ہے دل میں دشمن سے اتراؤ نہیں
وہ [illegible] کا تماول میں ہے

اک عدو کی ہیں تمنائیں نکلتی ہیں جو روز
اک ہماری آرزو جو ہمارے دل میں ہے

دم نکلتا ہے نہ وہ آتے ہیں آخر کیا کروں؟
کشمکش سی کشمکش ہے جان کس مشکل میں ہے

میں تڑپتا ہوں ادھر کھچتا ہے تو منا ادھر
تیر ہچکی میں کہاں ہے یاں کسی کے دل میں ہے

اچھی صورت جسکی دیکھی دیکھتی ہی لٹ گیا
سخت حیراں ہوں کہ یہ کیا چیز آب و گل میں ہے

نظروں نظروں میں بڑھ جاتا ہے کچھ دامانِ رشک
دوسرے کو دیکھتا ہے جو تری محفل میں ہے

ناز اُسکی کس دن ہم کو امیدِ وصال
منہ سے تو پوچھو تو خدا کے واسطے کیا دل میں ہے

ہائے وہ پردہ کسیکا ہائے وہ بے پردگی
کہہ نہیں سکتا زباں سے وہ جھلک جو دل میں ہے

پھر کہاں یہ صحبتیں کیا زندگی کا اعتبار؟
یہ غنیمت ہے کہ شاعر آج اس محفل میں ہے

(از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز از حیدرآباد دکن)

طاقتِ ضبط گھٹے صبر پہ مشکل آئے تجھ سے دمساز جفاجو پہ اگر دل آئے

شمع گل ہوتے ہی گلزار تھی اپنی تربت پھول منقار میں لیلے کے عنادل آئے

کیا کرے کیا نہ کرے دشت میں مجنون تیرا آگے محمل کے رہے یا پسِ محمل آئے

صفحۂ دہر مرقع ہے پریرویوں کا کس پہ دم نکلے مرا، کس پہ مرا دل آئے

قابلِ دید ہے محفل سے پلٹنا میرا غیر کے ساتھ گئے اور گلے مل آئے

تیر بن جائے اگر میرا دمِ بازپسیں پھر تو کچھ لطف تجھے بھی مرے قاتل آئے

دستِ وحشت کو اسی بات کی رہتی ہے تلاش اپنے قبضے میں ترا پردۂ محمل آئے

رہ نوردانِ رہِ شوق کے پیچھے پیچھے بیٹھتے اٹھتے خضر بھی کئی منزل آئے

قلزمِ عشق کا ہم اسکو شناور سمجھیں موج کیطرح کوئی تا لبِ ساحل آئے

تیر ہیں تیغ ہیں - چھریاں ہیں نگاہیں انکی موت آئی ہو کسیکی تو مقابل آئے

جمع ہیں سینے پرائے کہیں ایسا تو نہ ہو عرصۂ حشر میں وہ حور شمائل آئے

پھر ہمیں لطفِ ملاقات میسر ہے عزیزؔ
حیدرآباد میں پھر حضرتِ سائلؔ آئے

(از ڈاکٹر غلام علی صاحب ایل-ایم-ایس-)

حرفِ شکوے کا ہو منہ پر تو زباں جل جائے آہ لب سے ہو الگ گر تو جہاں جل جائے

میں وہ نخچیر ہوں چلّے کا ترے گرم شکار! گر ہو تاخیر نشانے میں کماں جل جائے

مجھکو وہ آتشِ حل کردہ پلادے ساقی! مجھسے گر بات کرے کوئی وہاں جل جائے

ہوں میں وہ گرم وفا یار کہ میرے خونیں تارِ غمزہ چلے مژگاں کی سناں جل جائے

مرثیے سوز میں تیرے جو لحد پر آن کی نام لے تیرا کوئی انکا نشاں جل جائے

دلِ عاشق کو کیا خاک جلا کر اس نے
یا ربّ انصاف یہ ہے حسنِ بتاں جل جائے

زمانہ

کانپور اردو علم و ادب کے چوٹی کے ماہواری رسالوں سے ہے۔ اس کے ایڈیٹر منشی دیا نراین صاحب نگم بی۔ اے پہلے مخزن کے اوراق میں مضمون نگاری کیا کرتے تھے۔ اپنے رسالہ کے اجرا کے بعد ہمہ تن اس کے بنانے میں مصروفیت رکھتے ہیں۔ مضامین نہایت اعلےٰ پایہ کے ہوتے ہیں۔ عکسی تصاویر بھی نہایت مرغوب اور دل کش ہوتی ہیں اور لکھائی۔ چھپائی کسی دوسرے رسالہ سے کم عمدہ نہیں مگر باوصف ان تمام صفات کے ملک نے اس کی خاطر خواہ قدر نہیں کی۔ امید کہ اردو خوان پبلک اس کی توسیع اشاعت میں کوشش کر کے قابل ایڈیٹر کی خدمات کی قدر دانی کا ثبوت دے گی۔

(غلام محمد طور۔
ایڈیٹر مخزن لاہور)

تفہیم القواعد

اردو صرف نحو کا ایک آسان اور مفید رسالہ ہے۔ حافظ جلال الدین احمد صاحب۔ ہیڈ مولوی۔ گورنمنٹ ہائی سکول۔ کانپور۔ اس کتاب کے مؤلف ہیں انہوں نے اس تالیف میں بہت محنت سے کام لیا ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ طلبہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ اس کی قیمت صرف ۳ر ہے اور صاحب

اطلاع

جو صاحبان دس خریدار پیدا کر کے بھیجے رسالہ مفت یکسال کے واسطے نذر ہوگا۔ دو خریداران کے واسطے کتاب کلام نیرنگ مہیر تبت۔ انتخاب مخزن میں سے ایک کتاب بعد وصولی چندہ دی جائے گی۔

اکثر صاحبان جن کے نام رسالہ جات غیر ملکوں میں جاتے ہیں انکے بل وصول نہیں ہوتے اور خط وکتابت میں علاوہ زیر باری ہوتی ہے۔ پس مہربانی فرما کر قیمت رسالہ جات حسب دستور دفتر مخزن میں جلد ارسال فرماویں۔ اور ایک ایک دو دو خریدار بھی بہم پہنچاویں تو مزید عنایت ہے۔ مینیجر